فقہائے ہند

جلد پنجم — حصّہ اوّل

بارھویں صدی ہجری

محمدّ اسحاق بھٹی

ادارۂ ثقافت اسلامیہ

فقہائے ہند

جلد پنجم ـــــ حصہ اوّل

بارھویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲- کلب روڈ، لاہور

بار اوّل ۱۹۷۹

تعداد ۱۱۰۰

مطبع الحمرا آرٹ پرنٹرز میکلیگن روڈ لاہور

ناشر محمد اشرف ڈار (معتمد)
ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

فہرست مضامین

ا

ص

ض

ط

ظ

ع

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اورنگ زیب عالمگیر

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سلسلہ "فقہائے ہند" کی چار جلدیں شائع ہو کر معزز قارئین کے مطالعہ میں آچکی ہیں اور اہلِ علم نے اس سلسلے کو ازرہِ کرم قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیرا۔

یہ سلسلہ ہجری سنین اور حروفِ تہجی کی ترتیب سے مرتب ہو رہا ہے۔ جلد اوّل پہلی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک کے علما و فقہا کے حالات پر مشتمل ہے۔ جلد دوم میں نویں صدی ہجری کے فقہائے ہند کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ جلد سوم دسویں صدی ہجری کے فقہائے کرام کے احوال اور ان کی علمی مساعی کو محیط ہے اور جلد چہارم گیارھویں صدی ہجری کے فقہا و علما کے سوانح و کوائف کو اپنے دامنِ صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ گیارھویں صدی ہجری کا زمانہ علم و فضل اور علما و فضلا کے اعتبار سے ہندوستان کا نہایت زرخیز اور پُر ثروت زمانہ ہے، لہٰذا یہ جلد دو حصّوں میں منقسم ہے، حصّہ اوّل اور حصّہ دوم —! اسی طرح بارھویں صدی ہجری کا برِّ صغیر بھی علم سے بھرپور اور فقہا سے معمور ہے۔ ملک کے ہر گوشے میں بے شمار اصحابِ علم سرگرمِ درس و افادہ اور کثیر تعداد میں اربابِ فقہ مشغولِ تصنیف و تالیف نظر آتے ہیں، اس لیے زیرِ ترتیب جلد کو بھی —— جو جلد پنجم ہے —— دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصّہ اوّل خوانندگانِ ذی احترام کے پیشِ نگاہ ہے۔ یہ حصّہ حروفِ ہجا کی ترتیب سے حرفِ الف سے شروع ہو کر حرف ک پر ختم ہوتا ہے اور ۱۶۲ فقہائے کرام کے حالات کو محتوی ہے۔

اس سے آگے ان شاء اللہ حصّہ دوم، م سے ی تک چلے گا۔

ہر جلد اور ہر حصے پر ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا گیا ہے، جس میں متعلقہ دور کے ملوک و سلاطین کے بارے میں وہ ضروری معلومات معرضِ بیان میں لائے گئے ہیں جو موضوعِ کتاب سے ہم آہنگ ہیں۔ نیز علم و علما اور فقہ و فقہا سے ان کے روابط و مراسم کی وضاحت کی گئی ہے۔ پیشِ نظر حصے کا مقدمہ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے حالات کو محتوی ہے۔

عہدِ اورنگ زیب کے بعض علما و فقہا کے احوالِ زندگی اگرچہ جلد چہارم میں بھی موجود ہیں اور جلد پنجم کے حصہ دوم میں بھی مندرج ہیں، نیز اس کے عہد سے بعد کے فرماں رواؤں کے زمانے کے بعض اہلِ علم کا تذکرہ بھی جلد پنجم کے دونوں حصوں میں مرقوم ہے، لیکن ترتیب قائم رکھنے کے لیے زیرِ مطالعہ حصے کے مقدمے میں صرف اورنگ زیب کے ضروری حالات و سوانح اور علما و فقہا سے اس کے تعلقات و روابط کا تذکرہ کیا جا رہا ہے ـــ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت کا دورِ زوال شروع ہو جاتا ہے اور اس کے خلاف باہم دست و گریبان بلکہ آپس میں سخت خوں ریزی میں ملوث دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تیموری خاندان کا نہایت پُرآشوب اور انتہائی الم ناک دور ہے۔ حصہ دوم کے مقدمے میں افسوس کے ساتھ ان درد انگیز واقعات کا ذکر کیا جائے گا اور اپنی محدود علمی بساط کے مطابق اس دور کے علما و فقہا کی خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ نیز بتایا جائے گا کہ اس دورِ فتنہ خیز اور عہدِ انحطاط پذیر کے فرماں روایانِ ہند کے دلوں میں علم و علما کی کیا قدر و منزلت تھی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

جلد چہارم کے حصہ اوّل کے مقدمے میں بابر کی نسل کے تیسرے حکمران جلال الدین محمد اکبر کے عہد اور اس کے علمی اور ثقافتی کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور حصہ دوم کے مقدمے میں اکبر کے بیٹے شہنشاہ نور الدین محمد جہاں گیر اور اس کے فرزند سلطان شہاب الدین محمد شاہ جہان کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچائے گئے ہیں ـــ آئیے اب دُودمانِ مغلیہ کے چھٹے عظیم الشان بادشاہ ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر کے حالات و سوانح کی تلاش کے لیے تاریخ کے دروازے پر دستک دیں اور اس کے لازوال علمی

کارناموں اور بے مثال فقہی خزینوں کی نشان دہی کریں۔ نیز جواں مردی اور شجاعت کے جو نقوش اس نے برصغیر کی سرزمین میں چھوڑے ہیں، انھیں نمایاں کرنے کا فرض انجام دیں۔

ولادت اور تعلیم و تربیت

اورنگ زیب عالم گیر اتوار کی رات ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ (۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء) کو "دوحد" کے مقام پر پیدا ہوا جو گجرات اور مالوہ کی سرحد پر اجین سے سو میل اور بڑودہ سے ستر میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ شاہ جہان اس وقت ولی عہد تھا اور جہاں گیر ملک عنبر کو شکست دے کر آگرہ کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں گیر نے نومولود کا نام اورنگ زیب رکھا اور کلیم ہمدانی نے "آفتاب عالم تاب" سے تاریخ نکالی۔ شاہ جہان کا اورنگ زیب تیسرا بیٹا اور اس کے چودہ بچوں میں سے بہ اعتبار ترتیب کے چھٹا بچہ تھا۔ ماں کا نام ارجمند بانو تھا جو آصف جاہ ابوالحسن طہرانی کی بیٹی تھی اور ممتاز محل کے عرف سے معروف تھی۔

اورنگ زیب کی عمر چار سال کے لگ بھگ تھی کہ ۱۰۳۱ھ (۱۶۲۳ء) میں شاہ جہان نے جہاں گیر کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس بغاوت کا پس منظر در حقیقت نور جہاں کا وہ طرزِ عمل تھا جو اس نے شاہ جہان کے بارے میں اختیار کر رکھا تھا اور اس کی وجہ سے لائق بیٹا عظیم باپ سے بددل ہو گیا تھا۔ بغاوت کے دنوں میں شاہ جہان نہایت پریشانی کے عالم میں اہل و عیال سمیت ہندوستان کے مختلف علاقوں بہار، بنگال، اڑیسہ اور دکن وغیرہ میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اس اثنا میں باغی شاہ زادے کا کئی بار شاہی فوجوں سے مقابلہ بھی ہوا، مگر شاہ زادے نے ہر بار شکست کھائی۔ بالآخر اسے باپ کے حضور جھکنے اور معافی مانگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جہاں گیر نے بیٹے کی غلطی معاف کی اور اسے بالاگھاٹ کی نظامت پر مامور کیا، رہتاس اور اسیر گڑھ کے دو قلعے بھی عطا کیے۔ لیکن یہ شرط عائد کی کہ شاہ جہان اپنے دو بیٹوں، دارا شکوہ اور عالم گیر کو بطور یرغمال جہاں گیر کے پاس لاہور بھیجے گا۔ شاہ جہان

کو شہنشاہ کی یہ شرط ماننا پڑی۔ شاہ زادہ شجاع پہلے ہی جہاں گیر کے پاس تھا۔ یہ واقعہ ۱۰۳۵ھ (جون ۱۶۲۶ء) کا ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کی عمر اس وقت کم و بیش آٹھ سال کی تھی۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ دو سال بعد ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں جہاں گیر لاہور میں وفات پا گیا اور شہاب الدین محمد شاہ جہان ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ رسم تاج پوشی اکبر آباد (آگرہ) میں ادا کی گئی۔ اس موقع پر آصف جاہ نے شاہ جہان کے حکم سے تینوں شاہ زادوں کو لاہور سے اپنے ساتھ لیا اور اکبر آباد پہنچا۔ ان کی ماں ممتاز محل اکبر آباد سے روانہ ہو کر سکندرہ کے مقام پر بیٹوں سے آ کر ملی اور نہایت مسرت کا اظہار کیا۔ دوسرے دن شاہ زادوں نے بادشاہ کے حضور نذریں پیش کیں اور بادشاہ نے جوش محبت سے انھیں گلے لگایا۔ شاہ زادوں کی آمد پر دربار میں دوبارہ تقریبِ مسرت منعقد کی گئی اور اورنگ زیب کو ایک لاکھ روپے نقد عطا کیے گئے اور پانچ سو روپیہ روزینہ مقرر ہوا۔ اس وقت اس کی عمر دس سال ہو گئی تھی۔

شاہ جہان کے زمانۂ شاہ زادگی کا بہت بڑا حصہ گوناگوں مصروفیات میں گزرا تھا، اس لیے وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دے سکا تھا۔ اب وہ تختِ حکومت پر بیٹھا تو اس اہم مسئلے کو موضوعِ فکر ٹھہرایا اور شاہ زادوں کی تعلیم کے لیے مختلف مشہور اور بہترین اساتذہ مقرر کیے۔ ہمارا دائرۂ گفتگو چوں کہ اورنگ زیب عالم گیر تک محدود ہے، اس لیے ان سطور میں ہم صرف اسی کے اساتذہ کا ذکر کریں گے، اس کے اساتذہ کرام میں مولانا عبداللطیف سلطان پوری، مولانا محمد ہاشم گیلانی، شیخ محی الدین بہاری، محمد صالح، سعد اللہ خاں اور سید محمد قنوجی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے ایک استاذ ملّا شفیعائے یزدی تھے، جو اقلیم ہند کے نامور فاضل تھے، اور نواب دانش مند خاں کے لقب سے ملقب تھے۔ ان کا شمار اس عہد کے جلیل القدر علما اور رفیع المرتبت فضلا میں ہوتا تھا۔ ان سے شاہ زادے نے علومِ متداولہ اور فنونِ مروّجہ کی باقاعدہ تحصیل کی۔

اس زمانے میں حاجی قاسم اور شیخ علی بن محمد مقیم مشہور خطاط تھے اور خطِ نستعلیق، خطِ نسخ اور خطِ شکستہ میں عدیم المثال تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے ان کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہہ کیا اور خطوطِ متعارفہ میں مہارت پیدا کی۔ وہ اس قدر اونچے درجے کا خوش نویس تھا کہ سریر آرائے سلطنت ہونے سے پہلے اپنے ہاتھ سے قرآنِ مجید کی کتابت کی اور اس کی تذہیب و تجلید پر سات ہزار روپے خرچ کر کے اسے مدینہ منورہ بھجوایا۔ اسی طرح علمِ نحو کی مشہور کتاب الفیہ ابن مالک کی کتابت کی اور اسے حاجی عبدالرحمٰن مفتی کے ہاتھ مکہ مکرمہ ارسال کیا۔

اورنگ زیب تصوف و سلوک میں بھی پوری دلچسپی رکھتا تھا اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند گرامی قدر شیخ محمد معصوم سرہندی سے بیعت تھا۔ سلسلۂ طریقت میں وہ شیخ محمد معصوم کے نامور بیٹے شیخ سیف الدین سرہندی کے حلقے میں داخل تھا اور اپنے والد سلطان شاہ جہان کے حکم سے شیخ موصوف کے ساتھ کامل وابستگی اختیار کر لی تھی۔

شجاعت اور بہادری

تیمور کے خون میں شجاعت اور بہادری کے جوہر تلاش کرنے نکلیں تو اس کے اثرات ہر مقام پر نمایاں نظر آئیں گے اور معلوم ہوگا کہ بابر سے شاہ جہان تک ہر شخص جواں مردی کا مرقع اور بسالت کا پیکر ہے۔ لیکن تاریخ کے اوراق سے واقعات کی تہوں کو کھولا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ بقول علامہ شبلی کے عالم گیر اس خاندانی "وراثت کا سب سے بڑا حصے دار ہے"۔ اکبر مست ہاتھیوں کو عین حالتِ لڑائی میں سونڈ سے پکڑ کر ایک دوسرے سے پیچھے ہٹا دیتا تھا، شاہ جہان نے زمانۂ شاہزادگی میں تلوار کی ضرب سے شیر کے ٹکڑے کر دیے تھے۔ لیکن عالم گیر کی شجاعت کے خدوخال اس سے بھی نمایاں تر ہیں۔ وہ صرف چودہ برس کا بچہ تھا کہ ایک موقع پر اس کا باپ شاہ جہان ہاتھیوں کی لڑائی کے تماشے سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اچانک ایک ہاتھی عالمِ غیظ و غضب میں فوج پر ٹوٹ پڑا اور آناً فاناً میدان صاف ہو گیا۔ لیکن چودہ سالہ

عالم گیر پہاڑ کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا اور ہاتھی سے گھتم گھتا ہو گیا۔ ہاتھی نے غضب ناک ہو کر اس کے گھوڑے کو سونڈ میں پکڑ کر دور پھینک دیا۔ عالم گیر دھڑام سے زمین پر گرا، اس کی رگِ شجاعت جوش میں آئی، نہایت غصے سے اٹھا اور پورے زور سے آگے بڑھ کر ہاتھی پر تلوار کی ایسی شدید ضرب لگائی کہ ہاتھی زخمی ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاہ جہان، خرد سال بیٹے اور مست ہاتھی کا یہ معرکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھی پیچھے ہٹا تو شاہ زادے کو بلا کر سینے سے لپٹا لیا اور اس پر موتی اور جواہر نچھاور کیے۔[1] مورخین نے اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دربارِ شاہ جہانی کا ملک الشعرا ابوطالب کلیم بھی اس موقع پر موجود تھا۔ اس نے یہ سارا واقعہ نظم کر دیا ہے۔ یہ نظم بڑی شان دار ہے، لیکن صفحات کی تنگ دامانی اسے یہاں نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

پہلی باقاعدہ معرکہ آرائی

اورنگ زیب کی پہلی باقاعدہ معرکہ آرائی بندھیل کھنڈ کے راجا جھجھر سنگھ سے ہوئی۔ یہ راجا ایک عرصے سے حکومت کے خلاف سرگرم عمل تھا، جب اس کی دست درازیاں حد سے بڑھ گئیں اور سخت باغیانہ رویہ اختیار کر لیا تو شاہ جہان نے اس کی سرکوبی کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت اورنگ زیب کی عمر اٹھارہ سال کے قریب تھی۔ بادشاہ نے اس اہم فوجی خدمت کے لیے اسی کا انتخاب کیا اور ۱۶۳۵ء میں نوجوان شاہ زادے کی سرکردگی میں راجا مذکور کی سرزنش کے لیے ایک لشکر روانہ کیا ــــ اورنگ زیب کچھ عرصہ اس مہم میں مصروفِ عمل رہا اور بہت سے جنگی کارنامے انجام دیے۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور شاہ زادے کے مناصب میں مناسب اضافہ کیا۔

دکن کی صوبے داری

اورنگ زیب بندھیل کھنڈ کی مہم سے فارغ ہوا تو ۳ ذوالحجہ ۱۰۴۵ھ (۲۹ اپریل ۱۶۳۶ء) کو اسے دکن کی صوبے داری پر مامور کیا گیا۔ دکن کے حالات انتہائی خراب تھے

---

[1] یہ واقعہ تاریخ کی مختلف کتابوں میں مرقوم ہے۔

وراُن کے ذریعے اصلاح ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب آٹھ سال اس نواح میں مقیم رہا اور وہاں کے سیاسی اور فوجی معاملات کو درست کرنے میں نہایت سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ آٹھ سال کے اس طویل عرصے میں وہ صرف چار مرتبہ دہلی آیا۔ پہلی مرتبہ یکم ذوالحجہ ۱۰۴۶ھ (۱۶ اپریل ۱۶۳۷ء) کو شادی کے لیے، دوسری مرتبہ ۱۵ رمضان ۱۰۴۹ھ (۳۰ دسمبر ۱۶۳۹ء) کو باپ کی زیارت اور ملاقات کے لیے، تیسری مرتبہ ۱۹ ذوالحجہ ۱۰۵۱ھ (۱۱ مارچ ۱۶۴۲ء) کو، اس موقع پر بھی اس کی آمد کا مقصد شہنشاہ کی زیارت اور سلام تھا۔ چوتھی مرتبہ وہ ۱۵ ربیع الاول ۱۰۵۴ھ (۲ مئی ۱۶۴۴ء) کو دہلی آیا۔ اس دفعہ وہ اپنی بہن جہاں آرا بیگم کی عیادت کے لیے آیا تھا جو شاہ جہان کی سترھویں سالگرہ (۲۷ محرم ۱۰۵۴ھ/ ۲۶ مارچ ۱۶۴۴ء) کے موقع پر کپڑوں میں آگ لگنے سے جھلس گئی تھی۔ اورنگ زیب کا اس مرتبہ شان دار استقبال کیا گیا اور اسے بے حد اعزاز و احترام کا مستحق گردانا گیا۔

شاہ جہان کی خفگی اور صلح

لیکن اورنگ زیب کو دہلی آئے ابھی بیس پچیس روز ہی ہوئے تھے کہ شاہ جہان کسی بات پر اس سے ناراض ہو گیا اور یہ ناراضی اور خفگی یہاں تک بڑھی کہ بادشاہ نے دربارِ شاہی میں اس کی آمد و رفت بند کر دی، اس کے احکام پر عمل درآمد روک دیا گیا اور اسے دکن کی نظامت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اگرچہ مؤرخین نے شہنشاہ کے اس بہت بڑے اقدام کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں عالم گیر نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، ان سے اس کے حاسدوں کے دل میں ایک جلن پیدا ہو گئی تھی اور وہ شاہ زادے کی مخالفت پر اُتر آئے تھے اور اس کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ حکمران چوں کہ اس قسم کی باتیں سننے اور ان پر اعتماد کرنے کے عام طور پر عادی ہوتے ہیں، لہٰذا مخالفین اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور بادشاہ کو لائق بیٹے کی مخالفت پر کمربستہ کر دیا۔

اس شکر رنجی میں تقریباً پانچ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ سات ماہ بعد جہاں آرا بیگم کو افاقہ

ہوا تو اس نے غسلِ صحت کیا، اور اس پُر مسرت موقع پر دربار میں ایک جشن منانے کا اہتمام کیا گیا۔ اب شاہ جہان کے دل میں شفقتِ پدری نے جوش مارا اور جہاں آرا کو عالم گیر کے پاس بھیجا۔ اس کی تقصیر معاف ہوئی، باپ بیٹے میں دوبارہ مصالحت کی فضا پیدا ہوئی، شاہ زادے پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں، وہ اٹھالی گئیں، منصب میں اضافہ کیا گیا اور بیٹے کو خلعتِ شاہانہ سے سرفراز فرمایا گیا۔

یہ باپ اور بیٹے کے درمیان پہلی شکر رنجی تھی۔ مستقبل میں جو واقعات رونما ہوئے، ان سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں اصل ہاتھ دارا شکوہ کا تھا۔

گجرات کی نظامت

اب عالم گیر کو دوبارہ دکن کی نظامت تو نہ مل سکی، البتہ ۲۹ ذوالحجہ ۱۰۵۴ھ (۱۶ فروری ۱۶۴۵ء) کو گجرات کی زمامِ نظامت عطا کی گئی۔

گجرات بعض اعتبارات سے بڑا اہم علاقہ تھا۔ تجارت و صنعت اور زرخیزی و سرسبزی میں بڑا مشہور تھا۔ اس کے علاوہ اس میں ہندوؤں کی آبادی بہت زیادہ تھی، کاٹھیاوار، احمد آباد اور سومنات جیسے اہم مقامات اس میں واقع تھے۔ جب اورنگ زیب عالم گیر کو اس کی نظامت تفویض ہوئی، یہ علاقہ لوٹ مار، قتل و غارت اور سلب و نہب کا گڑھ بنا ہوا تھا، اس کی اصلاح کرنا اور انتہائی بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن عالم گیر اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اس میں بھی کامیاب رہا۔ اس نے ذہانت و فطانت اور جرأت سے کام لے کر پورے علاقے میں پھیلی ہوئی بدنظمی کو ختم کر دیا اور اس نواح کے فسادیوں، چوروں اور لٹیروں کو اس طرح محاسبے کی زنجیر میں جکڑا اور اس طرح ان کا چاروں طرف سے تعاقب کیا کہ وہ قطعی طور سے بے بس اور مغلوب ہو گئے اور نتیجتاً پورے صوبے میں امن و امان کا شامیانہ تن گیا۔

بلخ و بدخشاں کی مہم

یہ وہ وقت تھا جب عالم گیر سخت آزمائش اور ابتلا کے دور سے گزر رہا تھا۔ بادشاہ اس کے کام میں بار بار رکاوٹیں ڈالتا اور مختلف طریقوں سے اس کی اصلاحِ احوال کی

مساعی میں سدِّ راہ ہوتا تھا۔ چنانچہ نظامتِ گجرات کے سلسلے میں بھی یہی ہوا، اس کو یہاں کی عنانِ اختیار ہاتھ میں لیے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے اور اس کی اصلاحی کوششیں ابھی کامیابی سے ہم کنار ہونے ہی لگی تھیں کہ ۳ شعبان ۱۰۵۶ھ (۴ ستمبر ۱۶۴۶ء) کو شاہ جہان کا حکم موصول ہوا کہ گجرات کی نظامت، حاکمِ مالوہ شائستہ خاں کے سپرد کر کے فوراً لاہور پہنچو، تمھیں اب بلخ اور بدخشاں کی مہم پر بھیجنا مقصود ہے۔

یہ وہ علاقہ تھا، جہاں شاہ زادہ مراد بخش کی سرکردگی میں پچاس ہزار فوج روانہ کی گئی تھی، لیکن اس علاقے اور اس کے ماحول سے وہ جلد ہی اُکتا گیا تھا اور بلا اجازت واپس آ کر شہنشاہ کو استعفیٰ پیش کر دیا تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بلخ، بخارا اور بدخشاں مغلوں کے ممالک محروسہ میں شامل نہ تھے، لیکن کسی زمانے میں یہ علاقے امیر تیمور کی مملکت کا حصہ رہ چکے تھے، اس لیے ہندوستان کے مغل حکمرانوں کی یہ شدید خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان علاقوں کو زیرِ نگین کیا جائے۔ شاہ جہان کے زمانے میں اس خواہش کی تکمیل کے لیے حالات سازگار ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بلخ و بخارا وغیرہ کا اصل حاکم، جس کا نام امام قلی خاں تھا، ایک نیک خصال شخص تھا۔ وہ بتیس ۳۲ برس حکومت کرنے کے بعد مدینہ منورہ چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی نذر محمد خاں حکمرانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ لیکن اپریل ۱۶۴۵ء میں نذر محمد خاں اور اس کے بیٹے عبدالعزیز خاں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے، جس کے نتیجے میں عبدالعزیز نے باپ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ نذر محمد خاں بیٹے کے مقابلے میں بے بس ہو گیا تو شاہ جہان سے خط کے ذریعے اس علاقے پر حملہ آور ہونے اور مداخلت کرنے کی استدعا کی۔ شاہ جہان نے جو ایک عرصے سے موقع کی تاک میں بیٹھا تھا، پہلے تو جون ۱۶۴۶ء میں مراد بخش اور علی مردان خاں کو اور پھر ۱۵ محرم ۱۰۵۷ھ (۱۰ فروری ۱۶۴۷ء) میں اورنگ زیب عالم گیر کو اس مہم پر روانہ کیا۔ اورنگ زیب نے پچیس ہزار فوج لے کر لاہور سے کوچ کیا اور ایک مہینے میں (۴ صفر ۱۰۵۷ھ / ۱۲ مارچ ۱۶۴۷ء) کو پشاور پہنچا۔ پشاور سے چل کر وہ کابل میں آیا۔ یہ فاصلہ بھی تقریباً ایک

مہینے میں طے ہوا، کابل سے آگے بڑھا اور ازبکوں کو شکست دیتا ہوا، بلخ جا پہنچا۔

اس جنگ میں اورنگ زیب نے نہایت بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ ثبات قدمی اور دلیری اس کا بہت بڑا وصف تھا، جو اس جنگ میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ تاریخ نے جو واقعات اس ضمن میں بہم پہنچائے ہیں، ان میں ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے اور یہی وہ واقعہ ہے، جس نے لڑائی کا فیصلہ کر دیا۔ عین اس وقت جب کہ معرکۂ کارزار گرم تھا، نماز کا وقت آگیا۔ عالم گیر ہر صورت میں نماز ادا کرنا چاہتا تھا، لیکن جو امرائے جنگ اس کے ہم رکاب تھے، انھوں نے روکنے کی کوشش کی اور اپنے عظیم جرنیل کو لڑائی کے مہیب خطرات سے آگاہ کیا، لیکن اس نے کسی کی ایک نہ مانی۔ وہ فریضہ نماز ادا کرنے کے لیے گھوڑے سے اُترا اور پورے اطمینان کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس کے مدِمقابل عبدالعزیز خاں والی بخارا کو اس واقعہ کا علم ہوا تو بے ساختہ پکار اٹھا:

با چنیں کسے در اُفتادن بر اُفتادن است[۱]

ایسے شخص سے لڑنا اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے لڑائی بند کرنے کا اعلان کر دیا اور صلح کی پیش کش کی، چنانچہ شاہجہان کے مشورے سے جو اس زمانے میں کابل میں بیٹھا محاذِ جنگ کی نگرانی کر رہا تھا، رمضان ۱۰۵۷ھ (ستمبر ۱۶۴۷ء) میں عبدالعزیز خاں سے صلح کر لی گئی —— اورنگ زیب کے بعض نقاد مؤرخ جو یہ کہا کرتے ہیں کہ اس نے باپ کی اسارت کے جرم اور بھائیوں کے قتل کے فعلِ قبیح کو چھپانے کے لیے اپنے "معصیت آلود چہرے" پر نیکی اور خدمتِ دین کا خول چڑھا لیا تھا، یہ واقعہ ان کی تردید کے لیے کافی ہے، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اورنگ زیب عالم گیر نے تقویٰ اور تدین کی راہ صرف تختِ حکومت پر متمکن ہونے کے بعد ہی اختیار نہیں کی، وہ زمانۂ شاہ زادگی میں بھی جب کہ فرماں روائی کی منزل بہت دُور تھی، نہایت متدین، نیک

---

[۱] مآثرِ عالم گیری، ص ۵۳۱

کردار اور پابندِ احکامِ شرع تھا، اور یہ واقعہ اس کی بیّن دلیل ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اورنگ زیب اس صلح سے مطمئن نہیں تھا، وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا، لیکن شاہ جہان کی مداخلت اور حکم سے اُسے مجبوراً وہیں گھوڑے کی لگامیں کھینچنا اور قدم روکنا پڑے۔

ملتان کی ولایت اور قندھار کی مہم

بلخ اور بدخشاں کی مہم سے واپسی کے بعد ۲۹ صفر ۱۰۵۸ھ (۱۵ مارچ ۱۶۴۸ء) میں عالم گیر کو ملتان کا والی مقرر کیا گیا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ۱۸ محرم ۱۰۵۹ھ (۲۲ جنوری ۱۶۴۹ء) میں قندھار کی پہلی مہم تفویض کی گئی —— آگے چلنے سے پہلے قندھار کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ۱۵۹۵ء میں اسے جلال الدین اکبر نے فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کیا تھا، لیکن ۱۶۲۲ء میں صفویوں نے اسے مغلوں کے قبضے سے آزاد کرا لیا تھا۔ ۱۶۳۸ء میں علی مردان خاں کی ہمت و مدد سے پھر مغلوں کے تسلط میں آگیا۔ اس کے بعد عباس شاہ صفوی دوم نے اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ شاہ جہان کو اس کی اطلاع پہنچی تو اس نے عالم گیر کے نام حکم جاری کیا کہ اس کو اور سعد اللہ خاں کو قندھار کی مہم تفویض کی گئی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں اس فوجی خدمت کی انجام دہی کے لیے روانہ ہوئے مگر ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی صفوی فوج نے قندھار پر قبضہ کر لیا تھا۔ تاہم عالم گیر اور سعد اللہ خاں نے پیش قدمی جاری رکھی اور قندھار کا محاصرہ کر لیا۔ کئی مہینے کے بعد محاصرہ اٹھانا پڑا اور عالم گیر واپس ملتان آگیا۔

کچھ عرصے بعد عالم گیر کو دوبارہ قندھار کی مہم پر جانے کا حکم ہوا۔ اس نے جاتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس اثنا میں خود شاہ جہان بھی کابل پہنچ گیا تھا۔ تین مہینے محاصرہ جاری رہا۔ لیکن شاہ جہان چوں کہ عالم گیر سے ناخوش تھا، اس لیے اس کے کام میں برابر مداخلت کرتا اور غیر جنگی نوعیت کی ہدایات دیتا رہا۔ یہ ہدایات اور مشورے وہ اپنے نامور وزیر سعد اللہ خاں کے ذریعے جاری کرتا تھا۔ جنگی وسائل کی کمی کے باعث یہ محاصرہ بھی بادشاہ کے حکم سے اٹھا لیا گیا۔ عالم گیر نے قندھار فتح کرنے کے لیے شہنشاہ سے ایک اور موقع ملنے

کی درخواست کی، لیکن یہ درخواست ٹھکرا دی گئی۔ اس دوران دارا شکوہ بھی برابر بادشاہ کو عالم گیر کے خلاف برانگیختہ کرتا رہا —— اب قندھار کی تیسری مہم کا آغاز دارا شکوہ کی کمان میں ہوا۔ کئی مہینے شہر کا محاصرہ جاری رہا، لیکن اس میں بھی ناکامی ہوئی۔

یہ واقعات بہت سی تفصیلات و جزئیات اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں، جنھیں ہم اپنے موضوع سے خارج قرار دے کر قلم زد کرتے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عالم گیر چار سال کے لگ بھگ ملتان کا اور ڈھائی سال تک ملتان اور سندھ دونوں کا والی رہا۔ درمیان میں اگرچہ دو مرتبہ وہ قندھار کی مہم پر بھی گیا، لیکن اپنے دَورِ ولایت میں ان علاقوں میں اس نے بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ اس عرصے میں مرکزی حکومت کی طرف سے نہ اسے کوئی قابلِ ذکر مدد ملی اور نہ کسی موقع پر اس کی قدر افزائی ہوئی بلکہ ہر معاملے میں حوصلہ شکنی کی گئی اور اس کے راستے میں مشکلات کے کانٹے بچھائے گئے۔ مخالفوں نے بہت سی غلط باتوں کو اس کے دامن میں ٹانکنے کی کوشش کی، مثلاً یہ کہ اس نے بعض لوگوں کے گھروں کو آگ لگا کر تباہ کر دیا ہے، ساحلِ سمندر پر اپنا ایک تجارتی جہاز تیار کر لیا ہے، جس کو اپنی ذاتی آمدنی کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور یہ کہ وہ مرکز سے رابطہ توڑنا چاہتا ہے —— لیکن اس مردِ مجاہد نے کسی بات کی پروا نہیں کی اور محدود وسائل کے باوجود برابر اپنے علاقوں کی ترقی کے لیے کوشاں رہا۔ شاہ جہان نے بھی اس کو تلخ اور سخت خط تحریر کیے اور اس کے ترقیاتی منصوبوں میں قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالیں، مگر اس لائق اور باہمت بیٹے نے شہنشاہ کو ہر خط کا توازن اور ادب سے جواب دیا اور اس کے قلم اور زبان نے کبھی حدِّ اعتدال سے باہر قدم نہیں رکھا۔

ان تمام معاملات میں اس کا اصل مخالف بڑا بھائی دارا شکوہ تھا، جو ہر وقت بادشاہ سے اس کے خلاف غلط سلط باتیں کرتا رہتا تھا۔ ادھر بادشاہ کی حالت یہ تھی کہ وہ بے شک بڑا فہیم، جری اور نیک تھا، لیکن عالم گیر کے متعلق دارا شکوہ کی ہر بات کو صحیح قرار دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ عدل و قسط کے تقاضوں سے گویا محروم ہو چکا تھا۔

دوسری دفعہ نظامتِ دکن

اسی اثنا میں عالم گیر کو دوسری دفعہ دکن کی نظامت پر مامور کیا گیا۔ بادشاہ کی طرف سے تاکید کی گئی تھی کہ وہ فوراً ملتان سے دکن پہنچے۔ یہ حکم اس کو ماہِ شعبان ۱۰۶۲ھ (جولائی ۱۶۵۲ء) میں موصول ہوا، جس کی رُو سے اس نے ۱۲ رمضان (۷ اگست) کو بادشاہ کی خدمت میں حاضری دی اور ۲۲ رمضان (۱۷ اگست) کو عازمِ دکن ہوا۔ ۹ ستمبر کو دریائے سندھ عبور کیا، ۱۷ نومبر کو دہلی سے گزرا، ۲۸ نومبر کو آگرے پہنچا۔ اس طرح ۱۵ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ (۳ فروری ۱۶۵۳ء) کو اس نے برہان پور میں پڑاؤ کیا۔ اس کو کثرتِ باراں کا نتیجہ قرار دیجیے یا عالم گیر کی سُست رفتاری سے تعبیر کیجیے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ یہ سفر اس نے تقریباً آٹھ مہینے میں طے کیا۔

اس طویل سفر کے دوران میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے، جن کی وجہ سے عالم گیر کا کردار بادشاہ کی نظر میں مشکوک قرار پا گیا۔ ان میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ جب عالم گیر آگرے سے گزر رہا تھا تو اس کی ملاقات اپنے بڑے بھائی شجاع سے ہوئی۔ قندھار کی تگ و تاز کے زمانے میں شجاع کو بھی دکن سے بلایا گیا تھا، لیکن دارا شکوہ نے کچھ ایسا طریقِ عمل اختیار کیا کہ وہ آگرے سے آگے نہیں جا سکا تھا۔ اس بات کا اسے شدید احساس تھا۔ مستقبل میں جو واقعات رونما ہونے والے تھے ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ ملاقات بڑی اہمیت کی حامل تھی، اس میں دونوں بھائیوں نے آئندہ کے لیے آپس میں دوستی کا پیمان باندھا ہوگا۔ غالباً اس کو مزید پختہ کرنے کی غرض سے عالم گیر کے بیٹے سلطان محمد کی شجاع کی بیٹی سے نسبت بھی قرار پا گئی۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ جب عالم گیر برہان پور پہنچا تو وہاں اپنے خالو سیف الدین کے ہاں مقیم ہوا۔ اس بہانے وہاں ہیرا بائی نامی ایک خاتون سے شادی کی جو بعد میں زین آبادی محل کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ وہ واقعات تھے جو شاہ جہان کو سخت ناگوار گزرے۔ چنانچہ ان کے بارے میں اس سے جواب طلبی ہوئی۔ بیٹے نے باپ کو سب باتوں کا تفصیل سے جواب دیا اور تلخیٔ احوال کے باوجود دکن کی عنانِ نظامت ہاتھ میں لی۔

دکن کے سیاسی، انتظامی اور اقتصادی حالات نہایت ابتر تھے اور عالم گیر ہر گوشے کی اصلاح کرنا چاہتا تھا، لیکن دارا شکوہ نے اس کے خلاف جو سازشوں کا جال بچھا رکھا تھا، وہ قدم قدم پر اس کے راستے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہو رہا تھا۔ اسی وجہ سے شاہ جہان بار بار اس کو آگے بڑھنے سے روکتا تھا، تعجب یہ ہے کہ جو احکام خود جاری کرتا تھا، ان ہی پر عمل نہیں ہونے دیتا تھا۔ دکن کی ریاستیں سرکشی پر اتر آئی تھیں اور عالم گیر کے نزدیک ان کا سر کچلنا ضروری تھا۔ عالم گیر چاہتا تھا کہ دکن کے شر پسند عناصر کو اتنی سخت سزا دی جائے کہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں۔ لیکن شاہ جہان کی طرف سے ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور یہ ریاستیں دہلی کی مرکزی حکومت کے زیر نگیں نہ آسکیں۔ عالم گیر کو اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے کا شدید احساس اور بے حد افسوس تھا۔ اس سلسلے میں اپنے بعض خطوط میں جو اس نے بادشاہ اور جہاں آرا بیگم کے نام لکھے، اس بات کا شکوہ بھی کیا ہے۔

اسی اثنا میں ۲۷ ذیقعدہ ۱۰۶۷ھ (۶ ستمبر ۱۶۵۷ء) کو شاہ جہان سخت بیمار ہو گیا اور اس کے چاروں بیٹوں، دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب عالم گیر اور مراد بخش کے درمیان وراثتِ تخت کے سلسلے میں شدید تصادم کی فضا پیدا ہو گئی۔

دارا شکوہ کا کردار اور بھائیوں کا ردِّ عمل

دارا شکوہ مذہب اور عقیدے میں عام مسلمانوں سے بہت حد تک مختلف تصوّرات کا حامل تھا۔ وہ اگرچہ علومِ اسلامی سے آگاہ اور فنونِ مروّجہ سے بہرہ ور تھا، تاہم اس کے افکار و رجحانات شرعی احکام سے ہم آہنگ نہ تھے اور وہ عملی اور ذہنی اعتبار سے سخت انتشار اور تضادات کا شکار تھا۔ اس کے نزدیک قرآنِ مجید اور بھگوت گیتا میں کوئی فرق نہ تھا۔ ایک اپنشد کا بھی اس نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ بزرگانِ دین کے حالات میں بھی اس نے سفینۃ الاولیا اور سکینۃ الاولیا کے نام سے کتابیں تصنیف کیں۔ ایک طرف اگر وہ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقِ ارادت رکھتا تھا تو دوسری جانب ہندو جوگی لال داس کے حلقۂ عقیدت سے بھی وابستہ تھا۔ یعنی مسلمان صوفیا اور

ہندو جوگی دونوں عبادت اور بھگتی میں اس کے نزدیک یکساں درجہ رکھتے تھے۔

دارا شکوہ کے ان عقائد و نظریات کی بنا پر علمائے دین اور متبعین شریعت اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور حکومت کے در و بست پر اس کے تسلط سے ان کو سخت اختلاف تھا۔ لیکن حیرت انگیز تعجب کی بات ہے کہ شاہ جہان فہیم و فریس اور متبع سنت ہونے کے باوجود ملکی معاملات میں اسی کی رائے کو لائق اعتنا اور قابلِ عمل قرار دیتا تھا۔ شاہ جہان کے ایامِ مرض میں بھی یہی ہوا۔ شاہ جہان حبسِ بول کے عارضے میں مبتلا ہو کر کاروبارِ حکومت چلانے کے قابل نہ رہا تو دارا نے موقع مناسب پا کر عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

شاہ جہان کی بیماری کی خبر نہایت تیزی کے ساتھ پورے ملک میں پھیل گئی تھی، بلکہ بعض مقامات میں اس کی موت کی افواہ بھی گردش کرنے لگی تھی۔ اس قسم کی افواہوں کے پھیلنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ دارا شکوہ نے باپ کے واقعۂ مرض کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی اور ملک کے انتظام و انصرام پر خود قابض ہو گیا تھا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ دکن، گجرات اور بنگال کے تمام راستے بند کر دیے اور مختلف اہم ٹھکانوں پر سخت پہرے بٹھا دیے تاکہ نہ کوئی راز کی خبر باہر جا سکے اور نہ مراد بخش، شجاع اور اورنگ زیب میں سے کوئی بھائی دہلی کی طرف کوچ کر سکے۔ ان کے جو وکلا و سفرا دربار میں متعین تھے، ان سے بھی ضمانت لی کہ وہ دربار کی کوئی خبر انھیں نہ بھیجیں گے۔ بعض کے گھر بار بھی لوٹ لیے۔ ایک اقدام اس نے یہ کیا کہ مراد بخش اور اورنگ زیب میں اختلاف پیدا کرنے کی غرض سے برار کا وہ علاقہ جو اورنگ زیب کی ولایتِ دکن میں شامل تھا، مراد کو دے دیا اور قاسم خاں اور جودھ پور کے راجا جسونت سنگھ کو فوج کی بھاری جمعیت کے ساتھ مالوہ کی طرف روانہ کیا۔ ان واقعات سے جو شاہ جہان کی بیماری کے فوراً بعد رونما ہوئے، دارا شکوہ کی طرف سے بھائیوں کے دلوں میں کئی قسم کے شبہات پیدا ہو گئے اور انھوں نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔

شجاع اس زمانے میں بنگال میں مقیم تھا، اس نے راج محل کے مقام پر "ابوالفوز ناصر الدین محمد، تیمور ثالث، سکندر ثانی، شاہ شجاع غازی" کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان

کردیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ داراشکوہ نے باپ کو زہر دے دیا ہے، اس لیے وہ بڑے بھائی سے لڑنے کے لیے عازم آگرہ ہوا۔ ۲۴ ربیع الثانی ۱۰۶۸ھ (۲۵ جنوری ۱۶۵۸ء) کو وہ بنارس کے قریب پہنچا، یہاں بہادر پور کے نواح میں شاہی فوج سے، جس کی کمان سلیمان شکوہ اور جے سنگھ کر رہے تھے، اس کا مقابلہ ہوا اور شکست کھائی۔ یہ واقعہ ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۰۶۸ھ (۱۶ فروری ۱۶۵۸ء) کو پیش آیا۔

مراد بخش ان دنوں گجرات میں تھا، اس نے احمد آباد کو دارالخلافہ قرار دے کر مروج الدین کے لقب سے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور غازی مراد بخش کے نام سے اپنا الگ سکّہ بھی جاری کر لیا نیز دارا کو ایک تہدید آمیز خط لکھا اور لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کی فوجی طاقت چوں کہ کم تھی اس لیے دکن میں اورنگ زیب عالم گیر کو مسلسل اور متعدد خطوط لکھے، جن میں امداد و اتحاد کی التجا کی۔

سلطنتِ مغلیہ کے لیے یہ انتہائی نازک وقت تھا، اورنگ زیب عالم گیر ان دنوں دکن میں مقیم تھا اور نہایت تذبذب اور تحیّر کی کیفیت اس پر طاری تھی۔ وہ بے حد محتاط اور گہرا آدمی تھا، اس لیے عجلت میں کوئی قدم اٹھانا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہ البتہ اسے یقین تھا کہ بادشاہ فوت نہیں ہوا، زندہ ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ بادشاہ کو اس معاملے میں داراشکوہ کی حمایت نہیں کرنی چاہیے اور جو زیادتیاں وہ کر رہا ہے، اس کا بہرحال ازالہ ہونا چاہیے لیکن افسوس ہے اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور چند روز میں شاہی فوجیں مالوہ کے علاقے میں گھس گئیں۔ ان کا ارادہ پہلے مراد بخش کو شکست دینے اور اس کے بعد دکن پہنچ کر اورنگ زیب عالم گیر سے نبرد آزما ہونے کا تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر نے جب یہ دیکھا کہ حالات لمحہ بہ لمحہ بگڑ رہے ہیں اور مراد بھی اس سے طلبِ امداد کے لیے انتہائی مضطرب ہے تو اس نے مراد کی درخواست قبول کر لی اور اپنی فوج کو آگرے کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔

اورنگ زیب کا لشکر دریائے نربدا عبور کر کے آگے بڑھا تو اجیّن کے مقام پر مراد کی فوجیں بھی اس سے آملیں۔ راجا جسونت سنگھ کو جب اس کا پتا چلا تو اس نے بھی اپنی فوجوں کو حرکت دی اور عالم گیر کے پڑاؤ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر خیمہ گاڑ دیا۔ اورنگ زیب

نے شاہی فوج کے سپہ سالار کو پیغام بھیجا کہ ہمارا مقصد لڑائی کا بازار گرم کرنا نہیں ہے، ہم اپنے باپ شہنشاہ ہند سے ملنے اور ان کی عیادت کے لیے آگرے جانا چاہتے ہیں، لہٰذا ہمارا راستہ نہ روکو اور اپنا سفر جاری رکھنے دو۔ لیکن جسونت سنگھ نے عالم گیر کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور سیپری ندی کے گھاٹوں کی ناکہ بندی کر کے سخت پہرے بٹھا دیے تاکہ عالم گیر اور مراد کی فوجیں ندی عبور نہ کر سکیں۔ عالم گیر نے اس موقع پر نہایت تحمل کا ثبوت دیا اور پہرے داروں سے متصادم ہونے سے گریز کرتے ہوئے بندھیلہ سرداروں کی مدد سے چند میل کا چکر کاٹ کر ندی کو عبور کیا۔ یہ صورتِ حال جسونت سنگھ اور شاہی فوجوں کو سخت ناگوار گزری اور دھرمٹ کے مقام پر دونوں جانب کی فوجوں کے درمیان شدید جنگ ہوئی، جس میں عالم گیر اور مراد فتح یاب ہوئے اور شاہی فوج کو کامل ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بہت سے سردار اور سپاہی مارے گئے اور قاسم خاں اور جسونت سنگھ نے میدانِ جنگ سے فرار ہو کر جان بچائی۔ عالم گیر نے اس فتح کی یادگار کے طور پر اسی میدان میں ایک قصبہ آباد کیا، جو فتح آباد کے نام سے مشہور ہوا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ راجا جسونت سنگھ جب عالم گیر کی فوج سے شکست کھانے کے بعد بھاگ کر وطن پہنچا تو اس کی بیوی نے اس کو اپنے قریب آنے سے سختی کے ساتھ روک دیا اور پھر تمام عمر اس سے ہم بستر نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے شوہر راجا جسونت سنگھ سے صاف لفظوں سے کہا کہ میدان جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگنے والا میرے ہم صحبت ہونے کے قابل نہیں رہا[۵۳]

جنگ کے اس نتیجے سے آگرے میں سخت اضطراب اور ہیجان پیدا ہو گیا اور شاہی حلقوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ شاہ جہان آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے دہلی جا رہا تھا کہ اس غیر متوقع خبر سے رُک گیا۔ اب اس نے بھائیوں کے درمیان صلح کرانے اور ان کی دشمنی کو ختم کرنے کی کوشش کی، لیکن دارا کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔

---

۵۳ منتخب اللباب، ج ۲، ص ۴۲

دارا اپنی شکستِ فاش سے پریشان ضرور تھا، لیکن صلح ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ مراد اور عالم گیر
کی افواج قاہرہ اب تیزی کے ساتھ آگرے کی طرف بڑھ رہی تھیں اور دارا ان کے ساتھ
فیصلہ کن لڑائی کی تیاری کر رہا تھا، اسے یقین تھا کہ وہ حریف کی فوجوں پر ضرور فتح پائے گا
چنانچہ شاہ جہان کی شدید مخالفت کے باوجود وہ ایک لاکھ سپاہ کی معیت میں آگرے سے نکلا
اور مخالفوں کو میدانِ جنگ میں شکست دینے کا عزم لے کر روانہ ہوا۔

ادھر عالم گیر اور مراد بھی اپنی جاں باز اور آزمودہ کار فوج کے ساتھ دار السلطنت
آگرے کی طرف بڑھ رہے تھے اور دریائے چنبل عبور کر چکے تھے۔ مئی کا مہینا تپ رہا تھا
گرمی شباب پر تھی کہ دارا شکوہ کی فوج نے آگرے سے روانہ ہو کر ساموگڑھ کے مقام میں پڑاؤ
کیا جو آگرے سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۲۶ شعبان ۱۰۶۸ھ (۲۹ مئی ۱۶۵۸ء)
کو فریقین کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں اُتریں اور زبردست لڑائی ہوئی۔ یہ لڑائی
واقعی فیصلہ کن ثابت ہوئی اور دارا کو اس میں شکستِ فاش سے دوچار ہونا پڑا۔

یہاں اس لڑائی کی تاریخ کا یہ بیان لائق تذکرہ ہے کہ مراد نے اس معرکے میں نہایت
ثابت قدمی سے حصہ لیا اور جرأت و دلیری کا پورا ثبوت دیا۔ اس کے ہاتھی کا ہودہ تیروں سے
چھن گیا اور وہ خود لہولہان ہو گیا، لیکن پہاڑ کی طرح ڈٹا رہا اور برابر دشمن پر تیر برسا
رہا۔ یہ ہودہ فرخ سیر کے زمانے تک یادگار کے طور پر قلعے میں محفوظ رہا، جب سادات
بارہ کی سرکشی حد سے بڑھی تو عالم گیر کی بہن بادشاہ بیگم نے یہ ہودہ دکھلا کر کہا کہ یہ تیموری
نسل کی یادگاریں ہیں۔[1]

دارا شکوہ، ساموگڑھ کے میدان میں شکست کھانے کے بعد آگرے کی طرف بھاگا
شرم کے مارے شاہ جہان کے پاس نہیں گیا۔ شاہ جہان نے ضروری مشوروں کے لیے اسے بار
بار بلایا، لیکن وہ باپ سے ملے اور مشورہ کیے بغیر اسی رات اہل و عیال کے ساتھ آگرے
سے نکلا اور لاہور کے ارادے سے دہلی روانہ ہو گیا۔

---

[1] اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۷۹

بعد کے مختصر حالات

یہ دنیا دار المکافات ہے۔ یہاں ہر نیکی کی جزا اور ہر برائی کی سزا ملنی ضروری ہے۔ یہ ایک عالم گیر اور دائمی اصول ہے کہ خیر کا صلہ ثواب کی صورت میں اور معصیت کا بدلہ عقاب کی شکل میں ظہور میں آتا ہے۔ اس اصول میں تقدیم یا تاخیر تو ہو سکتی ہے، لیکن یہ ختم بالکل نہیں ہو سکتا —— اورنگ زیب اور دارا شکوہ یا اورنگ زیب اور شاہ جہان کے سلسلے میں یہی اصول رونما ہوا۔ قدرت کی کرشمہ سازیاں دیکھیے کہ وہی اورنگ زیب جس کے لیے کل دار السلطنت کے دروازے بند تھے، آج وہی اورنگِ سلطنت کا مالک بنا، اور اس دارا شکوہ کے لیے جو باپ کو بے بس کر کے مملکت کے سیاہ وسفید پر قابض تھا، آگرے کے دار الخلافہ میں ایک رات گزارنا بھی ناممکن ہو گیا۔ وہ پہلے دہلی گیا، وہاں سے پنجاب کا رُخ کیا اور لاہور سے ملتان اور ملتان سے سندھ ہوتا ہوا گجرات کی طرف بھاگا۔ اس کے تعاقب میں خود اورنگ زیب بھی پنجاب گیا اور اسے کبھی چین کا موقع نصیب نہ ہوا۔

جس زمانے میں دارا شکوہ گجرات پہنچا، اس زمانے میں وہاں کا والی شاہ نواز خاں تھا، اس کی بیٹی دلرس بانو اورنگ زیب کے عقد میں تھی، ساموگڑھ کی لڑائی کے بعد اورنگ زیب عالم گیر نے سُسر کو نظر بند کر دیا تھا، کیوں کہ اس کی ہمدردیاں فریقِ مخالف کے ساتھ تھیں، لیکن بعد میں حالات اعتدال پر آئے تو اس کو گجرات کا ناظم مقرر کر دیا گیا۔ اب دارا شکوہ گجرات پہنچا تو شاہ نواز خاں نے دارا کی حمایت اور اورنگ زیب کی مخالفت شروع کر دی۔ اسی اثنا میں راجا جسونت سنگھ نے جو اس سے قبل دھرمٹ کے میدان میں اورنگ زیب اور مراد سے بُری طرح ہزیمت اٹھا چکا تھا، دارا کو اجمیر آنے کی دعوت دی اور راجستھان کے راجپوتوں کی مدد کا یقین دلایا۔ اس سے دارا کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس نے اجمیر کا عزم کیا۔ ادھر اورنگ زیب کو صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ بھی ۱۰۶۹ھ (۱۱ مارچ ۱۶۵۹ء) کو ایک لشکر کے ساتھ اجمیر کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں فریقوں کے درمیان اجمیر کے نواح میں دیواری کے مقام پر گھمسان کا رن پڑا۔ تین دن لڑائی جاری رہی، نتیجتاً دارا کو پھر شکستِ فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ اس لڑائی میں شاہ نواز خاں بھی شریک تھا

جو میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ دارا نے وہاں سے پھر راہِ فرار اختیار کی، مگر چند روز بعد اورنگ زیب دہلی واپس آگیا۔

اس لڑائی میں ہزیمت اُٹھانے کے بعد دارا شکوہ سندھ کے راستے عازمِ ایران ہونا چاہتا تھا تاکہ ہمایوں کی طرح ایران کی مدد سے دوبارہ حصولِ سلطنت کی کوشش کی جائے۔ اس منصوبے کے تحت وہ بنوں کے قریب پہنچا تھا کہ ایک بلوچ سردار ملک جیون نے پکڑ کر اُسے شاہی حکام کے حوالے کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۲ شوال ۱۰۶۹ھ (۳ جون ۱۶۵۹ء) کو پیش آیا۔ بنوں سے ۲۰ ذوالحجہ ۱۰۶۹ھ (۲۹ اگست ۱۶۵۹ء) کو اسے دہلی لایا گیا۔ اس کے عقائد کی بنا پر علما نے اس پر کفر و الحاد کا فتویٰ جاری کیا، جس کی پاداش میں اگلے روز ۲۱ ذوالحجہ ۱۰۶۹ھ (۳۰ اگست ۱۶۵۹ء) کو اسے قتل کر دیا گیا۔

یہ تو تھا دارا شکوہ کا انجام۔ اب مراد بخش کے بارے میں سنیے، اس پر کیا بیتی؟

جیسا کہ پہلے گزر چکا، دارا شکوہ نے دار السلطنت میں بیٹھ کر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا، اس پر سب بھائی نالاں تھے۔ مراد بخش نے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا اور اپنے نام کا سکہ اور خطبہ بھی جاری کر دیا تھا۔ اس نے اورنگ زیب عالم گیر سے جو ان دنوں دکن کا والی تھا، آگرے کی طرف کوچ کرنے کی غرض سے خط و کتابت بھی کی تھی اور اسی کی تحریک اور پیہم درخواستوں کی بنا پر اورنگ زیب نے آگرے کا قصد کیا تھا۔ اورنگ زیب نے مراد کے قصدِ آگرہ کی درخواست قبول کرتے ہوئے اسے یہ عہد نامہ لکھ کر دیا تھا کہ اگر وہ (اورنگ زیب عالم گیر) حصولِ سلطنت میں کامیاب ہو گیا اور مراد بخش آخر وقت تک وفادار رہا تو اُسے کابل، کشمیر، شمالی پنجاب اور سندھ کے علاقے دے دیے جائیں گے —— بلاشبہ مراد بڑا بہادر اور جری تھا اور دھرمٹ اور سامو گڑھ میں نہایت شجاعت اور جواں مردی سے لڑا تھا، لیکن طبیعت کا تیز اور عجلت پسند تھا، مے نوش اور عیاش تھا۔ معرکہ سامو گڑھ کے بعد جب زمامِ سلطنت عالم گیر کے ہاتھ میں آئی تو مراد نے بہت ہی عجلت پسندی کا ثبوت دیا اور درپردہ عالم گیر کی مخالفت کرنے لگا۔ خفیہ طور پر شاہ جہان سے خط و کتابت شروع کر دی، ساتھ ہی اورنگ زیب عالم گیر کے امرائے سلطنت کو لالچ دے کر اپنی حمایت پر کمر بستہ کرنے کی

مہم کا آغاز کر دیا۔ نیز اورنگ زیب کو وہ وعدے یاد دلائے جو اس کے ساتھ کیے گئے تھے۔ اورنگ زیب نے اُسے ہر چند سمجھایا کہ ابھی حالات اعتدال پر نہیں آئے، لڑائی اختتام کو نہیں پہنچی اور کش مکش کا سلسلہ جاری ہے، لیکن اس نے ایک نہ مانی اور عالم گیر کو برابر پریشان کرتا رہا۔ آخر تنگ آکر اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے سلیم گڑھ میں اور بعد کو گوالیار کے قلعے میں محبوس کر دیا گیا اور وہیں ۲۱ ربیع الاوّل ۱۰۷۲ھ (۴ دسمبر ۱۶۶۱ء) کو شاہی دیوان علی قلی خاں کے قصاص میں اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا۔

باقی رہا تیسرا بھائی شجاع، تو اس نے حالات کی ابتری سے فائدہ اٹھانے کے لیے بنگال سے تازہ دم فوج کے ساتھ آگرے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ عالم گیر ان دنوں داراشکوہ کے تعاقب میں پنجاب میں سرگرمِ عمل تھا۔ اسے شجاع کے ارادوں کی اطلاع پہنچی تو فوراً پیچھے مڑا اور الٰہ آباد کے قریب جا کر پڑاؤ کیا۔ ادھر شجاع بھی اپنی فوجوں کے ہم رکاب وہاں پہنچ چکا تھا۔ دونوں کے درمیان الٰہ آباد کے جوار میں کھجوہ کے مقام پر لڑائی کا آغاز ہوا، اور ۱۰ ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ (۵ جنوری ۱۶۵۹ء) کو شجاع نے عالم گیر کے ہاتھوں بُری طرح شکست کھائی اور راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ وہ بے شمار ساز و سامان اور اسلحہ جنگ کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا، سب وہیں چھوڑ گیا۔ میر جملہ اور عالم گیر کا بیٹا شاہ زادہ سلطان محمد اس کے تعاقب میں گئے۔ لیکن سلطان محمد سے شجاع کی بیٹی منسوب تھی، لہٰذا وہ چچا کے ساتھ جا ملا، اس کے نتیجے میں وہ سزاوارِ عتاب قرار پایا اور گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا گیا —— میر جملہ نے انتہائی شجاعت کا ثبوت دیا اور شجاع کو بنگال سے نکال کر دم لیا۔ شجاع نے بنگال سے نکل کر پہلے تو آسام کے راجا کے ہاں پناہ لی، پھر اس سے مخالفت ہو گئی تو ارکان بھاگ گیا۔ بعد ازاں غالباً جنوری ۱۶۶۱ء میں وہاں کے پہاڑی قبائلیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔[۵۵]

شاہ جہان کا طرزِ عمل اور عالم گیر کی اطاعت شعاری

شاہ جہان کے چار بیٹے تھے۔ داراشکوہ، شجاع، اورنگ زیب عالم گیر اور مراد بخش۔

---

۵۵ اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ۔ مقالہ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر۔ از شیر محمد گریوال، جلد ۱۸/۲، ص ۷۵

اورنگ زیب بہ ترتیب عمر چاروں بھائیوں میں تیسرے درجے پر تھا، لیکن قابلیت و استعداد، بہادری و جواں مردی، دوراندیشی و جفاکشی، علم و عرفان، مردم شناسی، کردار کی پختگی، بلند حوصلگی اور انتظامی نقطۂ نظر سے سب سے فائق تر تھا۔ اس نے ملک کے دور دراز علاقوں میں نظم ونسق کی عظیم ذمہ داریوں پر فائز رہ کر وسیع تجربات حاصل کر لیے تھے اور ایامِ شاہ زادگی ہی میں منجھے ہوئے سیاست دانوں اور باتدبیر حکمرانوں کے تمام اسالیبِ فکر کو اپنا لیا تھا، وہ انتہائی ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک، متحمل مزاج اور محتاط حکمران تھا۔ جذبات کو قابو رکھنا اور دل کی بات کسی کو نہ بتانا اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ اس کی ذہنی اور فکری قوت اس درجہ تیز تھی کہ ایسے تمام معاملات کو نہایت عجلت سے حیطۂ فہم میں لے آتا جو حصولِ مقاصد میں اس کے لیے مفید ہو سکتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب شاہ جہان اپنے چاروں بیٹوں کے بارے میں سوچتا تو ہر پہلو سے عالم گیر ہی کو ان پر ترجیح دیتا اور اس کے عزم و حزم اور گوناگوں صلاحیتوں کا صاف الفاظ میں اعتراف کرتا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس کا کون بیٹا کس درجے کا ہے۔

شاہ جہان آئندہ کاروبارِ حکومت کے سلسلے میں بہت فکرمند رہتا تھا اور بعض مقربینِ خاص سے اس کا ذکر بھی کرتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے علی مردان خاں اور اپنے وزیرِ اعظم سعد اللہ خاں کو خلوت میں بلایا اور خاص طور سے اس موضوع پر گفتگو کی، ان سے کہا کہ میں اس معاملے میں بڑا فکرمند ہوں، آپ اللہ کے لیے فقرا و صلحا کے ساتھ مل کر دعا کریں کہ ہماری مملکت کا مستقبل بہتر ہو اور میرے بیٹوں کو بارگاہِ خداوندی سے عملِ خیر کی توفیق نصیب ہو۔ اس کا ذکر خود عالم گیر نے اپنے ایک خط میں کیا ہے، جو اس نے اپنے ایک بیٹے کے نام لکھا۔ آگے چل کر وہ اس نتیجے کا ذکر کرتا ہے، جس پر شاہ جہان اپنے بیٹوں کے بارے میں پہنچا تھا اور جس کا تذکرہ اس نے خود علی مردان خاں اور سعد اللہ خاں سے ان الفاظ میں کیا۔

بعضے اوقات اندیشہ خاطر راہ می یابد کہ مہین پور خلافت اگرچہ اسباب شان و شوکت و سامانِ تجمل و صولت ہمہ دارد لیکن عدوِ نیکوان و دوستِ بداں واقع شدہ۔ شجاع غیرانہ سیر چشمی وصفے نہ دارد و مراد بخش مجہول الکیفیت بہ اکل و شرب ساختہ دائم الخمر است، مگر

فلاتی این عاجز فانی ذی عزم و مآل اندیش بہ نظر می آید، اغلب کہ متحمل امرِ خطیر ریاست تواند شد۔[۵۶]

یعنی بعض دفعہ میرے دل میں یہ خطرات پیدا ہوتے ہیں کہ داراشکوہ اگرچہ حکومت کے آدابِ شان و شوکت اور اصولِ تحمل و تہور سے آگاہ ہے، لیکن اس میں یہ بُرائی راسخ ہو چکی ہے کہ نیک لوگوں کا دشمن اور بدکردار لوگوں کا دوست ہے، شجاع سیر چشمی کے علاوہ کسی وصف سے بہرہ ور نہیں، مراد بخش ہر معاملے کی کیفیت سے محروم اور ہر آن کھانے پینے میں مگن اور ہر وقت شراب نوشی میں مشغول رہتا ہے۔ بعدازاں اس عاجز فانی (اورنگ زیب عالم گیر) کا نام لے کر کہا کہ وہ صاحبِ عزم اور دور اندیش ہے، مجھے یقین ہے وہ حکومت کے اس بارِ گراں کا متحمل ہوگا۔

بہرحال شاہ جہان ایک مردم شناس بادشاہ تھا اور اورنگ زیب کو "ذی عزم و مآل اندیش" سمجھتا تھا۔ لیکن افسوس ہے، بقول شیخ محمد اکرام کے "اپنی حکومت کے آخری پندرہ بیس سالوں میں اس نے اورنگ زیب سے کوئی قدردانی کا برتاؤ نہیں کیا۔"[۵۷] اس زمانے کے احکام و خطوط پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اورنگ زیب کے بارے میں باپ کا طرزِ عمل نہ صرف پدرانہ شفقت و محبت سے خالی تھا بلکہ سراسر معاندانہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس سے بازپرس کی جاتی، اسے امرا کے سامنے ڈانٹ دیا جاتا اور اس کے لائقِ فخر کارناموں کو بھی ناقابلِ تعریف قرار دیا جاتا۔ حد تو یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کی توسیع اور ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے گولکنڈہ اور بیجاپور وغیرہ میں اس نے خود بادشاہ کے حکم سے جو نمایاں کارنامے انجام دینا شروع کیے، ان میں بھی رکاوٹ ڈالی گئی اور دوسروں کی نظر میں اسے لائقِ ملامت بلکہ ذلیل ٹھہرایا گیا۔

یہ سلسلہ یہاں تک دراز ہوا کہ ساموگڑھ کی لڑائی کے بعد جو واقعات پیش آئے، ان میں بھی اورنگ زیب عالم گیر کے بارے میں شاہ جہان کا طرزِ عمل بڑا حیران کن بلکہ افسوس ناک رہا۔ شاہ جہان قلعہ آگرہ میں بیمار پڑا تھا اور نہایت تکلیف کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ داراشکوہ

۵۶۔ رقعاتِ عالم گیری، ص ۱۹، ۲۰

۵۷۔ رودِ کوثر، ص ۴۵۴، ۴۵۵

نے اس کو عضوِ معطل قرار دے کر معاملاتِ سلطنت سے الگ کر دیا تھا۔ شاہ جہان کے بار بار روکنے اور یقین دلانے کے باوصف کہ تم عالم گیر کے مقابلے میں نہ نکلو، میں خود جا کر حالات پر قابو پا لوں گا، دارا نے اس کی ایک نہ مانی۔ اب ساموگڑھ میں عالم گیر کو فتح حاصل ہوئی اور اس نے ہندوستان کی وسیع مملکت کے در و بست پر قبضہ کیا تو شاہ جہان نے مبارک باد کا پیغام بھیجا اور ایک مرصع تلوار بھیجی جس پر "عالم گیر" کا خطاب کندہ تھا۔ اس نے بیٹے سے ملاقات کے اشتیاق کا اظہار بھی کیا اور قلعے میں آنے کی دعوت دی۔ عالم گیر کی بہن جہاں آرا بیگم بھی آئی جو عالم گیر کی شدید مخالف اور دارا کی حامی تھی، عالم گیر نے اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس نے بھی بھائی کو باپ سے ملاقات کے لیے مجبور کیا۔ عالم گیر کا دل صاف اور ضمیر مطمئن تھا، لہٰذا باپ کی خدمت میں حاضر ہونے اور ملاقات و سلام کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے امرا و مقربین نے اس کو روکا اور ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا تو وہ سوچنے لگا۔ اس سے آگے واقعاتِ عالم گیری کا مصنف عاقل خاں جو اُمرائے عالم گیری میں سے تھا، جن الفاظ میں شاہ جہان کے اصل ارادوں کی وضاحت کرتا ہے، وہ بڑے افسوس ناک ہیں۔ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ شاہ جہان ملاقات کے بہانے عالم گیر کو گرفتار کر کے دارا شکوہ کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ عاقل خاں کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

عین اس وقت کہ عالم گیر خیر خواہانِ دولت کی باتیں سن کر سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے، اچانک ناہر دل خاں چیلہ پہنچا۔ شاہ جہان نے خود اپنے ہاتھ سے دارا شکوہ کے نام خط لکھ کر بڑی احتیاط سے اس کے حوالے کیا تھا کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہونے پائے اور وہ یلغار کرتے ہوئے دہلی پہنچ کر دارا شکوہ سے اس کا جواب لائے۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ تم (دارا شکوہ) مطمئن ہو کر دہلی میں ٹھہرو، آگے نہ جاؤ، ہم یہیں تمام قصے کا فیصلہ کیے دیتے ہیں۔

اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

دارا شکوہ خاطر خود را جمع کردہ در شاہ جہان آباد ثبات قدم ورزد و از آں جا پیشتر نہ گزرد کہ ما دریں جا مہم را فیصل می فرمائیم۔

عاقل خاں اس سے آگے لکھتا ہے ۔

ایں فرمان مصدق و مصداق قول خیر خواہاں آمدہ ۔

یعنی دارا شکوہ کے نام شاہ جہان کے اس خط نے اورنگ زیب عالم گیر کے بہی خواہوں کی بات کی حرف بحرف تصدیق کر دی۔

مآثر الامرا کے مصنف نے یہ واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ناہر دل خاں چیلہ نے جو خط عالم گیر کی خدمت میں پیش کیا، اس میں شاہ جہان نے دارا شکوہ کو جو الفاظ لکھے تھے، ان کا مطلب یہ تھا کہ :

مضمون آں کہ او لشکر با فراہم آوردہ در دہلی ثبات قدم ورزد، ما دریں جا مہم را فیصل می فرمائیم [۵۸]

یعنی مضمونِ خط یہ تھا کہ وہ (دارا شکوہ) اپنی فوج کے ساتھ دہلی ہی میں قیام کرے، ہم اس مہم کا یہیں (آگرے میں) فیصلہ کر دیں گے ۔

اتفاق سے جنگ کے ان ایام میں ایک یورپی مورخ ڈاکٹر برنیر ہندوستان میں موجود تھا اور تمام واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے تھے۔ اپنے سفرنامے میں اس نے تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے ۔ ڈاکٹر برنیر کا پیرایۂ بیان اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ عالم گیر کا مخالف تھا، لیکن اس کے قلم نے بعض مقامات پر اصل حقائق کی بھی نشان دہی کر دی ہے۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں "اس کے بیان سے اجمال کی گرہ کھل جاتی ہے"۔ وہ لکھتا ہے :

شاہ جہان نے ایک معتبر خواجہ سرا کو اورنگ زیب کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "بے شک دارا شکوہ نے جو کچھ کیا نامناسب تھا" (اس نے آگے) اس کی بے سمجھی اور نالائقی کی باتیں یاد دلا کر کہا کہ "تم پر تو ہم ابتدا ہی سے دلی شفقت رکھتے تھے۔ پس تم کو ہمارے پاس جلد آنا چاہیے تاکہ ہمارے مشورے سے ان امور کا انتظام کیا جائے جو افراتفری کے باعث خراب اور ابتر پڑے ہیں"۔ لیکن اس محتاط شاہ زادے (یعنی عالم گیر) نے بدگمانی سے بادشاہ پر اعتماد کر کے قلعے میں

---

۵۸ مآثر الامرا، ج ۲، ص ۶۹۷

جلانے کی دیری نہ کی، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ بیگم صاحبہ (یعنی عالم گیر کی بہن جہاں آرا بیگم) کسی وقت بادشاہ سے جدا نہیں ہوتی۔ وہ اس کے مزاج پر اس قدر حاوی ہے کہ جو کچھ چاہتی ہے وہی ہوتا ہے، اور یہ پیغام اس کا ایک چکمہ ہے۔ اس نے تاتاری عورتوں میں سے جو محل سرا کے چوکی پہرے پر متعین رہتی ہیں، کچھ قوی ہیکل اور مضبوط مسلح عورتیں اسی مقصد کے لیے مقرر کر رکھی ہیں کہ جب عالم گیر قلعے میں داخل ہو تو فوراً اس پر ٹوٹ پڑیں۔[۹]

لین پول لکھتا ہے:

اس جال میں جو شاہ جہان نے اپنے بیٹے کے پھانسنے کے لیے بچھایا، خود شاہ جہان ہی اس میں پھنس گیا۔[۱۰]

بہر حال شاہ جہان نے مملکتِ ہند کی کئی اہم شخصیتوں کے نام عالم گیر کو دامِ تزویر میں پھانسنے کے لیے لکھا، ایک خط مہابت خاں کے نام بھی تحریر کیا جو اس زمانے کا نامور سپہ سالار تھا اور کابل میں مقیم تھا۔ لیکن عالم گیر کا رویہ اس کے بالکل برعکس تھا، وہ شاہ جہان کی خدمت میں حاضر ہو کر تفصیل سے بات کرنا چاہتا تھا اور اگر اس کی غلطی ثابت ہو جائے تو عفو و درگزر کا متمنّی تھا۔ مگر شاہ جہان کی تمام تر ہمدردیاں اب بھی دارا سے وابستہ تھیں، اس کی اصل وجہ جہاں آرا بیگم تھی، جو شاہ جہان کو سب سے زیادہ عزیز تھی اور وہ دارا کی زبردست حامی تھی۔ شاہ جہان نے عالم گیر کے خلاف شجاع کو بھی ہندی زبان میں ایک خفیہ خط لکھا اور برابر کوشاں رہا کہ کسی طرح عالم گیر کی فتح، شکست میں بدل جائے اور دارا تختِ حکومت پر متمکن ہو جائے۔ جب عالم گیر باپ سے بالکل مایوس ہو گیا تو قلعہ آگرہ پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ بالفاظِ دیگر یہ شاہ جہان کی تختِ ہند سے معزولی کا اعلان تھا۔

عالم گیر کا حوصلہ اور دل گردہ دیکھیے کہ شاہ جہان کی مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود اپنے

۹؎ سفرنامہ ڈاکٹر برنیر اردو ترجمہ ج ۱، ص ۱۱۴

۱۰؎ ترجمہ لین پول، ص ۵۴

بیٹے شاہ زادہ محمد اعظم کو شاہ جہان کی خدمت میں عفوِ تقصیر کے لیے بھیجا اور پانچ سو اشرفیاں اور چار ہزار روپے نذر کیے۔ بعد ازاں باپ کے لیے قلعے میں ہر قسم کے آرام و راحت کے سامان مہیا کر دیے۔ ڈاکٹر برنیر بھی عالم گیر کا سخت مخالف ہونے کے باوصف صاف لفظوں میں اس کی شہادت دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

غرضیکہ اورنگ زیب کا برتاؤ شاہ جہان کے ساتھ مہربانی اور ادب سے خالی نہ تھا۔ وہ حتی الامکان اپنے بوڑھے باپ کی ہر طرح سے خاطرداری کرتا اور نہایت کثرت سے اس کی خدمت میں تحفے تحائف بھیجتا رہتا۔ سلطنت کے اہم معاملات میں اس کی رائے اور مشورے مثل پیر و مرشد کی ہدایت کے طلب کرتا، اس کے عریضوں سے جو اکثر باپ کو لکھا کرتا تھا، ادب اور فرماں برداری ظاہر ہوتی ہے، عالم گیر کے اس طرزِ عمل سے شاہ جہان کی گردن کشی اور اس کا غصہ یہاں تک ٹھنڈا پڑ گیا کہ وہ معاملاتِ سلطنت میں بیٹے کو ضروری باتیں تحریر کرنے لگ گیا، بلکہ اپنے باغی فرزند کی سب گستاخانہ حرکتیں معاف کر کے اس کے حق میں دعائے خیر بھی کی۔[۱۱]

بہر کیف شاہ جہان کی معزولی اور قلعہ آگرہ پر پہرہ بٹھانے کے بعد بھی اورنگ زیب عالم گیر ہمیشہ باپ کا اطاعت شعار رہا اور اس کے ساتھ نہایت مؤدبانہ سلوک روا رکھا۔

شاہ جہان نیک اور با عمل آدمی تھا اور بدوِ شعور ہی سے علما کی صحبت و رفاقت میں رہنے کا عادی تھا، قلعہ آگرہ میں بھی اس نے اس روایت کو قائم رکھا۔ یہاں اس نے دیارِ ہند کے بہت بڑے عالم و فاضل اور فقیہ نام دار سید محمد قنوجی (متوفی ۱۱۰۱ھ) کو اپنے پاس بلایا، تاکہ علوم و معارف میں ان سے بحث و مذاکرہ کا سلسلہ جاری رہے اور بوقتِ ضرورت مسائلِ دینی میں ان سے رجوع کیا جائے۔ وہ شاہ جہان کی وفات تک اس کے ساتھ رہے، تجہیز و تکفین اور نمازِ جنازہ کے انتظامات میں بھی وہ باقاعدہ شامل تھے۔ مسائلِ فقہیہ میں وہ اس درجے کے صاحبِ فضل و کمال تھے کہ عالم گیر نے فتاویٰ عالم گیر کے مدوّنین کی عالی قدر جماعت میں ان کو شریک کیا۔

---

۱۱ ترجمہ سفرنامہ ڈاکٹر برنیر، ج ۱، ص ۲۸۹

اورنگ زیب کی تخت نشینی

گزشتہ سطور میں ساموگڑھ کی لڑائی کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کی تخت نشینی کے واقعہ کو وہیں چھوڑ کر پہلے اختصار کے ساتھ اس کے بھائیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کے بعد مجملاً شاہ جہان کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔ اب اس کی تخت نشینی اور بعد کے ضروری وقائع وحالات بیان کیے جاتے ہیں۔

اورنگ زیب یکم ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ (۲۳ جولائی ۱۶۵۸ء) کو، باغ اعزآباد (دہلی) میں جو بعد کو شالامار باغ کہلایا، جمعہ کے دن تختِ ہند پر متمکن ہوا، اس وقت اس کی عمر چالیس برس کی تھی۔ فرہنگِ رشیدی کے مصنف سید عبدالرشید نے قرآنِ مجید کی اس آیتِ مبارکہ سے تاریخ نکالی۔

اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔

ملا شاہ نے "ظل الحق" سے تاریخ نکال کر یہ رباعی کہی:

صحنِ دلِ من چوں گلِ خورشید شگفت ‏ ‏ ‏ حق ظاہر شد و غبار باطل را رُفت
تاریخ جلوس شاہ حق آگہ را ‏ ‏ ‏ "ظل الحق"، گفت الحق ایں را حق گفت

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ تخت نشینی کے موقع پر ایک صاحب نے نو شعر کہے، ان کے ہر مصرعے سے ۱۰۶۸ھ کے عدد نکلتے تھے [۱]

تخت نشینی میں علمائے کرام کا حصّہ

اورنگ زیب عالم گیر بڑا نیک اور متدین شخص تھا، علما و مشائخ کا انتہائی قدردان تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھتا اور ان سے شرعی مسائل دریافت کرتا تھا۔ اس کے برعکس بڑے بھائی داراشکوہ کی دینی اور مذہبی حیثیت نہایت قابلِ اعتراض اور احکامِ اسلام کے منافی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علما و مشائخ نے اہم کردار ادا کیا اور پوری کوشش کی کہ یہی شخص آئندہ ہندوستان کی مسندِ حکومت پر متمکن ہو۔ چنانچہ نواب سعد اللہ خاں نے

---

[۱] ماہ نامہ "المعارف" لاہور۔ مارچ ۱۹۶۸ء، ص ۷

بھی جو شاہ جہان کے بدرجہ غایت معتمد علیہ وزیرِ اعظم، انتہائی فہیم اور بہت بڑے عالمِ دین تھے، کئی دفعہ دربار میں شاہ جہان اور سب امرائے سلطنت کے سامنے اورنگ زیب کی حمایت کی، اس سلسلے میں دارا شکوہ ان پر ناراض بھی ہوا، لیکن انھوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ جب نواب سعد اللہ خاں نے ۲۶ جمادی الاخریٰ ۱۰۶۶ھ کو وفات پائی تو بعض لوگوں نے دارا شکوہ پر یہ الزام بھی عائد کیا تھا کہ اس نے ان کو زہر دے دیا ہے۔

تخت نشینی کے بعد اورنگ زیب نے حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے دونوں صاحب زادوں خواجہ محمد معصوم اور شیخ محمد سعید کو دربارِ شاہی میں تشریف لانے کی دعوت دی تھی، جو انھوں نے قبول فرمالی تھی، اس کے بعد بھی وہ کئی بار اس کے دربار میں گئے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے چھوٹے صاحب زادے شیخ محمد یحییٰ سے بھی ملاقات کی۔ شیخ محمد معصوم کے صاحب زادے شیخ سیف الدین سرہندی سے بھی اورنگ زیب عالم گیر عقیدت رکھتا تھا۔

ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اورنگ زیب کے زمانۂ شاہ زادگی میں خواجہ محمد معصوم کے صاحب زادے خواجہ محمد اشرف اور بھتیجے شیخ سعد الدین اس کے پاس دکن میں مقیم تھے اور جب وہ دارا شکوہ کے مقابلے کو نکلا تو خواجہ محمد اشرف اس کی فوج میں شریک تھے۔ خواجہ محمد معصوم حج کو گئے تو مدینہ منورہ میں اورنگ زیب کی کامیابی کی دعا کی۔ پھر انھوں نے ایک مکتوب میں اس کو جہاد کا مشورہ بھی دیا تھا اور لکھا تھا کہ اللہ کی راہ میں ایک گھڑی کا جہاد، حرمِ مکہ میں حجرِ اسود کے پاس لیلۃ القدر کے قیام سے افضل ہے۔

بہر حال اس بات کے متعدد ثبوت ملتے ہیں کہ خواجہ محمد معصوم نے اورنگ زیب کو جہاد کی تلقین کی اور اس کی مجاہدانہ سرگرمیوں پر خوشی کا اظہار فرمایا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اورنگ زیب ان کا انتہائی معتقد تھا اور اس خاندان کے تمام حضرات سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔

دیارِ ہند کے مشہور محدث شیخ طاہر پٹنی کے پوتے شیخ عبد الوہاب نے فتویٰ جاری کیا تھا کہ شاہ جہان مرض اور ضعف کی وجہ سے امورِ سلطنت انجام دینے سے معذور ہو گیا ہے، لہٰذا دار الحکومت پر اورنگ زیب کی فوج کشی شرعاً جائز ہے۔

قصور کے افغانوں نے شیخ آدم کے خلیفہ شیخ عبد الخالق کی خدمت میں اورنگ زیب

عالم گیر کی کامیابی کے لیے دعا کی درخواست کی۔ پھر یہ بھی منقول ہے کہ اس سے پہلے شیخ آدم بنوری نے اپنی وفات سے قبل اپنے مریدوں کو اورنگ زیب کی حمایت کرنے کی نصیحت فرمائی تھی۔ یہ بھی تذکروں میں مرقوم ہے کہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے اخلاف میں سے شیخ الاسلام خواجہ عابد نے جن کا شمار ماوراء النہر کے جید علما میں ہوتا تھا، اورنگ زیب کی حمایت کی تھی اور وہ دارا کے خلاف لڑائی میں شریک تھے۔

گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اس زمانے کے علما و مشائخ دارا شکوہ کے سخت مخالف تھے اور اس کے مذہبی رجحانات کی شدت سے نکیر کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں وہ اورنگ زیب عالم گیر کے پورے زور اور دلائل سے حامی تھے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر کو تاجِ شہنشاہی پہنانے میں ہندوستانی علما و مشائخ نے بھرپور حصہ لیا[۱۳]

نظم و نسق اور اصلاحات کا نفاذ

اورنگ زیب عالم گیر کا دورِ حکمرانی بڑا طویل ہے۔ اس نے ہندوستان پر پچاس سال دو ماہ اور ستائیس دن حکومت کی۔ مورخینِ ہند نے اس کے پچاس سالہ دورِ حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے پچیس سال ہندوستان کے مختلف علاقوں کی بغاوتیں فرو کرنے اور اصلاحات کے نفاذ میں گزرے۔ آخری پچیس سال دکن کے حالات کی اصلاح اور وہاں کے بگڑے ہوئے نظم و نسق کو بہتر بنانے میں صرف ہوئے[۱۴]

عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس نے ہندوستان کے تمام صوبوں اور علاقوں کے ذمہ دارانہ مناصب پر بہترین صلاحیتوں کے حامل افراد مقرر کیے اور ان کو ہر لحاظ سے مستعد اور چوکس رہنے کی ہدایات جاری کیں۔ دکن کا عہدۂ نظامت شائستہ خاں کے سپرد کیا گیا اور بنگال کی صوبے داری میر جملہ کے حوالے کی گئی۔ ان دونوں کا شمار نہایت قابل اور منتظم امرائے

---

۱۳ تفصیل کے لیے دیکھیے: ماہ نامہ "المعارف" بابت ماہ اگست ۱۹۶۸ء۔ ص ۲۲ تا ۲۹۔ مضمون "اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علما و مشائخ کا کردار" از پروفیسر محمد اسلم۔

۱۴ مقالہ محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر، ص ۷۵ — اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، از پروفیسر شیر محمد گریوال۔

مملکت میں ہوتا تھا اور جن علاقوں کے نظم ونسق پر انھیں مامور کیا گیا، وہ بھی بے حد اہمیت کے علاقے تھے۔

بنگال میں شجاع کا اثر و رسوخ کارفرما تھا، وہاں کا وہ والی رہ چکا تھا اور باپ کے ایامِ مرض میں اس نے وہاں اپنی بادشاہت کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اسی لیے عالم گیر نے میر جملہ کو بنگال کا ناظم مقرر کر کے شجاع کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا، وہ اتنا بہادر جرنیل ثابت ہوا کہ شجاع کو دھکیلتا ہوا کوچ بہار کی ریاست میں داخل ہو گیا۔ وہاں کے راجا نے مغل شاہ زادوں کی باہمی جنگ کے زمانے میں بغاوت کر کے ملک کے مشرقی علاقوں میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ میر جملہ نے اس فتنے کو پوری قوت سے دبایا اور کوچ بہار کا مضبوط قلعہ اس سے چھین لیا۔ اس موقع پر میر جملہ کے نامور ساتھی قاضی سید صادق نے راجا کے محل کی چھت پر چڑھ کر بلند آواز سے اذان دی۔ راجا نے نہایت سراسیمگی کی حالت میں وہاں سے راہِ فرار اختیار کی اور بھوٹان میں جا کر پناہ لی۔ میر جملہ نے پیش قدمی جاری رکھی اور دریائے برہم پتر عبور کر کے آسام کا علاقہ فتح کیا اور اسے پہلی مرتبہ مغل حکومت کا باج گزار بنایا۔ وہ بے حد دلیر اور جفاکش جرنیل تھا اور ہندوستان کی منتہائے حد سے آگے نکل کر چین تک تگ و تاز کرنے کا خواہاں تھا، لیکن موسمی اور جغرافیائی حالات نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ راجا سے وفاداری کا عہد و پیمان لے کر اور بہت سے علاقے فتح کر کے جہاں گیر نگر (ڈھاکہ) کی طرف واپس آ رہا تھا کہ ۳۱ مارچ ۱۶۶۳ء کو خضر پور کے مقام پر وفات پا گیا۔

اس کے بعد بنگال کا ناظم شائستہ خاں کو مقرر کیا گیا۔ یہ بھی بڑا لائق منتظم اور مشہور جنگ جو تھا۔ اس نے بہت سے باغیوں اور سرکشوں کا مقابلہ کیا اور ان کی اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے زمانے میں مخالفینِ حکومت سے کئی دریائی معرکے بھی ہوئے اور یہ سب میں کامیاب رہا۔ چاٹگانگ کے مضبوط و مستحکم قلعوں پر بھی اس کے دورِ نظامت میں مغل شہنشاہیت کے جھنڈے لہرائے گئے۔ اس نے بنگال کی شورشوں کو ختم کرنے اور انتظامی امور کو درست کرنے کے علاوہ بہت بڑا کام یہ کیا کہ اس علاقے میں متعدد مسجدیں تعمیر کرائیں، دینی مدارس قائم کیے، پل بنوائے، آمد و رفت کے لیے شاہ راہوں کا انتظام کیا اور

مختلف مقامات پر سرائیں تعمیر کرائیں۔ پھر اُس زمانے میں عام استعمال کی چیزوں کے نرخ بڑھ رہے تھے، ان کی قیمتوں پر کنٹرول کیا۔ غرض شائستہ خاں کا دورِ نظامت اہلِ بنگال کے لیے خوش حالی، سکون اور ارزانی کا دور تھا۔

اسی زمانے میں ملک کے دوسرے سرے پر علاقہ کشمیر کے ناظم حکومت نے مشرق کی طرف فوج کشی کی اور لداخ، تبت اور بلتستان کے سرحدی علاقے زیرِ نگیں کیے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وادیٔ کشمیر کی بیرونی حدیں پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گئیں۔

بعض قبائل کی شورشوں کا انسداد

عالم گیر امن پسند بادشاہ تھا اور پورے ملک کو دارالامن بنا دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ دور دراز علاقوں پر بھی وہ پوری نظر رکھتا تھا۔ کسی حصّے میں کوئی شورش یا گڑبڑ پیدا ہوتی تو فوراً اس کو دبا دیتا۔ پنجاب اور کابل کے درمیانی علاقوں میں کچھ ایسے قبائل آباد تھے، جو بعض اوقات بدنظمی پھیلانے کی سعی کرتے، لیکن عالم گیر اس کے انسداد کے لیے مؤثر قدم اٹھاتا۔ چنانچہ ۱۶۶۷ء میں یوسف زئی اور ۱۶۷۲ء میں آفریدی قبائل کے لوگوں نے انتظامی امور میں خلل انداز ہونے کی کوشش کی تو عالم گیر نے بلا تامل اس اہم مسئلے کو شائستۂ التفات ٹھہرایا اور مقامی انتظامیہ کو حکم دیا کہ ہر ممکن طریقے سے اس شورش کو ختم کر دیا جائے، لیکن جب فتنہ زیادہ پھیل گیا اور مقامی حکومت بے بس ہو گئی تو ایک نامور فوجی جرنیل امین خاں کی سرکردگی میں فوج کو حرکت میں لانے کے احکام نافذ کیے۔ معاملہ چوں کہ زیادہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا تھا، اس لیے خود عالم گیر نے بھی پنجاب کا عزم کیا اور حسن ابدال میں آکر خیمہ زن ہوا، وہ ڈیڑھ سال وہاں مقیم رہا۔ اس اثنا میں مختلف مقامات پر فوجی چوکیاں قائم کیں اور فتنہ و فساد کے دروازے بند کر دیے۔

سکھ اور ان کے ہنگامے

ابتدا میں سکھ ملکی سیاسیات سے بے تعلق رہے تھے اور اپنے خاص طریقے کے مطابق صرف مذہبی امور کی بجا آوری میں مشغول رہتے تھے، لیکن ان کے پانچویں گرو ارجن دیو نے جن کی مذہبی رہنمائی کا دور ۱۵۸۱ء سے ۱۶۰۶ء تک کے عرصے کو محیط ہے، سیاست میں دخل اندازی کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۶۰۶ء میں جہاں گیر کے مقابلے میں اس کے بیٹے شاہ زادہ خسرو نے علم بغاوت بلند کیا تو

گرو ارجن دیو نے خسرو کی حمایت کی تھی، جس کی وجہ سے ۱۶۰۶ء ہی میں جہاں گیر نے ان کو قتل کرا دیا تھا۔ اس کے بعد جب دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان تخت نشینی کے مسئلے پر لڑائی ہوئی تو وہ سکھوں کے ساتویں گرو ہر رائے کا زمانہ تھا۔ گرو ہر رائے اس لڑائی میں دارا شکوہ کے حامی تھے، لیکن اورنگ زیب چوں کہ وسیع القلب بادشاہ تھا، لہٰذا اس نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی اور درگزر سے کام لیا۔ پھر آٹھویں گرو ہر کشن کے انتخاب کے مسئلے پر جھگڑا ہوا تو اس میں بھی اورنگ زیب نے کسی قسم کا حصہ نہیں لیا۔ لیکن ۱۶۷۴ء میں جب نواں گرو تیغ بہادر سکھوں کی مذہبی رہنمائی کی گدی پر بیٹھا تو اس نے سخت باغیانہ طرزِ عمل اختیار کیا اور پنجاب اور کشمیر کے علاقوں میں وسیع پیمانے پر لوٹ مار اور غارت گری شروع کر دی۔ چنانچہ ۱۶۷۵ء میں اسے بغاوت کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد دسویں گرو جنھیں آخری گرو بھی کہا جاتا ہے، گرو گوبند سنگھ کی رہنمائی کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اپنے پیروانِ مذہب کو مغل حکومت کے خلاف خوب مشتعل کیا اور سکھ قوم کو "خالصہ" کے نام سے موسوم کر کے ایک باقاعدہ فوجی تنظیم کی شکل دے دی۔ مختلف مقامات پر کئی مضبوط قلعے تعمیر کرائے اور اسّی ہزار افراد پر مشتمل ایک بہت بڑی فوجی جمعیت تیار کر لی۔ پھر ان کی اشتعال انگیز سرگرمیوں کا سلسلہ اس قدر وسعت اور خطرناک صورت اختیار کر گیا کہ حکومت کو امن قائم رکھنے کے لیے مجبوراً کوئی اہم قدم اٹھانے کے مسئلے پر غور کرنا پڑا۔ نتیجتاً فوج حرکت میں آئی اور میدانِ مقابلہ میں سکھوں کو شکستِ فاش ہوئی، گرو گوبند سنگھ کے دو بیٹے گرفتار ہو کر قتل ہوئے، خود گرو نے حکومت کی وفاداری کا عہد کیا اور بادشاہ نے احترام کے ساتھ انھیں دکن آنے کی دعوت دی۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ عالم گیر کا انتقال ہو گیا۔ عالم گیر کے جانشین بہادر شاہ نے بھی گرو صاحب کا احترام قائم رکھا اور فوج میں عہدے دار مقرر کیا، لیکن ۱۷۰۸ء میں کسی پٹھان نے ذاتی عداوت کی بنا پر انھیں قتل کر دیا۔

جسونت سنگھ کی بے وفائی اور عالم گیر کا عفو و کرم

جودھ پور کے راجا جسونت سنگھ کا اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے۔ یہ اورنگ زیب عالم گیر کا شدید مخالف اور دارا شکوہ کا سخت حامی تھا۔ یہ وہی جسونت سنگھ ہے، جو دھرمٹ

کی سخت لڑائی میں اورنگ زیب سے شکست کھا کر بھاگ گیا تھا اور گھر گیا تو بیوی نے اپنے قریب آنے سے سختی سے روک دیا تھا۔ یہ واقعہ خافی خاں نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور راجپوت عورتوں کے مزاج کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ نہایت غیور اور باحمیّت ہوتی ہیں۔ میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگ جانے والے مرد کو وہ انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور اس کے ساتھ قربت و صحبت سے انکار کر دیتی ہیں۔ چنانچہ جسونت سنگھ جب میدانِ جنگ سے فرار ہو کر گھر گیا تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔

زن کلاں او کہ دختر راجہ چتر سال بود شوہر را مطعون ساختہ، ترک ہم خوابی با او نمود و اکثر در وقت کلمہ و کلام زبان بر طعن و کنایہائے ملامت انجام آشنا می ساخت۔[۱۵]

یعنی اس کی بڑی بیوی نے جو راجہ چتر سال کی بیٹی تھی، شوہر کو مطعون ٹھہرایا اور اس سے ہم بستری کا سلسلہ ختم کر دیا۔ وہ جب اس سے بات کرتی تو اشاروں کنایوں سے اسے ہدفِ ملامت ٹھہراتی۔

ہندوستان کا بادشاہ بننے کے بعد اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کو نہ صرف کوئی سرزنش نہیں بلکہ ہمیشہ بہترین سلوک کا مستحق سمجھا اور ملک کے اہم مناصب پر مامور کیا۔ اس نے کئی دفعہ بے وفائی کی اور بادشاہ کو دھوکا دیا، لیکن بلند اخلاق بادشاہ نے ہر بار اس کی تقصیر معاف کی۔ آخر میں اس کو کابل کا والی مقرر کیا جو خالص مسلمان آبادی کا علاقہ تھا۔ وہ کئی سال کابل میں اہم عہدے پر فائز رہا اور ۲۲ شوال ۱۰۸۹ھ (۱۰ دسمبر ۱۶۷۸ء) کو جمرود کے قریب فوت ہوا۔

جسونت سنگھ سے اورنگ زیب نے جو حسنِ سلوک روا رکھا، وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس سے بادشاہ کے کردار کی بلندی اور اس کے حلم کی پوری تصویر واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس کا دل تعصب سے پاک اور بغض و عناد سے خالی تھا۔ رحم دلی، عفو و کرم اور مخالف سے درگزر کرنا اس کی فطرت میں داخل تھا۔

---

۱۵ منتخب اللباب، حصہ دوم، ص ۴۳

دکن کی فتح اور مرہٹوں کی سرکوبی

اورنگ زیب عالم گیر کو دکن کے معاملات سے بے حد دلچسپی تھی، زمانہ شاہ زادگی میں بھی وہ کئی سال تک اس علاقے کا والی رہ چکا تھا اور معرکۂ تخت نشینی کے موقع پر بھی دکن ہی سے روانہ ہوا تھا — زمام حکومت ہاتھ میں لی تو زندگی کے آخری پچیس سال بھی دکن کی فتح اور اس میں اصلاحات کے نفاذ میں گزارے۔

دکن کے حالات، وہاں مرہٹوں کی آمد، ان کی دست درازیاں مغل حکومت سے تصادم، عہد شکنی، دربار مغلیہ میں معذرت خواہانہ انداز، پھر ان سے مغل حکمرانوں کا نرم رویہ وغیرہ۔ یہ واقعات تاریخ کے ایک طالب علم کے لیے نہایت دلچسپ ہیں اور منتخب اللباب، مآثر عالم گیری، مآثر الامرا، خزانۂ عامرہ اور سیر المتاخرین وغیرہ تمام کتبِ تاریخ میں تفصیل سے مرقوم ہیں، لیکن اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اس موقع پر ہم اُن تمام امور سے صرف نظر کر کے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مرہٹوں نے دکن کی مسلمان ریاستوں میں توسل پیدا کر کے اور ملازمتیں اختیار کر کے بہت مؤثر اور مضبوط طاقت فراہم کر لی تھی اور باقاعدہ ایک فوجی تنظیم قائم کر لی تھی۔ مختلف مقامات پر فوجی اور عسکری نوعیت کے متعدد قلعے بھی تعمیر کر لیے تھے، جن میں وسیع پیمانے پر جنگی اسلحہ جمع تھا۔ وہ مغل حکومت کے لیے مستقل خطرہ بن گئے تھے، ان کی دست درازیاں یہاں تک پہنچ گئی تھیں کہ مغلوں کے علاقوں کو بھی تاراج کرنے لگے تھے۔ لوٹ مار، قتل و غارت اور رہزنی ان کا پیشہ بن گیا تھا اور دکن کی کمزور ریاستیں ان کے سامنے بے بس و مجبور ہو گئی تھیں، بلکہ مغل حکومت کے خلاف ان کی امداد کرتی تھیں۔ یہ صورتِ حال امنِ عامہ کے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہو رہی تھی۔ بلا امتیازِ مذہب و ملت ملک کے ہندو اور مسلمان سب ان سے پریشان تھے اور وہ سب کو اپنا نشانۂ ستم بناتے تھے۔

ظاہر ہے اورنگ زیب عالم گیر جیسا عادل و منصف اور رحم دل و منتظم بادشاہ اس تکلیف دہ صورتِ حال کو ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا، چنانچہ اسے مجبوراً فوجی کارروائی کرنا پڑی اور مرہٹوں کے استیصال کے ساتھ ساتھ دکن کی ریاستوں کا بھی خاتمہ کرنا پڑا، کیوں کہ ایک کا سلسلہ دوسرے سے وابستہ تھا اور دونوں کی طاقت کو ختم کرنا عین مصلحتِ ملکی تھا۔

مرہٹوں کی تاریخ کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کا ابتدائی تعلق راجپوتانے سے تھا، بعد میں ان کے آباؤ اجداد میں سے بعض لوگ دکن کی ریاست میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اس خاندان کا ایک شخص مالوجی تھا۔ یہ شخص مسلمان اصحاب رشد و ہدایت سے بہت عقیدت رکھتا تھا اور شاہ شریف کا مرید تھا جو احمد نگر میں مدفون ہیں۔ مالوجی کے دو بیٹے تھے، اس نے شاہ شریف سے تعلقِ ارادت کی بنا پر ان کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھے جو درحقیقت مسلمانوں کے نام ہیں۔ یہی شاہ جی آگے چل کر ساہوجی کے لقب سے مشہور ہوا اور یہی وہ ساہوجی ہے جو سیواجی مرہٹہ کا باپ تھا۔ مغل حکمرانوں کی تاریخِ حرب وضرب کے ضمن میں ساہوجی مرہٹہ اور سیواجی مرہٹہ کے نام بار بار آتے ہیں۔

سیواجی مرہٹہ کے بارے میں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی حیثیت ایک ڈاکو اور لٹیرے کی تھی۔ کمزور علاقوں میں چھاپے مارنا اور وہاں کے باشندوں کو ہراساں کر کے زیر کرنا اس کا پیشہ تھا۔ ریاست بیجاپور کے حکمران عادل شاہ کے زمانے میں اس کی تخریبی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں، کیوں کہ عادل شاہ کی بیماری کی وجہ سے پوری ریاست میں ابتری اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی اور رشوت خور اہل کاروں نے سیواجی کو بہت سی جاگیروں کی جعلی سندیں لکھ کر دے دی تھیں۔ اس نے کوکن کے تمام علاقے پر تصرف حاصل کر لیا تھا جو بیجاپور کی حکومت میں داخل تھا۔

عالم گیر اپنے دور شاہ زادگی میں بھی جب وہ دکن کا والی تھا، اس افراتفری کو ختم اور اس علاقے کو فتح کرنا چاہتا تھا، تاکہ ابتری اور لوٹ مار کا قطعی طور سے سدّباب ہو جائے، لیکن دارالخلافہ آگرہ میں حالات نے کچھ ایسی انگڑائی لی کہ اسے مجبوراً اپنے دکن کے مرکزی مقام اورنگ آباد واپس آنا پڑا۔

اس کے بعد ملک کے سیاسی معاملات میں حیرت ناک تغیر کی لہر اٹھی۔ شاہ جہان کو شدتِ مرض نے گھیر لیا اور وہ مسلوب الاختیار ہو گیا، دارا شکوہ نے بھائیوں کے استیصال اور سلطنت پر متصرف ہونے کا فیصلہ کر لیا، مراد نے صوبہ گجرات میں اپنے نام کا خطبہ و سکّہ جاری کر لیا۔ شجاع نے جو بنگال کے منصب ولایت پر متعین تھا، وہیں اپنی بادشاہت کا اعلان جاری کر دیا اور پھر حکومت پر قبضہ

کرنے کی غرض سے دارالسلطنت آگرہ کی طرف بڑھنے لگا۔ سیواجی کے لیے اب میدان صاف تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کو کھل کھیلنے کے لیے اس سے زیادہ کوئی موقع نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ہر طرف ہاتھ بڑھانے اور نظر دوڑانے لگا۔ بہت سے قلعے بھی تعمیر کرائے اور جزیروں میں رسائی حاصل کر کے بحری قوت کے سامان فراہم کیے۔ اس نے مغل شاہ زادوں کی باہمی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر مرہٹوں کی ایک زبردست فوج تیار کر لی اور رفتہ رفتہ ریاست بیجاپور کے متعدد اضلاع پر متصرف ہوگیا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، مغلیہ حدودِ حکومت میں بھی دستِ تصرف دراز کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ستم رانیاں یہاں تک بڑھیں کہ سورت اور اس کے نواح کی بندرگاہوں پر قبضہ کر کے حجاج کے قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا[16]۔ یہ جرأت نسل تیموری کے شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے لیے قطعاً ناقابل برداشت تھی، چنانچہ عالم گیر نے مملکتِ ہند پر قبضہ کرنے کے بعد سیواجی کے ساتھ وہی سلوک کیا جس کا وہ مستحق تھا۔

سیواجی کے بارے میں تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ جس طرح وہ غارت گری اور قتل و خوں ریزی میں بہت بے باک تھا، اسی طرح پرلے درجے کا مکار، فریبی، عہد شکن اور دغا باز بھی تھا، پھر انتہائی چاپلوس اور بزدل بھی تھا۔ سیوا کی بزدلی اور مکاری کی مثالیں دیتے ہوئے منتخب اللباب اور مآثر عالم گیری کے مصنفوں نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جب اس نے بیجاپور کے اکثر اضلاع کو قبضے میں کر لیا تو اس کے حکمران علی عادل شاہ نے افضل خاں سپہ سالار کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ افضل خاں نے سیواجی کا محاصرہ کر لیا۔ سیوا نے عاجز آکر مکر و فریب سے کام لیا، اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور عفوِ تقصیر کی درخواست کی۔ ساتھ ہی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں افضل خاں سے ملاقات کے بعد اس کے ہم رکاب ہو کر علی عادل شاہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں تاکہ براہِ راست اپنی معروضات پیش کر سکوں اور معافی مانگ سکوں۔ شرط یہ قرار پائی کہ ملاقات کے وقت کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہوگا اور دونوں خالی ہاتھ ہوں گے۔ چنانچہ افضل خاں عہد کے مطابق خالی دست گیا، لیکن سیوا آستین میں چھرا

---

[16] منتخب اللباب، ج ۲، ص ۱۱۵

چھپائے ہوئے تھا، بغل گیر ہوتے ہی اس نے افضل خاں کا کام تمام کر دیا[۱۷]

فریب دہی اور عہد شکنی سیوا جی کے کردار کا لازمی جزو بن گئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ مغلیہ سلطنت کا کوئی جرنیل اور ذمہ دار رکن اس کو لائق اعتماد نہیں گردانتا تھا۔ جب تیموری حدود مملکت میں سیوا جی کی دست درازیاں حد سے متجاوز ہو گئیں تو عالمگیر نے اس کی روک تھام کے لیے مہاراجہ جے سنگھ کو جو ریاست جے پور کا راجا اور مغل حکومت میں سپہ سالاری کے منصب پر فائز تھا، فوج دے کر بھیجا۔ فوج کا ہراول دلیر خاں کو مقرر کیا۔ جے سنگھ بڑا زیرک جرنیل تھا۔ وہ سیوا کی سرکوبی کے لیے پونہ میں داخل ہوا اور ہر جانب فوجیں پھیلا دیں۔ دلیر خاں نے صرف سات ہزار فوج کے ساتھ پانچ مہینے کی مدت میں سیوا کے تمام مقبوضہ علاقے پامال کر ڈالے۔ سیوا کا دارالسلطنت راج گڑھ تھا۔ اس کے ننھیال بھی اسی نواح میں رہتے تھے۔ دلیر خاں کی فوج نے جب اُدھر کا رُخ کیا اور آگے بڑھنے لگی تو سیوا اس تصور سے گھبرا اٹھا کہ یہ مقامات بھی فتح ہو گئے تو تمام اہل و عیال یا تو قتل ہو جائیں گے یا قیدی بنا لیے جائیں گے۔ چنانچہ صلح و اطاعت کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کیا۔

اسی اثنا میں جب سیوا جی کے ایک قلعے کا محاصرہ کر کے اس کا ایک برج توپوں سے اڑا دیا گیا تو دلیر خاں نے فوج کو قلعے کے دوسرے برج پر چڑھا دیا اور حکم دیا کہ اسے مسمار کر دیا جائے۔ اس قلعے میں سیوا کے متعدد اہلِ خانہ اور رشتے دار بھی محصور تھے۔ اس نے جب دیکھا کہ تھوڑی دیر میں قلعہ فتح ہونے اور حریف کے قبضے میں آنے کو ہے تو مجبور ہو کر صلح کی التجا کی۔ لیکن راجا جے سنگھ کو سیوا کی مکاریوں کا علم تھا اور اس کی باتوں پر اعتماد نہ تھا، اس نے حکم دیا کہ حملہ تیز کر دیا جائے اور یورش کے سامان مزید بڑھا دیے جائیں۔ اتنے میں خبر پہنچی کہ سیوا خالی ہاتھ قلعے سے نکل کر آ رہا ہے۔ اس کے قابلِ اعتماد چند برہمن بھی ساتھ ہیں۔ راجا جے سنگھ کو جب یقین ہو گیا کہ سیوا عجز و زاری کی حالت میں آ رہا ہے تو اجازت دے دی، اور جن لوگوں کو اس کے استقبال کے لیے بھیجا، ان کے ساتھ چند مسلح راجپوت بھیجے اور

---

[۱۷] منتخب اللباب، ج ۲، ص ۱۸۲

سیوا سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر خلوصِ دل کے ساتھ آتا ہے تو بے ہتھیار آئے ورنہ واپس چلا جائے۔ سیوا خالی ہاتھ اور بے ہتھیار آیا۔ راجا جے سنگھ کے پاس گیا اور نہایت سماجت کی اور عجز و انکساری کے ساتھ وفاداری اور عہد پر قائم رہنے کی قسمیں کھائیں۔ یہاں تک کہ سیوا نے ہاتھ جوڑ کر کہا:

بہ طریق بندہائے ذلیل مجرم رو بدیں درگاہ آوردہ ام، خواہی بہ بخش و خواہی بہ کش۔[۵۱]

یعنی نہایت ذلت کے ساتھ ادنیٰ گناہ گار غلاموں کی طرح حاضر ہوں۔ اب آپ کو اختیار ہے، ماریے یا چھوڑ دیجیے۔

جے سنگھ نے اُٹھ کر گلے لگایا اور وفاداری کا اطمینان ہو جانے کے بعد دلیر خاں کو قلعے کا محاصرہ اُٹھانے کا حکم دیا۔ قلعے کا پھاٹک کھلا تو سات ہزار مرد اور عورتیں باہر آئے جنھیں امان دی گئی۔ دلیر خاں کی طرف سے تلوار، کچھ اسلحہ اور دو عربی گھوڑے مع سازِ طلائی کے سیوا کو عنایت کیے گئے۔ پھر جب دلیر خاں نے سیوا کا ہاتھ جے سنگھ کے ہاتھ میں دیا تو جے سنگھ نے خلعت، گھوڑا اور ہاتھی عطا کیا۔ دلیر خاں نے اپنے ہاتھ سے سیوا کی کمر میں تلوار باندھی، لیکن اس نے تھوڑی دیر کے بعد تلوار کھول کر رکھ دی اور کہا کہ میں بغیر ہتھیار کے خدمت کروں گا۔ بڑے بڑے قلعے بھی مغل حکومت کو پیش کیے۔

شاہی دربار کو جے سنگھ نے سیوا کی اطاعت گزاری کی اطلاع دی تو وہاں سے فرمان اور خلعت بھیجا گیا۔ سیوا کو خلعت اور فرمان قبول کرنے کے آداب سکھائے گئے۔ چنانچہ وہ فرمان کے استقبال کے لیے تین میل تک پاپیادہ گیا اور خلعت کے سامنے آداب بجالایا۔ سیواجی کے لڑکے اور دیگر رشتے داروں کو بھی عالم گیر نے مختلف مواقع پر بہت سے اونچے خطابات و اعزازات سے نوازا اور حکومت کے بلند منصب عطا کیے، مگر یہ سب لوگ مسلسل بے وفائی کرتے رہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر نے جب جے سنگھ کو

---

[۵۱] منتخب اللباب، ج ۲، ص ۱۸۲

سیواجی کے استیصال کے لیے بھیجا تو بیجاپور کے حکمران کو بھی سیوا کے مقابلے کے لیے فوجیں بھیجنے کی درخواست کی تھی، لیکن حاکم بیجاپور اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اور مغلوں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے خفیہ طور پر سیواجی کی حمایت کرتا رہا، اسی طرح حیدرآباد کے حکمران نے بھی یہی وتیرہ اختیار کیا۔ گولکنڈہ کے حکمرانوں نے بھی شاہی علاقوں پر غارت گری کرنے کے لیے مرہٹوں کی پوری اعانت کی۔

بہرحال نہ تو مرہٹے بار بار وفاداری کی یقین دہانی کے باوجود دغابازی اور باغیانہ سرگرمیوں سے باز آئے اور نہ دکن کی ریاستوں کے حکمرانوں نے مخالفانہ رویہ ترک کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ عالم گیر کو مجبوراً دونوں پر یلغار کرنا پڑی۔

مرہٹوں کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہے کہ شاہ جہان کے زمانے میں انھوں نے پوری قوت حاصل کر لی تھی، دکن سے مدراس تک وسیع علاقے ان کے تسلط میں چلے گئے تھے، سیکڑوں مضبوط اور سر بفلک قلعوں پر ان کا قبضہ تھا۔ یہ ایک جدید قوم کی شکل میں اُبھر رہے تھے اور ان کا یہ عین عروج شباب کا زمانہ تھا، اسی حالت میں عالم گیر نے ان سے مقابلہ کیا۔ نتیجہ کیا ہوا یہ کہ عالم گیر کی زندگی ہی میں سیوا مر گیا۔ پھر اس کا ایک بیٹا سنبھا مارا گیا، دوسرا بیٹا رام راج آوارگی اور صحرانوردی کی نذر ہوا۔ مرہٹوں کے مشہور سپہ سالار سنتا کا سر کٹ کر دربار میں پہنچا۔ غرض سب علم برداران بغاوت ایک ایک کر کے مٹا دیے گئے، تمام قلعوں پر عالم گیر نے قبضہ کر لیا اور علامہ شبلی نعمانی کے الفاظ میں "دکن سے لیکر مدراس تک سناٹا چھا گیا"۔ جس زمانے میں مرہٹوں کا استیصال ہو رہا تھا اور دکن کی ریاستوں کو مغل حکومت کے زیر تسلّط لانے کی مہم زوروں پر تھی، عالم گیر خود اس زمانے میں دکن میں بیٹھا تمام معرکوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کی عمر بیاسی برس کی ہو چکی تھی، تاہم اس بوڑھے مگر جوان ہمت بادشاہ نے بعض نہایت مشکل معرکوں کی خود کمان کی اور تمام قلعے ایک ایک کر کے فتح کر لیے۔ ہندوستان کے وسیع ملک میں کوئی اس کا حریف نہ تھا اور کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔

سرمد کا قتل

اورنگ زیب کے ابتدائے عہدِ سلطنت کا ایک اہم واقعہ سرمد کے قتل کا ہے۔ سرمد اصلاً یہودی

تھا اور یہودیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا، جو "ربیین" کہلاتے ہیں، بعد میں مسلمان ہو گیا تھا اور ایران کے جلیل القدر فضلا سے علم حاصل کیا تھا۔ وہ تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا اور سندھ کے راستے ٹھٹھے سے ہوتا ہوا دہلی پہنچا۔ سرمد اچھا شاعر بھی تھا، اصحابِ تصوّف سے وہ بالخصوص تعلق رکھتا تھا۔ دہلی میں داراشکوہ سے اس کے مراسم پیدا ہوئے اور ایک صوفی اور ولی کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس زمانے میں شاہجہان تختِ حکومت پر جلوہ افروز تھا۔ سرمد کا شہرۂ ولایت بادشاہ تک پہنچا تو اس نے عنایت خاں آشنا کو سرمد سے ملنے اور اس کے کشف و کرامات کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ عنایت خاں آشنا نے وہاں بجز برہنگی کے کچھ نہ پایا اور واپس آکر سرمد کے کشف پر طنز کرتے ہوئے بادشاہ کے حضور یہ شعر پڑھا:

بر سرمدِ برہنہ کرامات تہمت است کشفے کہ ظاہر است ازو کشفِ عورت است

۱۶۵۸ء میں عالم گیر، اورنگِ ہند پر متمکن ہوا اور ملک میں شرعی قوانین و احکام کی تنفیذ کا سلسلہ شروع کیا تو اس کے نزدیک سرمد کا حالتِ عریانی میں رہنا خلافِ شرع فعل اور قابلِ سزا جرم تھا۔ شہنشاہ نے ملا عبد القوی کو سرمد کے پاس بھیجا کہ اسے کپڑے پہننے کی تاکید کی جائے۔ ملا ممدوح نے سرمد سے پوچھا کہ "عریاں کیوں رہتے ہو؟" سرمد نے بے ساختہ جواب دیا "شیطان قوی است" اور ساتھ ہی ایک رباعی پڑھی:

ہو سکتا ہے ملا عبد القوی کو اپنے نام کی مناسبت سے "شیطان قوی است" کے الفاظ ناگوار گزرے ہوں۔

عریانی و برہنگی کے علاوہ سرمد نے ایک رباعی میں معراج سے بھی انکار کیا ہے۔ وہ اور بھی بہت سے خلافِ شرع امور کا مرتکب تھا اور اس کا برملا اعلان و اعتراف کرتا تھا، لیکن اورنگ زیب نے جو کہ طبیعِ محتاط رکھتا تھا، شاید ان باتوں کو سزا کے لیے کافی نہ سمجھا۔ اس نے علما کو سرمد کے پاس بھیجا کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھے۔ علما کے سامنے سرمد نے فقط لا الٰہ پڑھا، اس سے آگے کچھ نہ کہا۔ علما نے اعتراض کیا اور کلمہ کے اس جزوِ اوّل کو اللہ کے وجود کی نفی کا اعلان قرار دیا۔ سرمد نے کہا، ابھی تو میں حالتِ نفی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ اثبات تک نہیں پہنچا، وہاں پہنچوں گا تو الا اللہ بھی کہوں گا۔

اس پر علما نے فتویٰ دیا کہ فقط لا الٰہ کہنا کفر ہے۔ اگر سرمد توبہ کرے تو بہتر ورنہ واجب القتل ہے۔ سرمد اپنی بات پر قائم رہا اور توبہ نہ کی۔ چنانچہ دوسرے دن قتل کرنے کے لیے اس کو دہلی کی جامع مسجد کے سامنے لایا گیا۔ کہتے ہیں اس وقت وہ نہایت خوش و خرم تھا۔ جلاد آیا تو سرمد اسے دیکھ کر مسکرایا اور کہا:

فدائے تو شوم بیا بیا کہ بہر صورتے کہ می آئی، من ترا خوب می شناسم۔

یہ کہہ کر مندرجہ ذیل شعر پڑھا اور تلوار کے نیچے گردن رکھ دی۔

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم　　دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

شیخ محمد اکرام، سرخوش کے تذکرے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سرخوش بیان کرتا ہے کہ ایک دن میں اور ناصر علی سرہندی اور مرزا عبدالقادر بیدل دہلی کی جامع مسجد میں حوض کے کنارے بیٹھے شعر خوانی کر رہے تھے کہ ادھر سے سرمد کا گزر ہوا، ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور یہ شعر پڑھا:

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد　　من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

اس کے جلد ہی بعد وہ قتل ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ اس کے قتل کے اصل اسباب کیا تھے، صرف مذہبی تھے یا اس کی تہ میں سیاست بھی کارفرما تھی؟ بلاشبہ عالم گیر خلافِ مذہب باتوں کو پسند نہ کرتا تھا اور ملک کو منافیِ اسلام امور سے پاک کر دینا چاہتا تھا، لیکن ہر دور میں سرمد جیسے بے شمار مجذوب اور کتنے ہی فاتر العقل لوگ گلی کوچوں میں ننگ دھڑنگ گھومتے نظر آتے ہیں اور کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں۔ اسلام کا انکار کرنے والوں اور خدا و رسول کی نافرمانی کرنے والوں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ یقیناً اورنگ زیب کے زمانے میں بھی ایسے لوگ ہوں گے، اتنے بڑے ملک میں ایک سرمد ہی تو نہیں ہوگا، جس کی خلافِ اسلام باتوں سے بادشاہ کو اتنا غصہ آیا کہ اسے قتل کر ڈالا۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دارا شکوہ کی اس سے مصاحبت تھی اور ان کی مجلس میں کئی اور صوفی اور مجذوب بھی آتے جاتے ہوں گے، جو عالم گیر کے خلاف باتیں کرتے ہوں گے۔

مآثر الامرا کے مصنف کا کہنا ہے کہ اگر سچ پوچھا جائے تو قتل کا اصل سبب دارا شکوہ کی مصاحبت تھی۔

شیخ محمد اکرام مرحوم ایک اور تذکرہ نگار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

گویند کہ او بہ داراشکوہ نیز سرّے داشت و اکثر اوقات نیز بہ ماتم عالم گیر مشغوف بود، لہٰذا بہ قتل رسید۔ و اللہ اعلم بحقیقۃ حال[۱۹]

یعنی کہا جاتا ہے کہ سرمد سے داراشکوہ کے بھی تعلقات تھے، دونوں راز کی باتیں کرتے اور عالم گیر کے ماتم میں مشغول رہتے تھے، اس لیے وہ قتل ہوا۔ اصل حقیقت کا علم اللہ ہی کو ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے سرمد کے حالات میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، ان کا خیال بھی یہی ہے کہ سرمد کے قتل کے اصل اسباب سیاسی تھے۔ مولانا فرماتے ہیں:

ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خون ریزیاں جو پولیٹکل اسباب سے ہوئی ہیں، انھیں مذہب کی چادر اڑھا کر چھپایا گیا ہے۔

بہرحال اصل حقیقت تو اللہ کو معلوم ہے، ہمارے سامنے دونوں باتیں ہیں، یہ بھی کہ عالم گیر کی غیرتِ دینی اور حمیّتِ مذہبی سرمد کی خلافِ شریعت باتوں کو برداشت نہ کر سکی اور اسے قتل کرا دیا۔ یہ بھی کہ سرمد اور داراشکوہ کے باہمی تعلقات بہت گہرے تھے، جس سے فتنہ و فساد کے پھیلنے اور عالم گیر کے خلاف ایک محاذ قائم ہونے کا خطرہ تھا، اتفاق سے اس کی مذہبی حالت بھی قابلِ اعتراض اور لائق عقوبت تھی، لہٰذا اسے قتل کر دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اوصاف و کمالات کی ایک جھلک

تیمور کے جانشینوں میں اورنگ زیب عالم گیر وہ حکمران ہے جس کے گوناگوں کمالات کی فہرست انتہائی دراز ہے۔ اس کی زندگی کے شب و روز بے شمار خصوصیات سے مملو ہیں اور کتنے ہی حیرت انگیز واقعات ہیں جو قطار باندھے سامنے کھڑے ہیں اور ہر واقعہ زیبِ قرطاس بننے کے لیے بے قرار ہے۔ قلم حیران ہے کہ کس کا انتخاب کرے اور کس کو چھوڑے۔ عالم گیر کی طویل حیاتِ مستعار کے تمام لیل و نہار کو شدید آزمائشوں اور بوقلموں امتحانوں کی آماج گاہ

---

[۱۹] رودِ کوثر، ص ۴۳۷

سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس مردِ آہن کی بے پناہ ہمت کی داد دیجیے کہ ہر امتحان میں پورا اترتا اور ہر آزمائش میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس نے مرہٹوں کو زیر کیا، دکن کی تسخیر کی، آسام پر علم اقتدار لہرایا، تبت کی انتہائی سرحدوں پر تسلط جمایا اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام باغی طاقتوں کو بیخ و بن سے ہلا ڈالا۔ اس کے عہدِ اقتدار میں ہندوستان کی سلطنتِ مغلیہ جن فتوحاتِ ملکی اور وسعتِ حدود سے آشنا ہوئی، اس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں ناپید ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر کے اوصاف و کمالات اور شجاعت و بہادری کے کئی واقعات گزشتہ صفحات میں درج ہو چکے ہیں، لیکن پھر بھی تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور بہت سی باتیں اُبھر اُبھر کر سامنے آ رہی ہیں جو معرضِ تحریر میں آنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ہر چند کہ اختصار سے کام لیا جا رہا ہے اور ہر مقام پر عنانِ قلم کھینچ کھینچ کر چلنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاہم بعض واقعات بیان کرنا ضروری ہیں۔ ایک جھلک ملاحظہ ہو:

۱۔ اورنگ زیب کی بہادری اور قابلیت کی ایک بہت بڑی امتحان گاہ جنگ تخت نشینی کے موقع پر ساموگڑھ کا میدان تھا۔ دارا شکوہ اور عالم گیر کی فوجیں نہایت شدت سے لڑ رہی تھیں اور گھمسان کا رن پڑا تھا۔ دارا کے ہاتھی پر حملہ ہوا تو وہ ہاتھی سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ فوج نے سمجھا کہ شاہ زادہ مارا گیا اور وہ تتر بتر ہو گئی۔ بعض مؤرخین کا فیصلہ ہے کہ دارا کی یہی غلطی اس کی ہزیمت کا باعث بنی۔ عالم گیر کو بھی جب وہ کھجوہ کے مقام پر شجاع سے نبرد آزما تھا، یہی صورتِ حال پیش آئی۔ عالم گیر ہاتھی پر بیٹھا شجاع کے مقابلے میں دادِ شجاعت دے رہا تھا کہ ناگہاں اس کے ہاتھی پر ایک مست اور طاقت ور جنگی ہاتھی نے حملہ کر دیا۔ یہ نہایت نازک موقع تھا، اس وقت اگر بادشاہ کا ہاتھی بھاگ اُٹھتا تو اس کی ساری فوج منتشر ہو جاتی، لیکن عالم گیر کی جراتِ مردانہ اور قوتِ فیصلہ دیکھیے کہ ہاتھی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوا دیں تاکہ وہ گھبرا کر بھاگ نہ سکے۔

۲۔ جب اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر اُتریں تو اورنگ زیب کے ہم رکاب صرف پچیس تیس ہزار کی نفری تھی، ادھر دارا شکوہ ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار کی جرار پیدل فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا۔ جب جنگ میں تیزی آئی اور کشتوں کے پشتے لگنے لگے

تو تاریخ گواہ ہے کہ عالم گیر کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی رہ گئے تھے۔ اس انتہائی نازک وقت میں عالم گیر نے جس شجاعت اور دلیری کا مظاہرہ کیا، اس کو لین پول کا قلم ان الفاظ میں رقم کرتا ہے:

جنگ کی حالت انتہائی نازک شکل اختیار کر گئی تھی اور قریب تھا کہ اورنگ زیب ہزیمت سے دوچار ہو جائے، کیوں کہ اس کے چیدہ سے چیدہ رسالے بھی پسپا ہو چکے تھے اور وہ میدان میں تنہا کھڑا تھا۔ مشکل سے ایک ہزار آدمی اس کے گرد ہوں گے اور ان کو بھی دارا کے حملوں کا انتظار تھا۔ اس سے زیادہ استقلال اور رستمانہ شجاعت کے امتحان کا چشمِ فلک نے کبھی موقع نہ دیکھا ہوگا۔ لیکن اورنگ زیب کے بدن میں بجائے پٹھوں کے فولاد کے تار تھے۔ صرف اس کی شجاعت تھی، جس نے ایک ہزار افراد کو ایک لاکھ سے زائد فوج پر فتح دی۔

۳- بڑھاپا اور کمزوری بھی اس کے عزم و ہمت میں ضعف کے آثار پیدا نہ کر سکے۔ ستارا کے مقام پر مرہٹوں نے جب ایک سُرنگ کو اُڑا دیا اور بڑی تعداد میں مغل فوج تباہ ہوئی تو عالم گیر کی عمر اس وقت بیاسی برس کی ہو چکی تھی، پتا چلا تو جھٹ گھوڑے پر سوار ہوا اور مقامِ حادثہ پر پہنچا۔ فوجیوں کی لاشیں اپنی نگرانی میں نکلوائیں۔ اس حادثہ جانکاہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ مرہٹوں پر حملے کی تیاری شروع کر دی اور خود فوج کی کمان کرنے کا فیصلہ کیا۔ امرائے فوج بڑی مشکل سے شہنشاہ کو فیصلہ واپس لینے پر آمادہ کر سکے۔

۴- سیوا جی مرہٹہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سنبھاجی باپ کا جانشین ہوا تو اس نے برہان پور پر اچانک حملہ کر کے وہاں کی آبادی کو ہدفِ ظلم بنایا، نہایت سفاکی اور بے دردی سے شہر کو لوٹا اور پھر اس میں آگ لگا دی۔ برہان پور کے علما و مشائخ اس سے انتہائی پریشان ہوئے اور ایک محضر تیار کر کے عالم گیر کی خدمت میں بھیجا۔ اس محضر میں انھوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ یہ ملک دار الحرب ہو گیا ہے۔ عالم گیر نے علما کا یہ محضر پڑھا تو بے حد افسوس اور تاسف کا اظہار کیا اور جواب میں انھیں لکھا کہ مرہٹوں کی بیخ کنی کے لیے میں خود فوج لے کر آ رہا ہوں۔

۵- رام راج مرہٹہ کی موت کے بعد اس گروہ کے لوگ شاہی علاقوں سے نکل گئے تھے۔ لیکن ان میں سے کچھ کوکن وغیرہ کی خطرناک اور تنگ و تاریک وادیوں میں جا چھپے تھے۔ ان کے

کلّی استیصال کے لیے ان پر فوج کشی ضروری تھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے باوجودیکہ اسّی سال سے متجاوز ہو چکا تھا، اس مہم کی قیادت خود اپنے ہاتھ میں لی اور نہایت ہمت و استقلال سے مرہٹوں کو تاراج اور اُن کے مشہور قلعوں کو مسخر کرنے کے لیے نکلا۔ یہ قلعے چاروں طرف سے خطرناک اور مہیب غاروں اور خندقوں سے گھرے ہوئے تھے۔ بعض دو دو میل کی بلندی پر واقع تھے۔ ان میں ایک نہایت مضبوط قلعہ راج گڑھ کا تھا جسے سیواجی کا پایہ تخت کہنا چاہیے۔ اس قلعے کا دور بارہ میل کا تھا۔ راستے انتہائی دشوار گزار اور پُرپیچ تھے۔ کئی کئی دن کے مسلسل سفر سے بہ مشکل ایک ایک کوس کا فاصلہ طے ہو پاتا تھا۔ بسنت گڑھ، ستارا، ٹوان، کھینا، پرنالہ اور بھوسان گڑھ وغیرہ کے تمام قلعے اسی قسم کے تھے، انھیں مرہٹوں کے مرکز کہا جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے یہ قلعے ایک ایک کر کے فتح کیے۔ اس کے بعد یا تو مسمار کر دیے گئے یا ان میں شاہی فوج بٹھادی گئی۔

۶۔ یہ اورنگ زیب کا عالمِ پیری کا واقعہ تھا۔ دورِ شاہ زادگی کا یہ واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب وہ بلخ کی مہم پر عبدالعزیز خاں کے خلاف محاذ آرا تھا، تو عین حالتِ جنگ میں نمازِ ظہر کا وقت آگیا۔ دشمن کی فوجیں ہر طرف سے تیر برسا رہی تھیں، لیکن یہ استقلال کا پیکر اور بہادری کا پتلا بکمال اطمینان سے گھوڑے سے اُترا، وضو کیا، نماز کی صف آراستہ کی، باجماعت فرض ادا کیے اور حضورِ قلب کے ساتھ سنت اور نفل پڑھے۔ عبدالعزیز خاں والیِ بلخ نے یہ منظر دیکھا تو یہ کہہ کر لڑائی سے دست بردار ہو گیا کہ ایسے شخص سے لڑنا، ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔

۷۔ عالم گیری فوج کے سب سے دلیر اور بہادر سپاہی بارہ کے سادات مانے جاتے تھے، اسی وجہ سے یہ لوگ بہت خودسر اور مغرور ہو گئے تھے۔ انھوں نے اہلِ دربار اور بعض معززین کو زدوکوب کیا۔ عالم گیر نے یہ مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا، لیکن سادات بپھر گئے و کہا کہ ہم اپنا فیصلہ خود کریں گے۔ عالم گیر سادات بارہ کی یہ گستاخانہ حرکت اور محکمہ قضا کی توہین برداشت نہ کر سکا۔ غصے سے آستینیں چڑھالیں اور کہا کہ جو لوگ میری تلوار کی دھار دیکھ چکے ہیں، وہ شریعت کے مقابلے میں ایسے الفاظ منہ سے نکالتے ہیں، ان سے کہہ دو، سب مل کر آئیں۔ اس کے بعد انھیں انتظامی اور فوجی ذمے داریوں سے برطرف کر دیا۔ سادات کا سب غرور خاک میں مل گیا۔

۸۔ شاہ زادہ اکبر کو جو اورنگ زیب کا چوتھا بیٹا تھا، راجپوتوں نے بادشاہ بننے کا چکمہ دیا اور اس سلسلے میں اس کی حمایت کی قسمیں کھائیں۔ نادان شاہ زادہ باپ کی مخالفت اور بغاوت پر اُتر آیا۔ ستر ہزار کے لگ بھگ لشکرِ جرار اس کی کمان میں تھا۔ عالم گیر کو پتا چلا تو بیٹے کی بغاوت فرو کرنے کو نکلا۔ صرف ایک ہزار افراد اس کے ساتھ تھے، جنھیں ستر ہزار کے مقابلے میں "فوج" کہنا لفظِ فوج کا مذاق اُڑانا ہے۔ شہنشاہ کی فوجیں اس وقت دور دراز مقامات پر فرائضِ خدمت انجام دے رہی تھیں، حالات ایسے تھے کہ انھیں بلانا مناسب نہ تھا۔ عالم گیر کی جبینِ استقلال پر ذرا شکن نہیں پڑی اور وہ بالکل نہیں گھبرایا۔ کامل اطمینان سے میدان میں نکلا اور شاہ زادے کی ستر ہزار فوج کو ایک ہزار افراد سے پسپا کر دیا۔ بعد ازاں شاہ زادہ اکبر اِدھر اُدھر کے چکر کاٹنے کے بعد سمندر کے راستے سے ایران چلا گیا تھا اور وہیں ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) میں فوت ہوا۔

۹۔ عالم گیر کو تلوار اور قلم دونوں سے برابر کا تعلق تھا اور دونوں کو اس کی اطاعت گزاری پر فخر تھا۔ اگرچہ محمد حسین آزاد کو عالم گیر کی تعریف کرنے سے تکلیف ہوتی ہے، تاہم بقول شبلی کے "آزاد کو بھی بادلِ ناخواستہ" یہ لکھنا پڑا کہ "اس کی تحریریں دیکھ کر تعجب آتا ہے کہ جس طرح اورنگ سلطنت زیرِ قدم رکھتا تھا، اسی طرح کشورِ سخن بھی زیرِ قلم ——!"

۱۰۔ اورنگ زیب عالم گیر کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ روزانہ دو یا تین مرتبہ دربارِ عام منعقد کرتا تھا، جس میں ہر چھوٹا بڑا آدمی بغیر کسی جھجک اور روک ٹوک کے آسکتا اور اپنی حاجت بیان کر سکتا تھا۔ وہ ہر شخص کی بات توجہ سے سنتا، ان کی عرضیاں خود وصول کرتا اور اپنے ہاتھ سے ان پر حکم لکھتا تھا۔ عام طور پر وہ کھڑے ہو کر رعایا کی باتیں سنتا تھا۔ علامہ شبلی نے اس ضمن میں الفنسٹن کے حوالے سے ڈاکٹر جیلی کریری کا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا ہے، جس میں وہ کہتا ہے کہ میں نے عالم گیر کو دیکھا کہ وہ اٹھتر ۷۸ برس کی عمر کو پہنچ گیا تھا، صاف و سفید ململ کی پوشاک پہنے ہوئے عصائے پیری کے سہارے امیروں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا۔ اس کی پگڑی میں زمرد کا بڑا ٹکڑا ٹنکا ہوا تھا۔ وہ دادخواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا اور بلا عینک پڑھ کر اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا جاتا تھا۔ اس کے ہشاش بشاش چہرے سے صاف مترشح ہوتا تھا

کہ وہ اپنی مصروفیت سے نہایت شاداں و فرحاں ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر نے بادشاہ ہونے کے بعد جب دکن کی باغی ریاستوں اور سفاک مرہٹوں کے استیصال کا منصوبہ بنایا اور وہاں رہ کر معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو اس کی عمر پینسٹھ سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ جوانی نے رخت سفر باندھ لیا تھا اور بڑھاپا تیزی سے قبضہ جمارہا تھا لیکن اس نے بے حد جرأت سے کام لیا اور عمر کے آخری حصے میں تمام سنگین حالات پر انتہائی عقل مندی اور دلیری سے قابو پایا۔

سخاوت اور غریب پروری

اورنگ زیب عالم گیر بلاشبہ ہندوستان کا عظیم بادشاہ تھا۔ بڑا کشور کشا اور جنگ جو تھا، اس کے رعب و دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ دور دراز علاقوں میں بیٹھے ہوئے سرکش سے سرکش لوگ بھی اس سے لرزتے تھے، لیکن اس کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ اس کے اندر انسان کا دل تھا اور دل میں خدا ترسی اور ترحم کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ رعایا کے لیے انتہائی مشفق اور سخی تھا۔ اس سلسلے کے بہت سے واقعات مآثر عالم گیری، عالم گیر نامہ اور اس زمانے کی دیگر کتابوں میں مرقوم ہیں۔

مآثر عالم گیری کے مصنف محمد ساقی مستعد خاں نے جلوس عالم گیری کے سترھویں سال ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳ء) کے واقعات میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ جب اورنگ زیب حسن ابدال گیا تو وہاں کے باغ میں قیام پذیر ہوا۔ باغ کی دیوار کے ساتھ ایک ضعیف بڑھیا کا مکان تھا جس میں اس نے ایک پن چکی لگا رکھی تھی اور پن چکی کو پانی باغ سے آتا تھا۔ ملازمین شاہی نے پانی روک لیا اور پن چکی بند ہو گئی۔ بادشاہ کو پتا چلا تو فوراً پانی کھلوا دیا۔ رات کو جب کھانے پر بیٹھا تو اپنے خادم ابوالخیر کے ہاتھ بڑھیا کے لیے کھانا اور پانچ اشرفیاں بھیجیں اور کہا کہ میری طرف سے بڑھیا کو سلام کہو اور اس سے معذرت کرو کہ ہماری وجہ سے تم کو جو تکلیف ہوئی ہے اس کی معافی چاہتا ہوں۔ نیک خصال شہنشاہ نے اس پیغام پر ہی اکتفا نہیں کیا، صبح ہوئی تو پالکی بھیج کر بڑھیا کو بلایا اور حرم سرا میں بھیجا۔ بیگمات شاہی کے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بڑھیا غریب اور تنگ دست ہے، اس کی دو غیر شادی شدہ لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔ بادشاہ نے دو سو روپے عنایت کیے

اور مستورات نے زر و جواہر دیے۔ دو تین دن کے بعد بڑھیا کو پھر بلوایا اور لڑکی کی شادی کے لیے دو ہزار روپے عطا کیے، محل کی عورتوں اور شاہ زادوں نے روپے اور اشرفیاں دیں۔ چند روز کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ غریب بڑھیا امیر ہو چکی تھی۔

اورنگ زیب عالم گیر کی غریب پروری اور مستحقین کے لیے اس کی عطا و بخشش کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ علامہ شبلی کے زمانے میں ندوۃ العلما لکھنؤ کے ارباب حل و عقد نے ایک مرتبہ بنارس میں ندوہ کی علمی نمائش گاہ قائم کرنے کا اہتمام کیا، اس نمائش گاہ میں کثرت سے سلاطینِ تیموریہ کے عہد کے فرامین بہم پہنچائے گئے تھے، ان میں دو ثلث سے زیادہ عالم گیر کے فرامین تھے اور یہ تمام فرامین کسی عالم یا درویش کی جاگیر یا مددِ معاش کے متعلق تھے۔ اہلِ علم کے وظائف کے سلسلے کے اکثر فرامین وہ تھے جو عالم گیر کے دربار سے جاری ہوئے تھے[۱۵]

عالم گیر نے ملک کے ہر حصے میں راہ گیروں کے لیے مسافر خانے اور سرائیں تعمیر کرائیں اور اس طرح کا اہتمام کیا کہ حالتِ سفر میں راستوں میں لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ نیز کنوئیں کھدوائے کہ پانی کی قلت باقی نہ رہے۔ بہت سے مرکزی مقامات پر غلہ خانے قائم کیے کہ قحط کے زمانے میں غربا و مستحقین کو مفت غلہ تقسیم کیا جائے۔

بردباری اور متحمل مزاجی

ماثر عالم گیری میں ایک واقعہ مندرج ہے جس سے بادشاہ کی بردباری اور حلم و لینت کا ثبوت ملتا ہے —— سولھویں[۱۶] سال جلوس ۱۰۸۳ھ میں اورنگ زیب نماز عید الاضحیٰ سے فارغ ہو کر واپس آ رہا تھا کہ ایک شخص نے لکڑی پھانک کر ماری جو بادشاہ کے زانوں پر لگی۔ بادشاہ کے گرز بردار اس شخص کو پکڑ کر حضور میں لائے، لیکن حلیم الطبع شہنشاہ نے اس کو چھوڑ دینے کا حکم دیا —— غور کیجیے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، ہمارے اس دورِ جمہوریت میں بھی اس قسم کے واقعات کو بہت اہم سمجھا جاتا ہے اور ایسی حرکت کرنے والے کے پورے کردار اور ماضی کے واقعات کی تفتیش کے لیے ایک خاص عملہ مامور کر دیا جاتا ہے۔ تین چار سو سال

نمبر۱۵ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر۔ ص ۱۱۷

پیلشتر کے دورِ مطلق العنانی میں تو یہ انتہائی عظیم حادثہ تھا، لیکن اورنگ زیب نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ اورنگ زیب کے حالات میں مرقوم ہے کہ بادشاہ جامع مسجد سے واپس آرہا تھا کہ ایک شخص تلوار لہراتے ہوئے اس کی طرف دوڑا۔ لوگوں نے اسے فوراً گرفتار کرلیا اور قتل کر دینا چاہا۔ لیکن رحم دل بادشاہ نے ایسا کرنے منع کیا اور اس کے لیے آٹھ آنے یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

قیاس کہتا ہے کہ حملہ آور کا بیان لیا گیا ہوگا اور وہ بے کار اور نادار ہوگا۔ اسی لیے تو بادشاہ نے اس کا یومیہ وظیفہ مقرر کیا۔ لیکن یہ قیاس اگر صحیح بھی ہو تو حکمران کے قتل سے اقتصادی مسئلہ حل تو نہیں ہو جاتا۔ اس بحث سے قطع نظر بتانا صرف یہ ہے کہ یہ واقعہ نہایت سنگین نوعیت کا تھا مگر عالی ظرف بادشاہ نے نہ صرف کسی بازپرس اور تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس نہیں کی، اُلٹا حملہ آور کو معاف کر کے باقاعدہ اس کا روزینہ لگا دیا۔

اصلاحی اقدامات

اورنگ زیب عالم گیر نے تختِ ہند پر متمکن ہوتے ہی بہت سے اصلاحی اقدامات کیے اور ان متعدد رسوم و عوائد کو ختم کیا جو اسلام کے منافی تھیں اور پہلے سے جاری تھیں۔ ان کی جگہ ایسی چیزیں نافذ کیں جو شریعتِ اسلامی سے ہم آہنگ تھیں۔ مثلاً مغلیہ عہد میں سکّوں پر کلمہ طیبہ کندہ کیا جاتا تھا اور یہ سکّہ ہر قسم کے پاک اور ناپاک ہاتھوں میں گردش کرتا تھا، اس سے کلمہ طیبہ کی حرمت مجروح ہوتی تھی، لہٰذا عالم گیر نے ملکی سکّے پر کلمہ طیبہ لکھنا ممنوع قرار دے دیا۔ اس نے شمسی تقویم کے بجائے قمری اور ہجری تقویم کو مروّج کیا۔ جشنِ نوروز جو عالم گیر سے پہلے شان و شوکت سے منایا جاتا تھا اور اس میں امرا و وزرا بادشاہ کو مختلف قسم کے نذرانے پیش کرتے تھے، دورِ عالم گیری میں یہ بھی بند ہوا۔ بھنگ اور چرس کی کاشت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی اصلاح اور عادات و اطوار کی تطہیر کے لیے محکمہ احتساب قائم کیا گیا اور قصبات و بلاد میں محتسب مقرر کیے گئے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے، معاشرتی برائیوں کے ارتکاب سے روکتے، مے نوشی، قمار بازی اور دیگر منہیات سے سختی کے

ساتھ منع کرتے اور امورِ خیر کی تلقین و تبلیغ کرتے تھے۔ پھر غلاموں کی خرید و فروخت کا بھی سدِّباب کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ درباری سلام کے تمام غیر شرعی طریقے ختم کر کے صرف مسنون طریقِ سلام یعنی السلام علیکم کہنے کا حکم جاری کیا گیا۔ یہ حکم بھی جاری ہوا کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو السلام علیکم کہا کریں۔ اس نے مدارس جاری کیے اور ان میں قابل مدرس مقرر کیے۔

علاوہ ازیں اورنگ زیب نے ایک اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ دربار میں رقص و سرود کی محفلوں کے انعقاد کا سلسلہ سرے سے ختم کر دیا اور رقاصوں اور مغنیوں کو مناسب وظیفے دے کر دربار کی اس خدمت سے سبکدوش کر دیا۔ شعرا کی سرکاری سرپرستی بھی ختم کر دی اور دربار میں طویل عرصے سے ملک الشعرا کا جو منصب چلا آ رہا تھا، وہ بھی باقی نہ رہنے دیا۔ سرکاری اہتمام میں تاریخ نویسی بھی بند کر دی اور سرکاری مؤرخین کو سرکاری سرپرستی سے آزاد کر دیا گیا۔ بادشاہ کے ماتھے پر تلک لگانے، اس کے لیے زمین بوس ہونے اور جھروکے کے درشن وغیرہ سے بھی ممانعت کے احکام جاری کر دیے گئے۔

ولادت اور تخت نشینی کے مواقع کی تقریبات سادہ طریقے سے منانے کا حکم دیا گیا۔ بادشاہ کو سونے چاندی میں تولنے کی رسم بھی موقوف کر دی گئی، امرائے دربار کے لیے زیورات اور ریشمی لباس ممنوع قرار دے دیا گیا۔ شوہر کی وفات کے موقع پر ہندو عورتوں میں ستی کی رسم جو عرصۂ دراز سے چلی آ رہی تھی، سختی کے ساتھ بند کر دی گئی۔ اورنگ زیب کے تخت نشین ہونے کے وقت ملک میں تقریباً اسّی ٹیکس وصول کیے جاتے تھے، جو راہ داری، پنڈاری اور دریائے گنگا اور جمنا میں نہانے وغیرہ کے بالکل ناروا قسم کے ٹیکس تھے، وہ یک قلم منسوخ کر دیے گئے۔ یہ ٹیکس حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھے۔ صرف راہ داری ٹیکس سے حکومت کو پچیس (۲۵) لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی تھی۔

اورنگ زیب نے ایک اہم اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ کی وصولی لازمی قرار دی اور ہندوؤں پر جزیہ عائد کیا۔

نیکی اور تدیّن

ہندوستان کے اس شہنشاہ کو علمی لحاظ سے عالمِ دین کہنا چاہیے۔ یہ متعدد مروجہ علوم و

فنون میں مہارت رکھتا تھا۔ فقہ حنفی میں بالخصوص درک حاصل تھا۔ اس کا قول ہمہ وقت عمل
اور کردار ہمسرِ شریعتِ محمدی تھا۔ ورع و تقویٰ میں ممتاز، نماز با جماعت کا پابند، تہجد گزار اور
قائم اللیل تھا۔ اگر دہلی میں مقیم ہوتا نمازِ جمعہ بالالتزام وہاں کی جامع مسجد میں پڑھتا۔ تراویح کا
التزام کرتا اور رمضان کے عشرۂ آخر میں اعتکاف کرتا، ہر سوموار، جمعرات اور جمعہ کو روزے
رکھتا۔ اس کے علاوہ جن ایام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روزے رکھنا ثابت ہے، ان
میں باقاعدہ روزے رکھتا۔ رمضان کے روزوں کا تو اس درجہ اہتمام کرتا کہ شدید گرمیوں
میں بھی اس ماہِ مبارک کے روزے اس سے قضا نہ ہوتے۔ زکوٰۃ ادا کرتا اور غربا و مساکین کی
کھل کر امداد کرتا۔ اپنی ملکی اور انتظامی مجبوریوں کی بنا پر خود تو حج بیت اللہ کی سعادت حاصل
نہ کر سکا، البتہ بہت سے لوگوں کو ہر سال اپنے خرچ سے حرمین شریفین بھیجتا۔ قرآنِ مجید کی کثرت
سے تلاوت کرنا اس کا معمول تھا۔ بیواؤں، یتیموں اور بے سہارا مردوں اور عورتوں کو معقول
رقمیں عطا کرتا، وظائف بہ کثرت پڑھتا اور ادعیہ ماثورہ یعنی جو دعائیں کتبِ حدیث میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی و منقول ہیں، وردِ زبان رکھتا۔ سنن و نوافل کی پابندی کرتا اور
ہمیشہ باوضو رہتا۔ غیر شرعی لباس سے خود بھی اجتناب کرتا اور امرائے مملکت اور وزرائے
سلطنت کو بھی اس سے سختی کے ساتھ روکتا، منہیات سے دامن کشاں رہتا، مساجد میں جاتا
اور ملک میں مسجدوں کی آبادی و تعمیر کا اہتمام کرتا۔ مساجد میں امام مقرر کیے جاتے اور انتظام کے
لیے انھیں خرچ دیا جاتا۔ علما و مشائخ کی صحبت میں بیٹھتا اور ان سے مستفید و مستفیض ہوتا۔ اکل
و شرب کے بارے میں نہایت محتاط تھا، اس سلسلے کے شاہانہ و امیرانہ تکلفات سے مجتنب
رہتا۔ خوراک بہت سادہ اور کم کھاتا۔ بہر حال اس کی زندگی اسلام کے قالب میں ڈھلی ہوئی
تھی اور ہندوستان کا عظیم الشان بادشاہ ہونے کے باوجود وہ دینِ محمدی کا مطیع و فرماں بردار تھا۔

قرآنِ مجید سے شغف و محبت

قرآنِ مجید سے بہ درجہ غایت شغف و تعلقِ خاطر رکھتا تھا، بعض سورتیں تو ابتدا ہی سے
حفظ تھیں، سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد پورا قرآنِ مجید حفظ کیا۔ کسی نے ابتدائے حفظ
کی تاریخ سورہ اعلیٰ کی اس آیت سے نکالی۔ سنقرئك فلا تنسیٰ ٥ (۱۰۷۱ھ/ ۱۶۶۱ء)۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی تاریخ نہیں ہوسکتی تھی۔ قرآن پورا حفظ کر لیا تو لوح محفوظ (۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء) تاریخ ہوئی۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ حفظِ قرآن کی نہایت دلچسپ تاریخ مرزا روشن ضمیر نے کہی، جو شاہ جہان کے عہد میں بخشی اور عالم گیر کے زمانے میں بندرگاہِ سورت کے امین تھے۔

محی الدین و مصطفیٰ حافظِ تو صاحبِ سیفی و مرتضیٰ حافظِ تو
توحافظِ شرع و حافظِ تو شارع توحافظِ قرآن و خدا حافظِ تو

غالباً سات ہزار روپے انھیں بطور انعام ملے [۵۲]

حدیثِ رسول سے محبت

حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس شہنشاہِ ہند کو نہایت شغف و محبت تھی۔ اگرچہ اس زمانے کے ہندوستان میں کتبِ حدیث کی زیادہ نشر و اشاعت نہیں ہوئی تھی، لیکن جو کتابیں میسر آتیں، اورنگ زیب ان سے پورا استفادہ کرتا اور حدیث کی معرفت اور آگاہی کے لیے کوشاں ہوتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ تخت نشینِ سلطنت ہونے سے پہلے کتاب الاربعین مرتب کی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس حدیثیں جمع کیں۔ پھر مسند نشینِ مملکت ہونے کے بعد بھی چالیس احادیث پر مشتمل ایک اربعین مرتب کی۔ بعد ازاں دونوں اربعین کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور ان پر تعلیقات و فوائد تحریر کیے۔

علمِ فقہ میں درک اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین

اورنگ زیب عالم گیر فقہی مسلک کے لحاظ سے متشدد حنفی تھا، مسائل فقہیہ میں کامل عبور رکھتا اور اس کی تمام جزئیات کا ماہر تھا۔ فقہ کے متعلق اس کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ دیارِ ہند کے علمائے حنفیہ کی ایک عظیم جماعت سے "فتاویٰ ہندیہ" مرتب کرایا جو فتاویٰ عالم گیری کے نام سے مشہور ہے۔ یہ فتاویٰ عربی زبان میں ہے اور چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ ترتیب و تالیف کے بعد یہ فتاویٰ بہت سے لوگوں نے نقل کیا اور اس کے متعدد

---

[۵۲] المعارف لاہور، بابت ماہ مارچ ۱۹۶۸ء

نسخے مختلف اسلامی ممالک ـــــ حجاز، مصر، شام اور روم وغیرہ ـــــ میں پہنچے اور شائع و ذائع ہوئے اور وہاں کے علمائے دین و اصحابِ افتا نے اس سے استفادہ کیا۔

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین کے بعد عالم گیر نے اپنے تمام ممالکِ محروسہ میں حکم جاری کر دیا تھا کہ عدالتی فیصلوں میں اسی کو سامنے رکھا جائے اور اسی کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ اس کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں میں اہلِ علم قاضی مقرر کیے تاکہ وہ شریعت کی روشنی میں فیصلے صادر کریں اور اس ضمن میں کسی نوع کی مداہنت کا ثبوت نہ دیں۔ ہر معاملے میں دیانت دارانہ تحقیق و تدقیق کے بعد صحیح نقطۂ نظر تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

مضامین و مندرجات کے اعتبار سے فتاویٰ عالم گیری فقہ کی نہایت مفصل کتاب ہے جو مختلف اوقات میں ہندوستان کے مختلف مقامات لکھنؤ اور کلکتہ وغیرہ کے مطابع میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوتی رہی۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس کے ایک حصے کا قلمی نسخہ بھی موجود ہے، جس کا نمبر ۸۹۵۲ ہے، یہ نسخہ ۱۱۱ اوراق کو محیط ہے اور بہترین خطِ نسخ میں ہے۔ یہ نسخہ مندرجہ ذیل مضامین کو محتوی ہے۔

کتاب الدعویٰ، کتاب الاقرار، کتاب العلم، کتاب المضاربۃ، کتاب الودیعہ، کتاب العاریہ، کتاب الھبۃ، کتاب الاجارہ، کتاب المکاتب، کتاب الولاء، کتاب الاکراہ، کتاب الحجر، کتاب الماذون، کتاب الغصب۔

بلاشبہ اسلامی ہند میں فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین بہت بڑی علمی اور فقہی خدمت ہے جو ایک نیک دل اور صاحبِ علم حکمران کی سعیِ بلیغ سے برصغیر کے فحول علما اور نامور فقہا کی ایک منظم جماعت کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس اہم کام کا جس انداز سے آغاز ہوا، جس نہج سے یہ مختلف مراحل سے گزرا اور پھر جس اسلوب سے یہ تکمیل پذیر ہوا، اس کی مثال پوری علمی دنیا میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ کہنا چاہیے کہ اس کے بلند مرتبت مرتبین نے مسائلِ فقہ کا ایک دل آویز گلستان سطحِ کاغذ پر سجا دیا ہے اور صفحاتِ قرطاس پر مباحثِ بوقلموں کی ایک فکر انگیز جنت بسا دی ہے۔ اس میں عبادات اور معاملات کے ہر پہلو کو پوری وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور ہر مسئلے کے ہر گوشے کو مستند کتبِ فقہ کے حوالوں سے منقح کیا گیا ہے کیسی

حصّے میں بھی حتی الامکان تشنگی باقی نہیں رہنے دی گئی۔

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب وہی ہے جو دیگر کتبِ حدیث وفقہ کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ بہت مفصل اور مبسوط ہے۔ نئے مضامین باقی کتابوں کی طرح "کتاب" کا عنوان قائم کرکے شروع کیے گئے ہیں، پھر سوائے کتاب اللقیط، کتاب اللقطہ، کتاب الاباق اور کتاب المفقود کے باقی تمام عنوانات میں الگ الگ باب مقرر کیے ہیں اور ہر باب میں "فصل" کے تحت کچھ ذیلی عنوانات قائم کرکے مسئلہ زیرِ بحث سے متعلق بہت سے ضمنی مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً کتاب الطہارت سات ابواب پر مشتمل ہے، جنھیں باب اوّل، باب ثانی، باب ثالث، باب رابع، باب خامس، باب سادس، باب سابع کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پھر ہر باب کے تحت کچھ فصول ہیں، جنھیں فصل اوّل، فصل ثانی، فصل ثالث کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔

فتاویٰ عالم گیری میں جو مسائل معرضِ بیان میں آئے ہیں، انھیں دو وجوہ سے بالخصوص بڑی اہمیت حاصل ہے، ایک یہ کہ یا تو وہ راجح اور مفتیٰ بہ ہیں یا ظاہر الروایت کے ہیں۔ یعنی فقہِ حنفی کی ان چھ معروف کتابوں سے ماخوذ ہیں، جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہیں، اور جنھیں ظاہر الروایت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور وہ ہیں، جامع الکبیر، جامع الصغیر، المبسوط، الزیادات، السیر الکبیر اور السیر الصغیر۔! یہ کتابیں علمائے فقہ میں بجا طور پر عظیم اہمیت کی حامل ہیں اور فقہِ حنفی کی عظیم الشان عمارت ان ہی کتابوں کی بنیاد پر استوار ہے۔

اس کی فقہی اہمیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ فقہ کی تمام اہم اور قابلِ ذکر کتابوں کا نچوڑ ہے اور اس کے مآخذ و مراجع فروعِ فقہ میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

فتاویٰ عالم گیری اپنے اندر جو خصوصیات رکھتا ہے اور جن اوصاف کا حامل ہے، ان کی وجہ سے وہ فقہ کی دوسری تمام کتابوں سے ممتاز ہے، اور وہ خصوصیات و اوصاف مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اس کی ترتیب وتدوین صرف ایک شخص یا دو چار علما کی علمی کوششوں کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ علمائے دین اور فقہائے کرام کی ایک بڑی اور ممتاز جماعت کی مساعیِ جمیلہ سے

معرضِ تصنیف میں آیا۔ عالم گیر نے جن علمائے کرام کو اس کی ترتیب و تدوین کے لئے منتخب کیا، وہ اس دور کے علمی میدان میں اپنا کوئی حریف نہ رکھتے تھے، علاوہ ازیں زہد و تقویٰ اور تدین و ورع میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ انھوں نے بہ درجہ غایت عرق ریزی سے یہ فریضہ انجام دیا۔ پھر چوں کہ یہ علمائے فقہ کی ایک پوری جماعت کی تگ و تازِ علمی کا نتیجہ ہے، اس لیے اس میں فقہی لحاظ سے غلطی کا امکان کم ہے اور ہر مسئلہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

۲۔ اسلامی ہندوستان میں علمِ فقہ کی یہ پہلی مفصل و مبسوط کتاب ہے، جو ایک دین دار بادشاہ کی ذاتی سعی و محنت سے لکھی گئی اور اس پر عمل کی مستحکم دیواریں تعمیر کی گئیں۔ پھر یہ کتاب کئی دفعہ کتابت و طباعت کی منزلوں سے گزری، فارسی اور اردو زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے، تاکہ اس کے مشمولات و مندرجات سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں —— اس کتاب کے علاوہ بھی مختلف حکمرانوں کے دور میں فقہا نے فتاوے ترتیب دیے جو اس دور کے حکمرانوں کے نام منسوب ہوئے۔ لیکن یا تو وہ ایک "قلمی کتاب" سے آگے کی منزل کو نہ پہنچ سکے یا پھر ان میں سے کوئی فتاویٰ ایک قدم آگے بڑھ کر طباعت کے مرحلے سے گزرا بھی تو کما حقہ شہرت نہ پا سکا۔ لیکن فتاویٰ عالم گیری اس باب میں منفرد ہے جو سب سے فوقیت لے گیا اور علمی دنیا میں ایک اونچے مقام پر سرفراز ہو گیا۔

۳۔ اس میں فقط حصۂ عبادات ہی کو اہمیت نہیں دی گئی، اس کا حصۂ معاملات بھی متعدد ضروری تفصیلات و جزئیات کو محیط اور اہم مسائل کو محتوی ہے۔ مثلاً قضا، تجارت، بیوع، شفعہ، قصاص اور حدود وغیرہ کے احکام بہت تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

۴۔ اس میں ہر مسئلے کے اصل ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے اور اگر اصل کتاب (جس کا حوالہ دیا گیا ہے) سامنے نہیں ہے اور مسئلہ دوسری کتاب سے نقل ہوا ہے تو ناقلاً عن فلان کا لفظ لکھ کر اصل ماخذ کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

بہر حال اپنے ماٰخذ فقہی، مصادرِ علمی اور خصوصیاتِ گوناگوں کے اعتبار سے یہ فتاویٰ بڑی

اہمیت کا حامل ہے۔

فتاویٰ عالم گیری کی تصنیف و ترتیب کا آغاز کب ہوا اور کتنی مدت میں یہ اہم کام پایۂ تکمیل کو پہنچا؟ اس ضمن میں قطعیت اور یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ منشی محمد کاظم نے اپنی کتاب "عالم گیر نامہ" میں جو اورنگ زیب کے پہلے دس سالہ دورِ حکومت کے واقعات پر مشتمل ہے، فتاویٰ عالم گیری کی جمع و تالیف کا تذکرہ کتاب کے آخر یعنی دسویں سنِ جلوس میں کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس فتاویٰ کی تدوین اس وقت شروع ہوئی جب اورنگ زیب کو تختِ ہند پر متمکن ہوئے دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور شہنشاہ کی عمر پچاس سال کو پہنچ گئی تھی اور سنِ ہجری ۱۰۷۷ یا ۱۰۷۸ھ تھا۔ لیکن اس کی ترتیب کا سلسلہ کتنے سال چلا اور یہ اہم کام کب اختتام کو پہنچا، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

عام طور پر مشہور ہے (جس کا صحیح ثبوت ہمیں نہیں ملا) کہ فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین پر دو سال کی مدت صرف ہوئی۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اس کی تالیف کا آغاز ۱۰۷۷ھ یا ۱۰۷۸ھ میں ہوا اور تکمیل ۱۰۸۰ھ یا ۱۰۸۱ھ میں ہوئی۔ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں بہت سے فقہائے ہند شامل تھے اور نیک اطوار بادشاہ نے اس کے لیے متعدد حضرات کی خدمات حاصل کی تھیں۔ لیکن ہمیں اٹھائیس (۲۸) فقہا کے اسمائے گرامی کا علم ہو سکا ہے۔ اس کی ترتیب کا اہتمام شیخ نظام برہان پوری کے سپرد تھا جو منقولات و معقولات کے ماہر تھے اور فقہ کے مختلف گوشوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ بادشاہ ان کی بے حد قدر کرتا تھا، جن علماء و فقہا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کے لیے مامور و منتخب کیا گیا تھا، اس میں بھی ان کا مشورہ شامل تھا اور یہی اس گروہِ فقہا کے سربراہ اور مہتمم تھے۔ بادشاہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود فتاویٰ کی ترتیب میں پوری دلچسپی لیتا تھا۔ شیخ نظام برہان پوری جو فقہ میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے، روزانہ ایک صفحہ یا دو صفحے بادشاہ کے سامنے پڑھتے اور بادشاہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک مسئلے کو کامل توجہ سے سنتا، الفاظ دیکھتا، عربی عبارات پر غور کرتا، استنباطِ مسائل کو سمجھتا اور کاتبوں کی غلطیاں خود درست کرتا تھا۔ اس سے اس کی فقہ میں مہارت کا پتا چل سکتا ہے

فتاویٰ عالم گیر کے مرتبین نہایت محنت اور جاں فشانی سے یہ خدمت انجام دیتے تھے اور ان کو شاہی خزانے سے اس کا معاوضہ دیا جاتا تھا اور کتابیں بھی مہیا کی جاتی تھیں۔

اورنگ زیب اس فتاویٰ کی اشاعت کے لیے بہت کوشاں رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ ذخیرۂ فقہ صرف عربی زبان تک محدود نہ رہے بلکہ اس عہد کے ہندوستان کی اصل علمی زبان ــــ فارسی ــــ میں بھی اسے منتقل کیا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے اس کی نگاہِ انتخاب مشہور ترکی عالم عبداللہ چلپی پر پڑی۔ سرزمینِ ترکستان کا یہ عالمِ دین اورنگ زیب کے باپ شاہ جہان کے عہدِ حکومت میں فقیروں کے لباس میں ہندوستان آیا اور دہلی میں اقامت گزین ہوا۔ اس کا رابطہ شاہ جہان کے وزیرِ اعظم سعداللہ خاں سے پیدا ہوا تو وہ اس کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا اور اس کا باقاعدہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر شاہ جہان سے ملاقات ہوئی تو اس نے اس پیکرِ علم کو یومیہ وظیفے کا مستحق گردانا۔ شاہ جہان کے بعد اورنگ زیب عالم گیر وارثِ تختِ ہند ہوا تو اس نے ان کو اپنی نوازشہائے شاہانہ اور عنایاتِ خسروانہ کے لیے مختص کر لیا اور فتاویٰ عالم گیری کے فارسی ترجمے پر مامور کیا۔

فتاویٰ عالم گیری کے دوسرے فارسی مترجم قاضی القضاۃ نجم الدین علی کاکوروی ہیں۔ ان کی تاریخِ ولادت ۱۵ ربیع الاول ۱۱۵۷ھ اور تاریخِ وفات ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۲۹ھ ہے۔ یہ بھی ارضِ ہند کے بہت بڑے عالم اور عظیم فقیہ تھے۔ کئی کتابوں کے مصنّف اور شارح تھے۔ انھوں نے فتاویٰ عالم گیری کی کتاب الجنایات تک کا مع فارسی شرح کے ترجمہ کیا۔ موصوف نے یہ خدمت لارڈ سر جان شور (۱۷۹۳ ــــ ۱۷۹۸ء) کے مشورے سے سرانجام دی تھی۔

افسوس ہے فتاویٰ عالم گیری کے پہلے فارسی ترجمے کا، جس کا خود اورنگ زیب عالم گیر نے حکم دیا تھا کوئی پتا نہیں چلتا۔ البتہ اس کا دوسرا ترجمہ جو مع شرح کے قاضی نجم الدین نے کتاب الجنایات تک کیا تھا، موجود ہے۔ یہ ترجمہ کلکتہ اور لکھنؤ کے مطبعوں میں کئی بار چھپ بھی چکا ہے لیکن ہماری گزر سے نہیں گزرا۔ اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں "ترجمہ فتاویٰ عالم گیری" کے نام سے اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں "کتاب الحدود والسرقہ" کے نام سے موجود ہیں۔ پٹنہ لائبریری کے نسخے پر کتاب اور مصنف کا

نام درج نہیں۔ البتہ اس کی پشت پر "کتاب الحدود" مرقوم ہے، لیکن بقول مرتب کے یہ ترجمہ قاضی نجم الدین کے ترجمے سے حرف بحرف مطابقت کرتا ہے، اس لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ وہی ترجمہ ہے۔

فتاویٰ عالم گیری کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور اتفاق ملاحظہ ہو کہ قبول و تداول کے لحاظ سے یہ ترجمہ اصل عربی کتاب سے فوقیت لے گیا ہے۔ یہ ترجمہ مشہور عالمِ دین مولانا سید امیر علی ملیح آبادی مرحوم (متوفی ماہِ رجب ۱۳۳۷ھ) نے کیا تھا، جو مفسرِ قرآن اور کئی علمی کتابوں کے مصنّف اور شارح و مترجم تھے۔ یہ ترجمہ منشی نول کشور (لکھنؤ) نے کرایا تھا اور سب سے پہلے اسی مطبع میں شائع ہوا تھا۔ فاضل مترجم نے اس پر ایک مبسوط اور مفصل مقدمہ بھی سپردِ قلم کیا جو بے شمار معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں اصل عربی کتاب کی نسبت اہلِ علم میں بھی یہی اردو ترجمہ زیادہ متداول اور رواج پذیر ہے۔

مولانا سید امیر علی ملیح آبادی، حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی (متوفی ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ) کے شاگرد اور مولانا ابو الکلام آزاد کے رفیقِ خاص اور نامور عالم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے استاذ تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے[۲۲]

عالم گیر کا کتب خانہ

شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر بہت علمی ذوق کا مالک تھا، اس کا اپنا ایک ذاتی کتب خانہ تھا جو ساڑھے تین سو سال پیشتر کے ہندوستان کے حالات کے مطابق بڑا وسیع اور مختلف علوم و فنون سے متعلق بہت سی کتابوں پر مشتمل تھا۔ فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین پر جو علمائے کرام اور فقہائے عظام مقرر ہوئے وہ زیادہ تر اسی کتب خانے سے مدد لیتے تھے۔ "عالم گیر نامہ" کا مصنّف لکھتا ہے کہ یہ کتب خانہ اطراف و اکنافِ

۲۲؎ فتاویٰ عالم گیری کی جمع و تدوین اور اس کے مرتبین و مترجمین کے مفصل حالات نیز اس کے مشمولات و مندرجات کے لیے ملاحظہ ہو، راقم السطور کی کتاب "برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ" از صفحہ ۲۸۵ تا ۳۴۶۔

عالم سے فراہم کیا گیا ہے اور اس میں بلند پایہ مستند کتابیں اور ہر موضوع کی مبسوط و مفصل تصنیفات موجود ہیں۔ علمائے وقت تحقیق و تدقیق اور غور انیق کے لیے اس کتب خانے کی طرف رجوع کرتے ہیں [۲۳]

اس سے آگے وہ رقم کرتا ہے کہ جو علمائے کرام ترتیبِ فتاویٰ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، ان کے علمی مرتبے کے مطابق ان کے وظائف و عطایا کا انتظام بھی کیا گیا ہے اور ان کے لیے بادشاہ کے کتب خانۂ خاص سے کتابیں بھی مہیا کی جاتی ہیں [۲۴]

عالم گیر کا یہ کتب خانہ اس کے آبا و اجداد کے زمانے سے چلا آرہا تھا اور مغلیہ خاندان کا ہر بادشاہ اپنے ذوقِ علمی کی روشنی میں انتہائی شوق سے اس کو ترقی دیتا اور اس میں اضافہ کرتا تھا۔ عالم گیر کے والد شاہ جہان کو بھی کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور یہی شوق عالم گیر کو بھی ورثے میں ملا اور اس نے اپنے پیش رووں کے کتب خانے میں مزید توسیع کی۔ چنانچہ "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے" کے فاضل مصنف سید صباح الدین عبدالرحمان نے اپنی اس کتاب میں "کتب خانے" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، جس میں انھوں نے شاہانِ ہند اور شاہان مغلیہ کے کتب خانوں کے بارے میں خاصی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ اس مضمون میں "عالم گیر کا کتب خانہ" کے ضمنی عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ عالم گیر نے اپنے سے پہلے حکمرانوں کے کتب خانے کو مزید ترقی دی۔ الفاظ حسبِ ذیل ہیں:

سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اس کتب خانے کو اور زیادہ ترقی ہوئی۔ اس کا ناظم محمد صالح تھا جو عیسیٰ خان ترخان (سندھ) کا دوسرا لڑکا ہے اور مہتمم مہابت خاں کا پوتا محمد منصور مقرر ہوا۔ اس کو مکرمت خاں کا خطاب بادشاہ نے عطا فرمایا۔ ۱۰۶۹ھ میں اس کے مہتمم سید علی حسینی ہوئے، جیسا کہ ایک کتاب (قرآن شریف) کی مہر سے ظاہر ہوتا ہے جو اس وقت

۲۳ھ عالم گیر نامہ، ص ۱۰۸۶

۲۴ھ ایضاً، ص ۱۰۸۷

رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔[۲۵]

عہدِ عالم گیری کے علمائے کرام

اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کو علم و فضل اور تحقیق و کاوش کے لحاظ سے عہدِ زریں سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس عہد میں بے شمار علمائے کرام، فقہائے عالی مقام اور مشائخ عظام سرزمینِ ہند میں موجود تھے۔ ان حضرات کے جگہ جگہ مدارس قائم تھے جن میں کثیر تعداد میں تشنگانِ علوم اپنی علمی تشنگی بجھاتے تھے۔ پھر مشائخ کی خانقاہیں تھیں، جن سے لوگ روحانی فیوض حاصل کرتے تھے —— خود بادشاہ علما و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے علمی اور روحانی مسائل دریافت کرتا تھا۔ وہ ان کا بے حد قدر دان اور انتہائی تعظیم کرتا تھا۔ اس عہد کے علما و مشائخ کے اسمائے گرامی ”فقہائے ہند“ کی چوتھی جلد میں بھی مرقوم ہیں اور پانچویں جلد کے زیرِ نظر حصے میں بھی موجود ہیں۔ پھر اس جلد کے دوسرے حصے میں بھی ان شاء اللہ قارئین کرام کے مطالعہ میں آئیں گے۔

فنونِ لطیفہ و تعمیرات

عالم گیر اپنے اسلاف کی طرح فنونِ لطیفہ اور تعمیرات سے بھی پوری دلچسپی رکھتا تھا۔ کئی بڑی بڑی عمارتیں، مشہور مسجدیں، متعدد سرائیں اور بہت سے مدرسے اس کے عہد کی تعمیرات میں شامل ہیں۔ مثلاً قلعہ آگرہ میں حصار شیر حاجی تعمیر کی گئی، اسی قلعے میں سنگِ مرمر کی ایک خوب صورت مسجد خطیر رقم سے بنائی گئی جو آٹھ سال میں تیار ہوئی، دہلی کے لال قلعے میں سنگِ مرمر کی ایک مسجد تعمیر ہوئی جو موتی مسجد کہلاتی ہے۔ بنارس میں ایک شان دار مسجد بنائی گئی۔ اسی طرح لاہور کی عظیم الشان مسجد جو بادشاہی مسجد کے نام سے موسوم ہے، اورنگ زیب کے ذوقِ تعمیر کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ سنگِ مرمر کی یہ مسجد ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳ء) میں فدائی خاں کوکہ کی نگرانی میں کئی لاکھ روپے کے خرچ سے مکمل ہوئی۔ اس کے علاوہ حصار، دہلی، متھرا، آگرہ، گوالیار، احمد آباد، بنگال، لاہور اور کشمیر وغیرہ میں بہت سی عمارات اس

---

۲۵ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، ص ۲۸۰، ۲۸۱۔ بحوالہ ماہ نامہ ”معارف“ (اعظم گڑھ)، جلد ۱۴، ص ۴۲۲

کے عہد کی یادگار اور مغل فنِ تعمیر کے زندہ نقوش ہیں۔

عالم گیر کے اساتذہ

شاہ جہان کو اہلِ علم سے خاص دل بستگی تھی اور اس کا دربار علما کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں دور دور سے اصحابِ فضل و کمال کو دعوت دی جاتی اور مختلف مسائل میں مباحث کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس نے شاہ زادوں کی تعلیم کا بھی نہایت عمدہ انتظام کیا تھا۔ پھر اورنگ زیب چوں کہ ذاتی طور پر بھی شائقِ علم اور گرویدۂ علما تھا، اس لیے اس نے خود بھی متعدد مشاہیر اصحابِ علم سے استفادہ کیا۔ اس کے اساتذہ کا ابتدائی سطور میں ذکر ہو چکا ہے۔ اب ذیل میں اختصار کے ساتھ ان کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

۱۔ مولانا عبداللطیف سلطان پوری: عالم گیر کے یہ استاذ محترم جلیل القدر عالم تھے اور معقولات و منقولات میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ ۱۰۳۶ھ میں فوت ہوئے۔ مرآۃ العالم کی روایت کے مطابق ۱۰۴۲ھ کو وفات پائی۔

۲۔ مولانا محمد ہاشم گیلانی: تفسیر، حدیث، فقہ اور امورِ دینیہ میں ماہر اور علومِ حکمیہ میں کامل تھے۔ بارہ سال حجاز کی مقدس سرزمین میں قیام پذیر رہے۔ اسّی سال عمر پا کر ۱۰۶۱ھ کو اورنگ آباد میں انتقال کیا۔

۳۔ شیخ محی الدین بہاری: اورنگ زیب کے یہ استاذ ارضِ ہند کے مشاہیر فقہا میں سے تھے اور ملا موہن بہاری کے عرف سے معروف تھے۔ نہایت طباع اور تیز فکر تھے۔ چوراسی (۸۴) سال عمر پا کر ۱۰۶۸ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

۴۔ علامہ محمد شفیع یزدی: یہ شفیعائے یزدی کے نام سے مشہور ہیں۔ اقلیمِ ہند کے نامور فضلا میں سے تھے اور نواب دانش مند خان کے لقب سے ملقب تھے۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۰۸۱ھ کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

۵۔ سید محمد قنوجی: اورنگ زیب عالم گیر کے یہ استاذ جید عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل تھے۔ بادشاہ ان کا بے حد احترام کرتا تھا، اور ہفتے میں تین روز امام غزالی کی احیاء علوم الدین، کیمیائے سعادت اور فتاویٰ عالم گیری

کے بارے میں ان سے مذاکرہ کرتا اور ان کے علم و فضل سے مستفید ہوتا تھا۔ شاہ جہاں بھی ان کا بے حد مداح تھا۔ شاہ جہان نے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بتیسویں (۳۲) سال انھیں اپنے پاس بلایا اور پھر زندگی کے آخری سانس تک اس پیکرِ علم کو اپنے پاس رکھا۔ آگرے کے قلعے میں اس کی نظر بندی کے ایام میں بھی یہ اس کے پاس تھے۔ اس کی تجہیز و تکفین میں بھی شریک رہے۔ اس کی وفات کے بعد عالم گیر سے وابستگی اختیار کی۔ ۱۱۰۱ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

۶۔ علامی سعد اللہ خان: شاہ جہان کے وزیرِ اعظم تھے۔ علم و فضل اور وسعتِ معلومات میں یگانۂ روزگار تھے۔ عقل و فکر اور فہمِ سیاست میں ممتاز تھے۔ اصلاً پنجاب کے قصبہ چنیوٹ کے باشندے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عرصہ تک لاہور کی مسجد وزیر خاں میں علومِ دینیہ کا درس دیتے رہے۔ ۱۷ رمضان المبارک ۱۰۵۰ھ کو شاہ جہان کے دربار میں گئے۔ وہ ان کی قابلیت سے بے حد متاثر ہوا اور بہت سے مناصب عطا کیے۔ ۲۶ جمادی الآخریٰ ۱۰۶۶ھ کو اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھارے۔

۷۔ شیخ احمد معروف بہ ملا جیون امیٹھوی: بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ملا جیون بھی اورنگ زیب عالم گیر کے استاذ تھے۔ تفسیر احمدی، نور الانوار اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ملا جیون ۹ ذیقعدہ ۱۱۳۰ھ کو ۸۳ سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔

۸۔ شیخ عبد القوی: یہ بھی عالم گیر کے استاذ تھے اور اس اعزاز پر نازاں تھے۔

۹۔ حاجی قاسم خوش نویس: ان کا ذکر "عالم گیر نامہ" میں عالم گیر کے ساتویں سالِ جلوس (۱۰۷۴ھ) کے واقعات میں کیا گیا ہے۔ بہترین خوش نویس تھے۔ عالم گیر نے ان سے خطِ نسخ سیکھا۔

۱۰۔ شیخ علی خطّاط: دورِ مغلیہ کے فاضل بزرگ اور اس زمانے کے نامور خطّاط تھے۔ شاہ جہان نے انھیں عالم گیر کا اتالیق مقرر کیا اور جواہر رقم کے لقب سے نوازا۔ عالم گیر نے ان سے خطِ نستعلیق کی مشق کی۔ اچھے شاعر بھی تھے۔ عالم گیر نے تخت نشین ہونے کے بعد ان کو اپنے کتب خانے کا مہتمم بنا دیا تھا۔

۱۱- شیخ سیف الدین سرہندی : اورنگ زیب عالم گیر کے مرشد تھے اور وہ ان کا انتہائی معتقد تھا۔ شیخ محمد معصوم سرہندی کے بیٹے اور حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مشہور تھے۔ ۱۰۴۹ھ میں بمقام سرہند پیدا ہوئے اور ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۰۹۶ھ کو صرف سینتالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

۱۲- شیخ محمد معصوم سرہندی : حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند رشید تھے۔ نہایت متقی اور عبادت گزار تھے۔ ۱۱ شوال ۱۰۰۷ھ (یا ۱۰۰۹ھ) کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ اورنگ زیب ان سے بیعت تھا اور ان کو بے حد لائقِ احترام گردانتا تھا۔ شیخ ممدوح نے ۹ ربیع الاوّل ۱۰۷۹ھ کو سرہند میں وفات پائی۔

بزرگانِ سرہند سے تعلقِ خاص

بزرگانِ سرہند سے عالم گیر کو خاص تعلقِ ارادت اور بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ خود بھی ان کا مرید تھا اور دوسروں کو بھی ارادت کے لیے ان کے پاس بھیجتا تھا۔ اس کا ثبوت بہت سے واقعات سے ملتا ہے جن میں ایک واقعہ مآثر عالم گیری میں اس طرح درج ہے کہ ایک مرتبہ عالم گیر کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میں بادشاہ کا مرید ہونے کے لیے بنگالہ کے دور دراز ملک سے آیا ہوں۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے مسکرا کر جیب سے کچھ نقدی نکالی اور ملازمین سے کہا کہ یہ شخص ہمارے فیض سے جس چیز کا امیدوار ہے، وہ یہی ہے، یہ اُسے دے دو۔ لیکن اس شخص نے بادشاہ کا عطیہ پھینک دیا اور مایوس ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ قریب ہی شاہی خیمے نصب تھے، دریا میں پیراک کود پڑے، اسے نکالا تو بادشاہ نے ہندی کا ایک شعر پڑھ کر کہا کہ اس شخص کو میاں محمد نافع سرہندی کے پاس لے جاؤ اور انھیں کہو کہ اُسے مرید کر کے سرہندی ٹوپی اس کے سر پر رکھیں[۲۶]۔

اورنگ زیب عالم گیر ہندوستان کا وہ شہنشاہ تھا جو انتہا درجے کا متبع سنت اور خادم اسلام تھا، علما و فقہا کی صحبتوں میں بیٹھتا اور ان سے مستفید ہوتا تھا۔ اگر کسی مسئلے کا اسے علم نہ ہوتا اور

---

۲۶ مآثر عالم گیری، ص ۲۳۳، ۲۳۴

اسے بتا دیا جاتا تو بے حد خوش ہوتا اور فوراً اس پر عمل کرتا۔ جیسے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے وہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے بزرگوں کا نہایت عقیدت مند تھا اور ان کو اکثر دربار میں تشریف لانے کی تکلیف دیتا۔ خاندانِ مجددیہ کے بزرگوں میں ایک بزرگ شیخ سیف الدین سرہندی تھے، جو حضرت مجدد کے پوتے اور خواجہ محمد معصوم سرہندی کے فرزندِ رشید تھے۔ ۱۰۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۰۹۶ھ کو صرف سینتالیس سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ بدرجہ غایت نیک اور متقی تھے، بہت بڑے عالم و فاضل اور فقیہ تھے — ایک مرتبہ اورنگ زیب نے خواجہ محمد معصوم کو خط لکھا جس میں درخواست کی کہ مہربانی فرما کر وعظ و نصیحت کے لیے کسی بزرگ کو دہلی بھیجا جائے۔ چنانچہ خواجہ ممدوح نے بادشاہ کے اس خط کو درخورِ اعتنا گردانا اور اپنے بیٹے شیخ سیف الدین سرہندی کو اس کے پاس دہلی بھیجا۔ بادشاہ نے نہایت تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا اور قلعے میں جانے کی درخواست کی۔ شیخ ممدوح جب بادشاہ اور امرا و وزرا کی معیت میں دہلی کے لال قلعے میں داخل ہونے لگے تو دیکھا کہ صدر دروازے پر دو ہاتھیوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، جن پر دو فیل بان سوار ہیں۔ شیخ وہیں رک گئے اور قلعے میں جانے سے انکار کر دیا۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جس گھر میں تصویر ہو، اس میں رحمت کا فرشتہ داخل نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو گھر رحمتِ خداوندی سے محروم ہے، سیف الدین اس میں نہیں جا سکتا۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ہاتھی اور فیل بانوں کی تصویریں توڑ دی گئیں اور شیخ قلعے میں داخل ہوئے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ تذکروں میں مذکور ہے کہ شیخ سیف الدین دہلی گئے، تو ایک روز بادشاہ نے ان کو باغِ حیات کی سیر کو جانے کی درخواست کی۔ شیخ سیر کرتے کرتے تالاب پر پہنچے تو اس میں سونے کی مصنوعی مچھلیاں پڑی تھیں، جن کی آنکھوں پر جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ شیخ انھیں دیکھ کر نہایت کبیدہ خاطر ہوئے اور فرمایا جب تک ان مچھلیوں کو توڑا نہیں جائے گا میں یہاں نہیں بیٹھوں گا۔ باغ کے محافظوں

نے تالاب کی خوبصورتی میں کمی واقع ہونے کے خیال سے مچھلیوں کو توڑنے میں تامل کیا، لیکن بادشاہ نے شیخ کی نصیحت کے مطابق اسی وقت مچھلیاں تڑوا ڈالیں اور کہا کہ مچھلیوں کی نسبت خاطرِ شیخ ہمارے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔

شیخ واپس سرہند تشریف لے گئے تو بادشاہ نے خواجہ محمد معصوم کو شکریے کا خط تحریر کیا اور شیخ سیف الدین کے پند و مواعظ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحسین کی۔ خواجہ ممدوح نے بھی بادشاہ کو جواب میں مکتوب ارسال کیا، جس میں رقم فرمایا کہ الحمد للہ والمنۃ کہ فقیر زادہ منظورِ نظر و قبول گشتہ واثر صحبت بحصول انجامیدہ واز امر معروف و نہی منکر کہ شیوہ فقیر زادہ است اظہار شکر و رضامندی نمودہ بودند، شکر خداوندی جل شانہ بریں عطیہ بجا آوردہ وسبب از دیاد دعاگوئی نمودہ آمد، چہ نعمتے است کہ باایں ہمہ طمطراق بادشاہی و دبدبہ سلطانی کلمہ حق بسمع قبول افتد و گفتہ نامرادے موثر شود۔

یعنی اللہ کا بے پایاں شکر ہے کہ فقیر زادہ کو منظورِ نظر اور لائقِ التفات سمجھا گیا اور اس کے اثرِ صحبت کو نتیجہ خیز قرار دیا گیا۔ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا فقیر زادے کی فطرت میں داخل ہے، اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے اس نعمتِ عظمٰے سے اسے بہرہ مند فرمایا۔ یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آپ نے طمطراقِ بادشاہی اور دبدبہ سلطانی کے باوجود کلمۂ حق سنا اور اُسے تسلیم کیا۔

یاد رہے یہ تصویریں وغیرہ اورنگ زیب سے پہلے سے چلی آرہی تھیں، ورنہ خود اس کو ذاتی طور پر اس قسم کا کوئی شوق نہ تھا۔

ہندو امرا اور منصب داروں کی تعداد میں اضافہ

اورنگ زیب چوں کہ پابندِ شریعت اور شیدائی اسلام تھا، اس لیے عدل و انصاف اور عفو و کرم کو سب سے مقدم گردانتا تھا۔ یہ قدرتی بات ہے جو شخص جتنا پکا مسلمان ہوگا، اتنا ہی رحم دل اور دوسروں کا خیر خواہ ہوگا، کیوں کہ اسلام اپنے متبعین کو یہی تعلیم دیتا ہے۔ بالخصوص حکمران کو وہ اس سلسلے میں بہت زیادہ

ہدایات سے نوازتا ہے۔ اسی بنا پر اورنگ زیب نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی ہندو رعایا کو بے حد مراعات دیں اور ان کے متعدد افراد کو باقاعدہ امرائے حکومت میں شامل کیا۔ جن ہندو امرا نے اس کو قدم قدم پر دھوکا دیا تھا، انھیں بھی مہربانیوں کا مستحق ٹھہرایا۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مغل عہد کے ہندوستان میں ہندوؤں کی طاقت کے تین اہم اور مشہور مرکز تھے۔ جے پور، جودھ پور اور اودے پور— جے پور اور جودھ پور نے مرکزی حکومت کی کلی طور پر اطاعت قبول کرلی تھی۔ لیکن بابر سے لے کر شاہ جہان تک اودے پور کی یہ حالت رہی کہ حملہ ہوا تو گردن جھکالی اور خطرہ ٹلا تو پھر سرکشی پر اُتر آیا۔ جے پور کا رئیس راجا جے سنگھ تھا، یہ مغل حکومت کا کامل وفادار تھا اور جودھ پور کا حکمران راجا جسونت سنگھ تھا۔ یہ دونوں راجے مغل حکومت کے حلقہ امرا اور طبقہ ملازمین میں شامل تھے۔ اودے پور کے مہارانا جگت سنگھ کی موت کے بعد اس کا بیٹا مہارانا راج سنگھ اس کا قائم مقام ہوا۔ اس نے وفات پائی تو اورنگ زیب کی طرف سے اس کے بیٹے اندر سنگھ کو دو ہزاری منصب اور بہادر سنگھ کو ایک ہزاری و پانصدی منصب عطا ہوا تھا۔

جسونت سنگھ کے بارے میں گزشتہ سطور میں بتایا جاچکا ہے کہ اس نے اورنگ زیب کے ساتھ بار بار غدّاری کی مگر فراخ دل بادشاہ نے ہر مرتبہ اس کو معاف کیا۔ جب عالم گیر کا اپنے بھائی شجاع سے معرکہ پیش آیا تو شجاع کے مقابلے میں جسونت سنگھ کو فوج کا حاکم مقرر کرکے بھیجا۔ لیکن جسونت سنگھ نے اس کمینگی کا ثبوت دیا کہ شجاع سے سازش کرکے رات کی تاریکی میں نصف شب کو عالم گیر کی فوج سے نکل کر اپنی تمام فوج کے ساتھ جو مجموعی لحاظ سے آدھی تھی، شجاع سے جاملا۔ اس کی فوج نے شاہی مال و اسباب اور خزانے پر بھی دست درازی کی، جس کے نتیجے میں نہایت ابتری اور افراتفری پھیل گئی۔ یہ بڑا ہی نازک موقع تھا، جس پر عالم گیر نے انتہائی فہم و فراست سے قابو پایا اور جبینِ استقلال پر شکن تک نہیں پڑی۔ بعد ازاں اس کو سیواجی کے مقابلے میں بھیجا

تو اس وقت بھی غداری سے باز نہ آیا، مگر عالم گیر کا دل گردہ دیکھیے کہ اس نے نہ صرف اس کو کوئی سزا نہ دی بلکہ اس کے خواستگارِ معافی ہونے پر ہر مرتبہ اس کو معاف کیا اور منصب و خطاب اور جاگیر سے نوازا۔

اورنگ زیب عالم گیر نہایت فراخ حوصلہ بادشاہ تھا، وہ رعایا کے ہر شخص کو خواہ ہندو یا مسلمان لائق اعتماد قرار دیتا اور مملکت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کرتا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کے مقالہ نگار پروفیسر شیر محمد گریوال کی تحقیق کے مطابق شہنشاہ اکبر کے عہد میں جس کو ہندوؤں کا بہت بڑا خیر خواہ بلکہ محافظ سمجھا جاتا ہے، ہندو امرائے مملکت کی تعداد باون (۵۲) تھی اور اورنگ زیب کے عہد میں جسے مذہبی اعتبار سے "متعصب" قرار دیا جاتا ہے، یہ تعداد اکسٹھ (۶۱) تک پہنچ گئی تھی۔ اکبر کے دورِ حکومت میں ہندو منصب داروں کی تعداد چونسٹھ (۶۴) تھی، لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں ایک سو اسّی (۱۸۰) ہو گئی تھی یعنی تقریباً تین گنا بڑھ گئی تھی۔

پھر اورنگ زیب عالم گیر نے ہندوؤں کے مندروں اور عبادت خانوں کی بھی پوری حفاظت کی، البتہ متھرا، بنارس، کھنڈیلہ اور بعد میں اودے پور کے وہ بت خانے جن میں مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں اور جو اسلامی حکومت کے خلاف بغاوتوں کا مستقل مرکز بن گئے تھے، منہدم کرا دیے گئے تھے۔ انہدام کی نوبت اس وقت آئی جب متھرا وغیرہ کے نواح میں ہندوؤں نے بے حد شورش بپا کی اور وہاں کے فوجدار عبد النبی خاں کو قتل کر دیا۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے تو اورنگ زیب کیا کوئی حکومت بھی سازشوں اور بغاوتوں کے لیے نہ مذہبی مقامات کے استعمال کی اجازت دے سکتی ہے اور نہ کسی اور مخالفِ حکومت اڈے کے قیام کو برداشت کر سکتی ہے۔

قرآنِ مجید کی کتابت کا سلسلہ

اورنگ زیب عالم گیر اپنے اوضاع و اطوار میں دیگر بادشاہوں سے بالکل ایک ممتاز نوعیت کا بادشاہ تھا۔ وہ نہایت خوش خط تھا۔ خطِ نسخ میں بالخصوص مہارت رکھتا تھا۔ قرآنِ مجید کی کتابت کا اسے بہت شوق تھا۔ وہ قرآنِ مجید اپنے قلم سے لکھ

کر حرمین شریفین بھیجے۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے مشاغل کے ساتھ ساتھ غالباً قرآنِ مجید کی کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ اس کے ہاتھ کے کتابت شدہ قرآن کے نسخے مختلف اندازمیں بعض ذرائع سے لوگوں میں فروخت ہوتے رہتے تھے۔ یہ رقم الگ رکھی جاتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق بادشاہ ٹوپیاں سی کر بھی فروخت کرتا تھا۔

عدل و انصاف

شہنشاہ جہاں گیر کے پوتے اورنگ زیب عالم گیر کی ذات میں عدل و انصاف اور معدلت گستری کی خصوصیات بڑی نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس کے عہدِ حکومت کا یہ روشن کارنامہ ہے، جس میں اپنے بیگانے، غریب و امیر اور دوست و دشمن سب ایک ہی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا ذکر وہ خود ایک خط میں کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ معاملاتِ انصاف میں شاہ زادوں کو رعایا کے عام آدمیوں کے برابر سمجھتا ہوں۔

لین پول اورنگ زیب کے انصاف کی بڑی تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ مغلِ عظم عدل کا دریائے اعظم ہے۔ اس سلسلے میں اس کی نظر بڑی ہمہ گیر ہے، کوئی شخص اس کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ شہنشاہ کے حضور سفارش اور منصب و امارت کی کوئی پیش نہیں جاتی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی بھی وہ اس مستعدی اور توجہ سے بات سنتا ہے، جس طرح کہ بڑے سے بڑے حاکم اور امیر کی۔

اس کے عدل و انصاف کے بہت سے واقعات میں سے یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ مرزا کام بخش، عالم گیر کا نہایت چہیتا بیٹا تھا۔ اس کے رضاعی بھائی پر قتل کا الزام عائد ہوا۔ عالم گیر نے عدالت میں تحقیقات کا حکم دیا۔ کام بخش نے بھائی کی حمایت کی۔ بادشاہ کے علم میں یہ بات آئی تو اس نے کام بخش کو دربار میں طلب کیا۔ کام بخش اپنے اس رضاعی بھائی کو بھی دربارِ شاہی میں ساتھ لے گیا، کیوں کہ وہ اس کو اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ رضاعی بھائی کے ساتھ کام بخش کو بھی قید کر دیا جائے۔ چنانچہ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی اور دونوں کو جیل بھیج دیا گیا۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شہنشاہ اورنگ زیب انتہائی نرم خو اور کشادہ دل

تھا۔ دیوانِ عدالت میں ہر فریادی کو آنے اور اپنا مدعا پیش کرنے کی اجازت تھی۔ وہ ہر شخص کی فریاد نہایت اطمینان اور غور سے سنتا۔ بعض لوگ اپنا مدعا بیان کرنے اور مطالبات پیش کرنے میں تیز کلامی اور مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتے، لیکن عالم گیر کی پیشانی پر کبھی شکن نہ پڑتی، نہ زبان سے کسی قسم کی خفگی کا اظہار ہوتا۔ بعض درباریوں اور مصاحبوں نے عرض بھی کیا کہ مستغیث جسارت اور عجلت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کی انھیں اجازت نہیں دینی چاہیے۔ بادشاہ جواب دیتا کہ تلخ کلمات سننے سے ہمارے ملکۂ تحمل کو تقویت پہنچتی ہے۔

خبر رسانی کا اہتمام

آج سے ساڑھے تین چار سو سال پہلے کے برصغیر پاک و ہند کے بلاد و امصار دُور دراز فاصلوں پر واقع تھے اور آبادی کا سلسلہ وہ نہ تھا جو آج نظر آرہا ہے۔ اس میں خبر رسانی اور مخابرت کے ذرائع بہت محدود تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے اس شعبے کو بڑی وسعت دی، اس نے ملک کے حالات سے باخبر اور رعایا کے معاملات سے مطلع رہنے کے لیے واقعہ نگاری اور پرچہ نویسی کے محکمے کو اس دَور کی صورتِ حال کے مطابق انتہائی ترقی کی منزل میں پہنچا دیا۔ بلاشبہ اس محکمے میں دیانت دار افراد کی ضرورت ہے، راشی اور خود غرض لوگ ملک کی بربادی اور حکومت کی تباہی کا موجب ہو سکتے ہیں، لیکن اورنگ زیب چوں کہ اس خطرے سے خوب آگاہ تھا، اس لیے اس نے اس کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی بے حد نگرانی کی اور نہایت احتیاط سے کام لیا۔ وہ کمال حکمتِ عملی سے وقائع نگاروں کو ہدایات دیتا اور اپنی گرفت میں رکھتا تھا۔

پرچہ نویسی اور مخابرت کے عمدہ انتظام کی وجہ سے اس وسیع برصغیر کے ہر حصے اور ہر گوشے کی تمام خبریں باقاعدہ بادشاہ کو پہنچتی تھیں۔ وقائع نگار بادشاہ کو تمام حالاتِ ملک سے باخبر رکھتے تھے اور بادشاہ لوگوں کی فلاح و بہبود اور ملک کی ترقی کو پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے شاہ زادوں، عاملوں، صوبے داروں اور مختلف محکموں کے سربراہوں کی غلطیوں کی نشان دہی کرتا اور واقعہ نگار کے حوالے سے حالات کی اصلاح کی طرف انھیں توجہ دلاتا تھا۔ اس کا نظامِ مخابرت اس درجے حیرت انگیز طور پر وسیع تھا کہ اگر طویل طویل فاصلے پر بھی کسی سوداگر یا راہ گزر

کی کوئی چیز ضائع ہو جاتی تو اس کی اطلاع ممکن عجلت سے بادشاہ کو پہنچ جاتی اور وہ وہاں کے عامل یا حاکم سے سخت باز پرس کرتا۔

رعایا کے کوائف سے بادشاہ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اس کی نظر عمیق ہر چھوٹے بڑے واقعہ پر حاوی تھی۔ نہ کوئی بظاہر معمولی واقعہ اس کی نگاہِ تیز سے اوجھل تھا اور نہ کوئی بڑا اور اہم معاملہ اس کے علم و آگاہی سے مخفی — وہ اپنی عظیم مملکت کی ہر بات سے باخبر رہتا اور کامل غور و فکر کے بعد اس کے بارے میں مناسب ہدایات و احکام جاری کرتا۔

بادشاہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا حق

دنیا کے بادشاہوں کی طویل قطار پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اس گروہ میں عالمگیر وہ تنہا بادشاہ ہے، جس نے اپنی مملکت میں یہ حکم جاری کیا کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ بادشاہ کی طرف سے کسی معاملے میں حق تلفی ہوئی ہے یا بادشاہ نے غیر شرعی اقدام کیا ہے تو وہ بلا تامل عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ اس کو بادشاہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ پھر اس نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ رعایا کے نادار اور غریب لوگوں میں مراحلِ تحقیق کے مصارف ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہوتی، اس لیے شرعی وکیل مقرر کر دیے جائیں جو اس قسم کے مقدمات کی تحقیق میں ان کی پوری مدد کریں — بہ الفاظِ واضح بادشاہ پر یہ نالش کا حق تھا جو اس نے ملک کی رعایا کے ہر فرد کو دے دیا تھا۔

چاندی کے بجائے چینی کی دوات

اورنگ زیب نے حتی الامکان احکامِ اسلام سے ہم آہنگ ہو کر حکمرانی کے فرائض انجام دیے۔ اس نے غیر شرعی لباس کی ممانعت کر دی اور سلطنت کے تمام تکلفات کو ترک کر دیا۔ اس سے پہلے بادشاہ چاندی کی دوات استعمال کرتے تھے، اس نے چاندی کی دوات کے بجائے چینی کی دوات لانے کا حکم دیا۔ انعام کی رقمیں بھی چاندی کی سینیوں میں رکھ کر پیش کی جاتی تھیں، اس نے ڈھال میں رکھ کر لانے کا حکم جاری کیا۔ ہندوستان کے اس خوش خصال بادشاہ نے زربفت وغیرہ کے خلعت بھی بند کر دیے۔

جیبِ خاص کے مصارف میں کمی

سابق بادشاہوں کے زمانے میں بادشاہ کی جیب خرچ کے لیے کروڑوں روپے کی آمدنی کے علاقے مخصوص ہوتے تھے، جن سے بادشاہ کے ذاتی مصارف ادا ہوتے تھے۔ عالم گیر نے یہ سلسلہ ختم کر کے چند گاؤں اور چند نمک سار اپنے مصارف کے لیے مخصوص کر لیے تھے۔ باقی تمام علاقے اور مال و اسباب کو بیت المال کی ملکیت قرار دے دیا تھا۔

عالم گیر کی زندگی کا اسلوب بالکل سادا اور زاہدانہ تھا۔ ایک یورپین سیاح نے ۱۶۶۵ء میں اس کو دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اورنگ زیب بہت نحیف و نزار ہو گیا تھا، اور اس کی کمزوری میں اس کی روزہ داری نے اور اضافہ کر دیا تھا[۲۷]۔

عالم گیر کی جیب خاص کے مصارف میں یہ حیرت انگیز کمی اور اکل و شرب اور رہن سہن کا یہ انداز اس کی اتباعِ شریعت کا بیّن ثبوت ہے۔

ملکی آمدنی میں اضافہ

عالم گیر نے بہت سے ان ٹیکسوں کو جو پہلے سے چلے آ رہے تھے، رعایا پر ناروا بوجھ اور شرعی طور پر ناجائز قرار دے کر منسوخ کر دیا تھا۔ لیکن اس نے مال گزاری کا کچھ ایسا عمدہ نظام مرتب کیا اور بندوبستِ اراضی میں کچھ ایسی بہترین ترامیم اور اصلاحات جاری کیں کہ محاصلِ سلطنت میں پہلے سے کئی گنا زیادہ اضافہ ہو گیا۔ مثلاً اکبر کے زمانے میں ایک کروڑ نوے لاکھ پونڈ اور شاہ جہان کے زمانے میں دو کروڑ ستائیس لاکھ پچاس ہزار پونڈ وصول ہوتے تھے، مگر عالم گیر کے عہد میں یہ آمدنی بڑھ کر چار کروڑ پونڈ تک پہنچ گئی۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ عالم گیر کے دورِ حکومت میں کئی نئے علاقے فتح کر کے حدودِ مغلیہ میں شامل کر لیے گئے تھے، مثلاً حیدر آباد، بیجاپور، آسام، چاٹ گام اور تبت کے علاقے زیرِ نگین ہوئے، لہٰذا محاصلِ سلطنت میں اضافہ ضروری تھا۔

جواب یہ ہے کہ ان تمام مفتوحہ ملکوں کی آمدنی دس بارہ کروڑ روپے سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ اضافہ صرف عالم گیر کے اصلاحی اقدام اور بندوبستِ

---

۲۷ اورنگ زیب عالم گیر پر یک نظر: ص ۱۱۶

اراضی کی عمدگی کے باعث ہوا۔

مسلسل جدوجہد

اورنگ زیب کی زندگی مسلسل جدوجہد اور پیہم تگ و تاز کا نام ہے۔ وہ عمر کے آخری دور میں بھی گھوڑے کی پیٹھ پر رہا اور ہتھیار کھول کر اطمینان سے نہیں بیٹھا۔ مملکت کا استحکام، فتنہ و فساد کا سدِّباب، ملک کا امن و امان، رعایا کی فلاح و بہبود اور باشندگانِ سلطنت کی خوش حالی اس کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اسی مقصد کی تکمیل اور اسی فرض کی انجام دہی کے لیے وہ عساکرِ شاہی کی قیادت کرتے ہوئے عمر بھر پہاڑوں اور جنگلوں میں پھرتا اور ندی نالوں کو عبور کرتا رہا۔ اتنے بڑے ملک کا وہ شہنشاہ ایسے ایسے مقامات میں گیا جہاں کسی ادنیٰ حکمران نے بھی حالتِ امن میں قدم نہ رکھا ہوگا۔ بلند و بالا محلات و قصور کے اس مالک نے گرمیاں، سردیاں اور برساتیں کپڑے کے نازک خیموں میں گزار دیں۔ اس سراپا جہاد اور پیکرِ سعی و ہمت کو گرد و غبار سے اَٹے ہوئے خیمے سب سے زیادہ عزیز تھے۔ فتح و کامرانی کا مژدہ آتا تو سرگرانِ اظہارِ فخر نہ کرتا بلکہ بلاتوقف بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہو جاتا۔ امرائے مملکت اور حاکمانِ فوج ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے لیے حاضرِ خدمت ہوتے تو چہرے پر کبھی فاتحانہ تمکنت نمایاں نہ ہوتی۔ اگر کسی طرف سے ناخوش گوار اطلاع آتی تو بھی چہرہ غم و اندوہ کی کیفیت سے آشنا نہ ہوتا۔ صبر و سکون اور ضبط و ثبات اس کا سرمایۂ حیات تھا اور اپنے اوقاتِ شب و روز کو فرائض و واجبات کے ایک خاص سلسلے میں باندھ رکھا تھا۔

ادبیت اور حسنِ بیان

اورنگ زیب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس کے رقعات اس کے شاہد ہیں جنھیں ادبیت اور حسنِ بیان کا بے مثال مرقع کہنا چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے جملے نہایت بصیرت افروز اور پند و نصائح کا دل آویز مجموعہ ہیں۔ مناسب موقع پر قرآن کی آیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور مختلف شعرا کے اشعار بڑی خوب صورتی اور عمدگی سے درج کرتا ہے۔ قدیم و جدید شعرا کے بے شمار شعر اس کے حافظے میں محفوظ تھے۔ خود بھی شاعر تھا۔ یہ رباعی اسی کی ہے

دیروز ہوائے گلاب می گردیدم　　پژمردہ گلے بہ سرِ آتش دیدم

گفتم کہ چہ کردہ ای کہ مے سوزندت گفتا کہ دریں دو سے خندیدم

اورنگ زیب کی شعر و شاعری سے دلچسپی اور ادبیت کے سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ زندگی کے آخری دور (۱۷۰۵ء) میں دکن کی متواتر و مسلسل مہموں میں وہ بیمار ہوگیا، عمر کم و بیش نوّے سال کو پہنچ گئی تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی تمام مشاغل حکمرانی بہ دستور جاری تھے۔ اس زمانے میں میر عبدالکریم جس کو امیر خاں کا خطاب عطا ہوا تھا، بادشاہ کا مقرب اور محرمِ خاص بن گیا تھا، وہ بیان کرتا ہے کہ اس بیماری کے دنوں میں ایک روز میں پلنگ کے قریب گیا تو بادشاہ سلامت پر ضعف و نقاہت کا غلبہ تھا اور آہستہ آہستہ یہ شعر پڑھ رہا تھا:

بہ ہشتاد و نود چوں در رسیدی بسا سختی کہ از دوراں کشیدی
وزانجا چوں بہ صد منزل رسانی بود مرگے بہ صورتِ زندگانی

میر خاں کہتا ہے، یہ شعر سُن کر میں نے عرض کیا، حضرت سلامت! شیخ نظامی گنجوی نے یہ شعر اس بیت کی تمہید میں کہے ہیں:

پس آں بہ کہ خود را شاد داری دراں شادی خدا را یاد داری

یہ بیت سنا تو فرمایا۔ پھر پڑھو۔ کئی مرتبہ پڑھوا کر کہا، لکھ دو۔ اگلی صبح بادشاہ سلامت کی بیماری ختم ہو چکی تھی۔ وہ صحت یاب ہو کر دیوانِ مظالم میں آ بیٹھے اور فرمایا۔ تمہارے شعر نے ہمیں صحتِ کامل کی منزل میں پہنچا دیا اور جانِ ناتواں میں دوبارہ طاقت آ گئی۔

اس شعر میں خدا کو یاد رکھنے اور خوش رہنے کی تلقین ہے اور یہی تلقین اس نیک دل اور دین دار بادشاہ کے لیے دستاویزِ صحت بن گئی۔

عبادت گزاری اور شریعت کی پاس داری

لین پول کے بقول "مغلوں کی تاریخ میں عالم گیر سب سے پہلا بادشاہ تھا جو پکا مسلمان تھا۔ ممنوعات و مکروہات سے خود بھی پرہیز کرتا اور دوسروں کو بھی اس سے روکتا تھا"۔——
عبادت گزاری، عدل گستری، شریعت کی پاس داری، اصابت رائے اور شجاعت میں کوئی بادشاہ اس کی مثیل نہ تھا۔ قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں یہ خالص اسلامی

حکومت قائم کرنے کا خواہاں تھا اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا، لیکن انتظامی معاملات کی پیچیدگیوں اور مختلف حریف طاقتوں کی بے جا مداخلتوں نے اس کا پورا موقع فراہم نہ ہونے دیا۔

اورنگ زیب نے لمبی عمر پائی مگر اللہ نے ہر قسم کی سنگین بیماریوں سے محفوظ رکھا اور حواسِ خمسہ میں باقاعدہ اعتدال قائم رہا۔ ایک روایت کے مطابق سماعت میں کسی قدر خلل آ گیا تھا، مگر اس کا بھی کسی کو احساس نہ ہوتا تھا۔

دورِ آخر کا ایک رقت انگیز واقعہ

مبارک اللہ واضح نے جو ارادت خاں کے خطاب سے سرفراز تھا، اپنے تذکرے میں عالم گیر کے دورِ آخر کے بعض واقعات قلم بند کیے ہیں۔ اس کے حوالے سے مولانا غلام رسول مہر نے ایک نہایت رقت انگیز واقعہ نقل کیا ہے، جو درج ذیل ہے:

شہنشاہ اورنگ زیب کے انتقال سے ایک سال اور چند ماہ پیشتر ارادت خاں منڈو و مالوا کا قلعہ دار اور فوج دار مقرر ہوا تھا۔ رخصتی ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو بادشاہ نے خود خواب گاہ کا پردہ ہٹا کر اسے اندر بلا لیا اور فرمایا:

"اب ہمارے اور تمہارے درمیان جدائی ہے۔ ملاقات کہاں ہو گی۔ تمہارے متعلق ہم سے دانستہ یا نادانستہ کوئی نامناسب امر پیش آیا تو اسے معاف کر دو اور تین مرتبہ کہو، "معاف کیا"۔ اسی طرح تم نے ہماری بہت خدمت کی ہے، اگر دانستہ یا نادانستہ تم سے کوئی تقصیر ہو گئی ہو گی تو ہم بھی اسے معاف کرتے ہیں۔"

ارادت خاں کہتا ہے کہ شہنشاہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر شدتِ گریہ گلوگیر ہو گئی اور میرے حلق سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ تاہم حضرت کے انتہائی اصرار پر میں نے حالتِ گریہ ہی میں تین مرتبہ "معاف کیا"، کہا۔ خود شہنشاہ بھی آب دیدہ ہو گیا اور دعائے خیر کے بعد مجھے رخصت کیا۔[۲۸]

آخری دور اور تجہیز و تکفین کی وصیتیں

جنوری ۱۷۰۶ء میں اورنگ زیب احمد نگر پہنچ گیا تھا، جسے وہ اپنی آخری منزل بتاتا تھا۔

---

۲۸ ماہ نامہ "المعارف" (لاہور) بابت ماہ مارچ ۶۸ء

شہر سے دو میل باہر خیمہ نصب تھا۔ یہ اس کی حیاتِ مستعار کا آخری سال تھا۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ آخری ایّامِ زندگی میں شاہ زادہ کام بخش اور شاہ زادہ محمد اعظم بھی احمد نگر میں باپ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ کام بخش کو اس نے بیجاپور کا والی مقرر کرکے بھیجا اور محمد اعظم کو اس کے اپنے صوبے میں جانے کا حکم دیا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد بخار نے شدت اختیار کرلی۔ تاہم عالم گیر تین چار روز تک باقاعدہ نماز باجماعت ادا کرتا رہا۔ اس ثنا میں حمید الدین خاں نے نجومیوں کی تجویز کے مطابق عرض داشت پیش کی کہ اس موقع پر ایک ہاتھی اور ایک بیش قیمت دانۂ الماس بطور تصدق دینا چاہیے۔ صاحبِ تقویٰ بادشاہ نے اس عرض داشت پر تحریر کیا کہ ہاتھی تصدق کرنا ستارہ پرست ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ الماس اور ہاتھی تصدق کرنے کے بجائے چار ہزار روپے مستحقین میں تقسیم کرنے کے لیے قاضی القضاۃ کو دیے جائیں۔ ساتھ ہی بہ صورت وصیّت لکھا کہ:

۱۔ وفات کے بعد اس خاک سار کو جلد سپردِ خاک کر دیں، تابوت کے تکلف میں نہ پڑیں۔

۲۔ ٹوپیاں سینے کی اُجرت سے چار روپے دو آنے علیٰی بیگ محل دار کے پاس موجود ہیں، ان سے کفن خریدا جائے۔

۳۔ تین سو پانچ روپے کتابتِ قرآن کی اُجرت کے ہیں، وہ میری موت پر فقرا و مساکین میں بانٹ دیے جائیں۔

۴۔ میرا سر ننگا رکھا جائے، اس لیے کہ خدا کی بارگاہِ جلال میں ننگے سر جانے سے امید ہے کہ رحم و کرم کا مستحق ٹھہروں گا۔

وفات

شہنشاہ اورنگ زیب کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کاش اس کی وفات جمعہ کے روز ہو۔ جو شخص جمعہ کے دن فوت ہوتا اس پر بادشاہ رشک کرتا۔ ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو جمعہ کا دن تھا۔ فجر کی نماز جماعت کے ساتھ بیٹھ کر پڑھی۔ نماز فجر کے بعد حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ کاش یومِ رحلت جمعہ ہو۔ اشراق کی نماز بھی ... کر ... بادشاہ غسل خانے میں گیا۔ غسل خانے سے پلنگ پر آیا۔ ہمیشہ باوضو رہتا اس

کا معمول تھا۔ اگر کسی وجہ سے فوری طور پر پانی میسر نہ ہوتا تو پانی آنے تک تیمم کر لینا۔ پلنگ پر آنے کے بعد تیمم کے لیے ابھی پہلی ضرب لگا کر چہرے پر ہاتھ پھیرے تھے کہ روح تنگ نائے بدن سے نکل کر اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔ مبارک اللہ واضح کے بقول اس کے بعد بھی انگشت ہائے مبارک ایک ساعت تک معمول کے مطابق عقد انامل میں مصروف رہیں۔

احمد نگر آنے کے ایک سال، ایک مہینہ اور چند روز بعد وفات پائی۔

خُلد آباد میں تدفین

شاہ زادہ محمد اعظم باپ کی وفات کی خبر سنتے ہی راستے سے لوٹ کر احمد نگر پہنچ گیا اور انتہائی حزن و ملال اور سوز و محبت کے ساتھ والد کا نام لے لے کر روتا رہا۔ اپنی بہن زینت النسا بیگم اور دوسری خواتین کو تسلی دی اور صبر کی تلقین کی۔ وصیت کے مطابق جنازہ تیار کرایا۔ تھوڑی دور تک کندھا دیا۔ پھر جنازہ تدفین کے لیے شیخ زین العابدین کے مرقد کے قریب بھیج دیا۔ وفات کے بعد عالم گیر کا لقب "خلد مکان" قرار پایا۔ جہاں شہنشاہ کو دفن کیا گیا، وہ مقام "روضہ خلد آباد" کے نام سے موسوم ہے۔

ہندوستان کے اس عدیم المثال شہنشاہ نے اکانوے (۹۱) سال تیرہ دن عمر پائی اور پچاس (۵۰) سال دو ماہ اور ستائیس دن حکومت کی۔ احمد نگر میں انتقال کیا اور اورنگ آباد سے بارہ کوس کے فاصلے پر "روضہ خلد آباد" میں دفن ہوا۔ وصیت کے مطابق اس کی تجہیز و تکفین نہایت سادا طریقے سے ہوئی۔ اس کی قبر پر بھی کوئی عالی شان عمارت نہیں ہے۔

یہاں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں۔

ایک یہ کہ عالم گیر کی تاریخِ ولادت "آفتاب عالم تاب" کے لفظ سے نکلی تھی۔ جس تاریخ کو اس پر چترِ شاہی سایہ فگن ہوا، وہ اس نے خود "آفتاب عالم تابم" سے نکالی اور تاریخِ وفات میر سید عبدالجلیل بلگرامی نے "فی آفتاب عالم تاب" سے نکالی۔ یعنی آفتاب عالم تاب کا زوال ــــ "آفتاب" اور "عالم تاب" کے الفاظ کو عالم گیر سے خاص مناسبت رہی۔

دوسرے یہ کہ ماہِ ذی قعدہ کو بھی عالم گیر کے بارے میں ایک خصوصیت حاصل ہو گئی۔ وہ اسی مہینے میں ۱۵ ذی قعدہ ۱۰۲۷ھ (۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء) کو پیدا ہوا۔ غرہ ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ

(۲۳ جولائی ۱۶۵۸ء) کو باغ اغر آباد (دہلی) میں جو بعد میں شالا مار باغ کہلایا، تختِ حکومت پر بیٹھا، جمعہ کا دن تھا۔ اسی مہینے میں ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو جمعہ کے دن فوت ہوا۔

لیکن ایک بات

گزشتہ سطور میں اورنگ زیب عالم گیر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی اختصار کے ساتھ نشان دہی کر دی گئی ہے جس سے اس کے شب و روز کے متعدد گوشے نکھر کر قلب و نظر کے زاویوں میں آجاتے ہیں۔ بے شک وہ نہایت عاقل و فہیم، مردم شناس، کشور کشا، جرأت مند اور عابد و متدین حکمران تھا۔ زبردست منتظم اور مملکت کے تمام نشیب و فراز پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک اور انتہائی بردبار اور حلیم الطبع تھا۔ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علومِ مروجہ کا عالم تھا اور اپنے دور کے علما و فقہا اور مشائخ و صوفیا کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھتا اور ان سے مستفید و مستفیض ہوتا تھا۔ متبع سنت اور حامیِ دینِ متین تھا — لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ انسان تھا اور اس کے ساتھ ہی پہلے شاہ زادہ اور پھر شہنشاہ تھا — معصوم ہر گز نہ تھا۔ غلطیاں اس سے بھی سرزد ہو سکتی تھیں اور ہوئیں۔

اس نے باپ کو نظر بند اور بھائیوں کو قتل کر کے تاجِ شاہی سر پر سجایا تھا۔ اس کی وجہِ جواز بھی پیش کی جا سکتی ہے اور دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جن حالات سے اسے دوچار کر دیا گیا تھا، ان کا تقاضا یہی تھا کہ وہ وہی قدم اٹھاتا جو اس نے اٹھایا، وہ اس میں حق بہ جانب تھا اور اسے یہی کچھ کرنا چاہیے تھا۔ خود اس کے خلاف بھی تو باپ اور بھائیوں کی طرف سے یہی کچھ کیا گیا تھا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ کامیاب ہو گیا اور باپ اور بھائی اپنے تمام منصوبوں میں ناکام رہے — مگر یہ بات ایک عام آدمی کی سمجھ سے بالا ہے کہ جب بھائی قتل ہو گئے اور خاندان میں کوئی اس کا حریف اور مدعیِ سلطنت باقی نہ رہا تو باپ کو نظر بند رکھنے کی آخر کیا وجہ تھی؟ اس کا باپ شاہ جہان بھی بہت منتظم، مصلح، قاطعِ بدعت، متبع سنت اور علما و مشائخ کا عقیدت مند تھا۔ ایامِ نظر بندی میں بہ ظاہر کوئی لائقِ اعتراض امر اس میں باقی نہ رہا تھا،

وہ حکومت سے معزول ہونے کے بعد آٹھ سال زندہ رہا اور اس تمام عرصے میں عظیم القدر باپ کو بیٹے نے نظر بند ہی رکھا۔ موت بھی اسی حالت میں آئی ــــ عالم گیر کے بھائی واقعی امورِ سلطنت چلانے کے اہل نہ تھے، لیکن ان کو راستے سے ہٹانے کے بعد باپ کو بہ دستور محبوس رکھنا معلوم نہیں کیوں ضروری سمجھا گیا۔ اگر اسے رہا کر دیا جاتا تو یہ عالم گیر کا کوئی غیر سیاسی یا غیر مدبرانہ فعل متصور نہ ہوتا۔ ہمیں مان لینا چاہیے کہ عالم گیر کا یہ فعل اس کے تدین و تقویٰ سے ہم آہنگ اور احترامِ والد سے ہم رنگ نہ تھا۔

اگرچہ شاہ جہان کو قلعے میں تمام سہولتیں میسّر تھیں، تاہم وہ محبوس تھا۔ آٹھ سال کے طویل عرصے میں نہ کبھی وہ خود قلعے سے باہر نکلا اور نہ اُسے نکالا گیا۔ اس کو موت نے رہائی دلائی اور اس کا جنازہ ہی باہر آیا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جنازہ بھی غیر معروف راستے سے رازداری کے ساتھ باہر لایا گیا۔

بہر حال یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ بادشاہوں کی تاریخ ہمیشہ اسی ڈگر پر چلتی رہی ہے۔ وہ جو کچھ کرتے تھے اپنی صواب دید کے مطابق کرتے تھے۔ ان کے سامنے ملک کے استحکام کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کا استحکام بھی ہوتا تھا۔ اس میں نہ باپ بیٹے کو معاف کرتا تھا اور نہ بیٹا باپ کی پروا کرتا تھا۔ اس کو ہم واقعات کے بہاؤ کے فطری نتائج یا تاریخ کے خطرناک موڑ سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور تاریخ کے خونی پہیے ہمیشہ گردش میں رہتے ہیں۔ انھیں کوئی طاقت کبھی روک نہیں سکتی۔ ان کا معاملہ اب اللہ کے ساتھ ہے اور وہ غفور رحیم ہے ــــ ہماری نقد و جرح یا تنقید و تعریف ان واقعات و حوادث کو ہرگز متاثر نہیں کر سکتی جو تاریخ کے سینے میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو چکے ہیں۔

اورنگ زیب کے بعد

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر دودمانِ مغلیہ کا قابلِ فخر اور لائقِ صد ستائش فرزند تھا۔ یہ ہندوستان کا وہ حکمران تھا، جس نے اس وسیع ملک کی سرحدوں کو مزید ہم کنارِ وسعت کیا اور اس کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں۔ وہ خلیفہ نہ تھا لیکن اس کے جذبۂ دینی کی داد دینی چاہیے کہ نظامِ مملکت کو ہم دوشِ خلافت کرنے کے لیے سرگرم کوشاں رہا۔ وہ اسلام کا مبلغ اور دین کا داعی تھا۔ اس نے اپنے پیشروؤں کی ان تمام رسوم و عوائد کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا تھا جو احکامِ شرع سے مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ اس کی ذاتی زندگی ایک درویش کا پیکرِ حسین تھی۔ اس کے کارنامے تاریخِ ہند کا ایک زریں باب بن گئے ہیں۔ اس کے اصولِ حکمرانی روشنی

کا مینار تھے۔ لیکن افسوس ہے، اس کے نا اہل اخلاف نے ان کی پاسبانی نہ کی اور بے رحم مورخوں کو اپنے لائق اسلاف پر طعنہ زن ہونے کے مواقع بہم پہنچائے۔ ملک میں ہنگامہ آرائی کی ایسی فضا پیدا کر دی جو قتل و غارت پر منتج ہوئی اور پھر بابر کا یہ مفتوحہ ملک نہایت ذلت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اورنگ زیب کی وفات کے وقت اس کے تین بیٹے زندہ تھے۔ سب سے بڑا محمد معظم، اس سے چھوٹا محمد اعظم اور سب سے چھوٹا کام بخش ——! باپ نے زندگی کے آخری دنوں میں وصیت کے ذریعے سے سلطنتِ ہند ان تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی۔ بڑا لڑکا محمد معظم جو باپ کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کے لقب سے بادشاہ ہوا، اس وصیت پر عمل کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کا بھائی محمد اعظم اس کے لیے تیار نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں محمد اعظم اور اس کے دو لائق بیٹے بیدار بخت اور والاجاہ مارے گئے ——
محمد معظم سب سے چھوٹے بھائی کام بخش کو بھی باپ کی وصیت کے مطابق اس کا علاقہ دینے پر آمادہ تھا، بلکہ کچھ زیادہ بھی دینے پر رضامند تھا، مگر بدقسمتی سے اس نے بھی یہ بات منظور نہ کی۔ بالآخر معرکۂ کارزار گرم ہوا اور کام بخش شدید زخم کھانے کے بعد وفات پا گیا۔

آگے چل کر مغل بادشاہوں میں تخت نشینی کے مسئلے پر پیہم خون ریزیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، بہت سے قابل امرائے سلطنت مارے گئے اور رفتہ رفتہ ملک کے نظم و نسق کے تمام رشتے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے

اگر اللہ نے توفیق مرحمت فرمائی اور حالات سازگار رہے تو اس کی مناسب تفصیلات جو بڑی دردناک اور الم انگیز ہیں، فقہائے ہند کی جلد پنجم کے حصہ دوم کے مقدمے میں بیان کی جائیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللّٰھم وفقنا لما تحب و ترضیٰ۔

بندۂ عاجز
محمد اسحاق بھٹی

۲۲ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۹ھ —— ۱۹ مئی ۱۹۷۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بارھویں صدی ہجری

الف

۱- سید آل محمدؒ بلگرامی

سید آل محمد بن برکت اللہ حسینی واسطی بلگرامی ثم مارہروی، "سبع سنابل" کے فاضل مصنف شیخ عبدالواحد بلگرامی (متوفی ۳ رمضان المبارک ۱۰۱۷ھ) کی نسل سے تھے۔ پنجشنبہ کے روز ۱۹ رمضان ۱۱۱۱ھ کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی سید برکت اللہ بلگرامی مارہروی (متوفی ۱۰ محرم ۱۱۴۲ھ) "صاحب البرکات" کے لقب سے ملقب تھے، بہت نیک اور عالم وفاضل بزرگ تھے۔ لائق بیٹے نے پدر بزرگوار سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ ان کے سایۂ عاطفت میں تربیتِ باطنی کی بہت سی منزلیں طے کیں اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ والد کی وفات کے بعد اپنے آبائے کرام کے سجادۂ خلافت پر متمکن ہوئے۔ اتباعِ شریعتِ مطہرہ میں نہایت راسخ اور عمل وعقیدہ میں بدرجہ غایت پابند سنتِ محمدیہ (علیہ الف الف تحیہ وسلام) تھے۔ ہمیشہ کتبِ حقائق وتصوف کے مطالعہ میں مصروف رہتے اور اپنے وقت کا کوئی لمحہ غیر دینی کاموں میں صرف نہ کرتے۔ ان کے والد محترم سید برکت اللہ بلگرامی نے تصوف ومعرفت پر جو کتابیں تصنیف کی تھیں، ان کا مطالعہ خصوصیت سے کرتے۔ ازالۂ امراضِ قلبی میں مسیحا کی حیثیت رکھتے تھے اور سرگشتگانِ وادیٔ شوق سے انتہائی نرمی اور لینت سے بات کرتے۔ ہندوستان کے شہر مارہرہ میں سکونت پذیر تھے اور اس نواح کے اکثر

لوگوں کو ان کے کوسِ مشیخت نے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ حدودِ شریعت کے اس درجہ پاسبان تھے کہ اس جادۂ مستقیم سے کبھی اِدھر اُدھر قدم نہ رکھتے۔

برِّصغیر کے اس صوفی عالم و فقیہ نے ۱۵ رمضان المبارک ۱۱۶۴ھ کو مارہرہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ سید میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان اشعار میں تاریخ وفات نکالی ہے:

چراغ آلِ عبا شمع دودمانِ علا — فزود جلوۂ او رونقِ حریم بہشت
افادہ کرد بہ من سال رحلتش ہاتف — نصیب آل محمد بود نعیم بہشت[۱]
۱۱۶۴ھ

۲۔ سیّد آیت اللہ بریلوی

سید آیت اللہ حسنی نصیر آبادی ثم بریلوی، سید علم اللہ بریلوی (متوفی ۸ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ — ۲۶ اکتوبر ۱۶۸۵ء) کے فرزندِ کبیر تھے۔ بڑے نیک اور صالح عالمِ دین تھے، شجاع اور جواں مرد بھی تھے۔ علومِ دینیہ اور تحصیل فقہ کے لیے اپنے والدِ گرامی قدر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ حفظِ قرآن کی نعمت بھی حاصل کی۔ قرآنِ مجید سے انتہائی شغف تھا۔ ایک مرتبہ نصیر آباد گئے ہوئے تھے کہ ہلال رمضان طلوع ہوا۔ والدِ گرامی نے پیغام بھیجا کہ رائے بریلی آجائیں اور نمازِ تراویح میں قرآن سنائیں۔ نصیر آباد میں ان کے عمِّ محترم دیوان سید احمد فروکش تھے، انھوں نے اصرار کیا کہ جب تک ہمیں پورا قرآن نہ سناؤ گے، ہرگز رائے بریلی جانے نہ دوں گا۔ سید آیت اللہ نے پہلی ہی رات تراویح کی دو رکعتوں میں انتیس (۲۹) پارے ختم کر دیے اور باقی رکعتوں میں تیسواں پارہ تمام کر دیا۔ اس طرح عمِ محترم کی خواہش پوری کر کے یکم رمضان کو باپ کے حکم کی تعمیل میں رائے بریلی پہنچ گئے۔

آغازِ شباب میں جہاد کا بڑا شوق تھا۔ اسی جذبۂ شوق کے تحت چند اقربا کو ساتھ

---

[۱] مآثر الکرام، دفتر اوّل۔ ص ۱۱۳ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱

لے کرناظم گورکھ پور کے پاس ملازم ہوگئے تھے۔ ایک دفعہ ایک جاگیر دار کی سرکشی یہاں تک پہنچی کہ اس نے گورکھ پور پر حملہ کر دیا۔ جمعہ کا دن تھا، سید آیت اللہ نماز کے لیے مسجد جارہے تھے کہ ناظم گورکھ پور فوج لے کر اس سرکش جاگیر دار کے مقابلے کے لیے نکل پڑا۔ سید آیت اللہ نے فرمایا، پہلے جمعہ ادا کرلینا چاہیے، پھر لڑیں گے۔ ناظم بولا، جب تک آپ جمعہ سے فارغ ہوں گے، دشمن اپنا کام ختم کرکے چلتا بنے گا۔ آپ پیرزادہ ہیں، نماز ادا فرمائیں اور دعا کریں، ہم تو سب سے پہلے دشمن کا قلع قمع کریں گے۔

سید آیت اللہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، مسجد میں گئے اور اطمینان سے جمعہ پڑھا۔ پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر لڑائی کے لیے نکلے تو دیکھا کہ ناظم کا لشکر باغی جاگیر دار کے مقابلے میں شکست کھا کر پس پا ہوتا ہوا شہر کے قریب پہنچ گیا ہے۔ سید آیت اللہ نے لشکر کو روکا، اور جب دیکھا کہ یہ لوگ ہمت ہار چکے ہیں تو اپنی جماعت کو ساتھ لیا اور تلواریں سونت کر بجلی کی طرح دشمن کی صفوں میں جاگرے اور انھیں سراسیمہ وار بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس لڑائی میں سید ممدوح کے بہنوئی سید عبدالرحیم اور دو بھائی شریک تھے۔ سید عبدالرحیم نے اس معرکے میں جامِ شہادت نوش کیا۔

سید آیت اللہ بریلوی نے آخر عمر میں ناظم کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔

ایک دفعہ بعض خاندانی جھگڑوں کے فیصلے کے لیے سید آیت اللہ کو فرماں روائے ہند اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں دکن جانا پڑا۔ ایک بھائی، دو بیٹے اور چند خادم ساتھ تھے۔ امورِ متنازعہ فیہ کا فیصلہ کرا کے واپس آرہے تھے کہ راستے میں بیمار پڑ گئے، یکایک حالت غیر ہوگئی، استحضار کا وقت قریب آیا تو سورۂ زلزال پڑھی اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ رفقائے سفر نے خیال کیا کہ آرام فرمارہے ہیں۔ ایک امیر جو اُن کے والد سید علم اللہ بریلوی کا ارادت مند تھا، مزاج پرسی کے لیے آیا۔ کیفیت سنی تو کہنے لگا، سید صاحب تو ابدی نیند سو گئے ہیں۔ کپڑا منہ سے ہٹا کر دیکھا تو واقعی جان بحق ہو چکے تھے ــــ یہ ۱۲ رجب ۱۱۱۶ھ (۲۰ اکتوبر ۱۷۰۴ء) کا واقعہ ہے۔ غسل و تکفین کے بعد میت کو تابوت میں ڈال کر رائے بریلی پہنچایا گیا اور وہیں والد بزرگ وار کے پہلو میں

دفن ہوئے۔[۵۲]

سید آیت اللہ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ چوتھی پشت میں سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (شہادت ۲۴ ذی القعدہ، ۱۲۴۶ھ — ۶ مئی ۱۸۳۱ء) کے اجداد میں سے تھے۔

۳- مفتی ابو البرکات دہلوی

مفتی ابو البرکات کا سلسلۂ نسب یہ ہے: ابو البرکات بن حسام الدین بن سلطان بن ہاشم بن رکن الدین بن جمال الدین بن سمار الدین دہلوی۔ مفتی ممدوح کبار فقہائے حنفیہ اور دیارِ ہند کے جلیل القدر علما میں سے تھے۔ دار الحکومت دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور حصولِ علم کے بعد اسی شہر کی مسندِ افتا پر فائز ہوئے۔ پھر عہدِ عالم گیری میں منصبِ قضا پر مامور کیے گئے۔ "مجمع البرکات" کے نام سے ان کی ایک تصنیف بھی ہے جو مسائلِ فقہ کو محیط ہے اور دو ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب کا آغاز "الحمد للہ الذی نوّر قلوب الموحدین بنور التوحید و الایمان" کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ اس کا مقصدِ تصنیف، مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی فقہی روایات کو خاص ترتیب کے ساتھ یک جا کرنا ہے تاکہ لوگوں کو ان مسائل سے علم و آگاہی میں کوئی دقّت پیش نہ آئے اور وہ آسانی کے ساتھ صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ اس ضمن میں ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

لما کانت الروایات اشتاتا متفرقۃ جمعتہا جمعا لیسھل الوقوف بھا و رتبتہا لیتیسر الاطلاع علیہا فی ھذا المختصر۔

"مجمع البرکات" کی تصنیف سے وہ ۹ ذی الحجہ ۱۱۱۶ھ کو فارغ ہوئے۔

مفتی ابو البرکات دہلوی کو فقہ و اصول سے خاص لگاؤ تھا اور ان کا شمار اس علم کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ "فتاویٰ ہندیہ"[۵۳] (فتاویٰ عالم گیری)

---

۵۲ سید احمد شہید، ص ۴۷، ۴۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱، ۲

کے مرتبین کی جماعت میں شامل تھے[۵۳]

۴۔ قاضی ابو بکر مدراسی

قاضی ابوبکر مدراسی، شافعی المسلک تھے، اپنے عصر اور علاقے کے بہت بڑے شیخ اور نامور عالم اور فقیہ تھے۔ ان کی فراوانیٔ علم و فضل کی بنا پر نواب آصف جاہ نے ۱۱۵۷ھ میں انھیں بلادِ کرناٹک کا قاضی القضاۃ مقرر کر دیا تھا۔ "شمس پلی" میں نواب مذکور نے ان کو قطعہ زمین بھی عطا کر دیا تھا، جس سے انھیں بارہ ہزار روپے کی سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ نواب کے نزدیک وہ بڑی قدر و منزلت کے مالک تھے[۵۴]

۵۔ شیخ ابوالحسن ویلوری

شیخ ابوالحسن ویلوری کا نسب نامہ یہ ہے: ابوالحسن بن عبداللطیف بن ابوالحسن بن عبداللطیف بن ولی اللہ بن عبداللطیف بن محمد بن عبدالحق بن قطب الدین بن عبدالفتاح عسکری احمد آبادی گجراتی ثم ویلوری مدراسی ـــــ ۱۱۰۷ھ کو پیدا ہوئے۔ نہایت صالح عالمِ دین تھے۔ رفاہِ عامہ کے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ ویلور میں مسجد، سرائے اور مکان تعمیر کیا۔ فقہ و عقائد اور تصوف میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اس موضوع پر کتابیں بھی تصنیف کیں، لیکن ان کتابوں کے بارے میں پتا نہیں چل سکا کہ ان کے نام کیا تھے اور اب کہاں ہیں؟ فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔

۱۱۸۲ھ کو فوت ہوئے[۵۵]

---

۵۳ شمس التواریخ ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۴ ـــــ برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ، ص ۳۰۸، ۳۰۹

۵۴ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۵ بحوالہ اساسِ کرناٹک

۵۵ حدیقۃ المرام ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۵

۶- شیخ ابو الحسن سندھی کبیر

شیخ ابو الحسن نور الدین محمد بن عبد الهادی سندھی عالمِ کبیر، علامہ وقت اور امام فی العلوم تھے ۔ اصلاً سندھی تھے ، لیکن مدینہ منورہ میں سکونت گزین ہو گئے تھے ۔ اقلیمِ سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی ۔ پھر تستر چلے گئے ، وہاں کے علماو شیوخ کی ایک جماعت سے تحصیل کی اور حدیث و فقہ اور دیگر علوم کی تمام اصناف میں بلند مرتبے کو پہنچے ۔ تستر سے مدینہ منورہ کا عزم کیا، وہاں قیام پذیر ہوئے اور مختلف علما سے اخذِ علم کیا، جن میں شیخ محمد بن عبد الرسول برزنجی ، شیخ ابراہیم بن حسن کورانی مدنی اور دیگر مشائخ حجاز شامل ہیں ۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدینہ شریف میں خود مسندِ تدریس آراستہ کی اور فضل و ذکا اور صلاح و تقویٰ کے اونچے مقام سے سرفراز ہوئے ـــــ دورانِ تدریس میں کئی بہترین کتابیں بھی تصنیف فرمائیں، جن میں "الحواشی السنۃ علی الصحاح الستۃ" بالخصوص قابلِ ذکر ہے ۔ صحاح ستہ پر انھوں نے حواشی سپردِ قلم کیے ، البتہ جامع ترمذی کا حاشیہ مکمل نہیں کر پائے ۔ مسند امام احمد بن حنبل پر بھی نفیس اور مفید حاشیہ لکھا ۔ ابن ہمام کی فتح القدیر پر بھی کتاب النکاح تک حاشیہ تحریر کیا ۔ ابن قاسم کے "حاشیہ شرح جمع الجوامع" پر "الآیات البینات" کے نام سے حاشیہ سپردِ قلم کیا ۔ امام نبوی کی "اذکار" پر بھی حاشیہ قلم بند کیا ۔ اس کے علاوہ اور بھی مفید حواشی تحریر کیے ۔

شیخ ابو الحسن سندھی کبیر نے ۱۲ شوال ۱۱۳۸ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی ۔ ایک روایت کے مطابق ۱۱۳۶ھ کو فوت ہوئے ۔

مدینہ منورہ میں اس جلیل القدر عالم کی وفات پر بڑے حزن و ملال کا اظہار کیا گیا ، بے شمار لوگوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی ۔ خواتین نے بھی ان کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا اور گھروں سے جنازہ جاتے ہوئے دیکھا ۔ دکان داروں نے فرطِ غم سے دکانیں بند کر دیں ۔ حکومت کے ولات و عمال نے میت کو کندھا دیا ۔ میت کو مسجد نبوی میں لایا گیا ، وہیں

نمازِ جنازہ پڑھی اور پھر اس عظیم سندھی الاصل عالم کو جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ لوگوں نے ان کی وفات پر بڑے حزن و ملال کا اظہار کیا۔[۵۶]

۷۔ شیخ ابوالحسن سندھی صغیر

شیخ ابوالحسن بن محمد صادق سندھی صغیر، یہ صغیر کے نام سے اس لیے مشہور ہوئے کہ شیخ ابوالحسن نورالدین محمد کبیر کے نام سے التباس نہ ہو۔ اپنے دور کے امام، عالم، محدث اور شیخ تھے۔ ارضِ سندھ میں پیدا ہوئے اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور طویل عرصے تک ان سے اخذِ علم میں مصروف رہے۔ علوم سے فراغت کے بعد اسی سرزمین میں خود سرگرم تدریس ہوئے۔ ان کے عصر میں کثرتِ درس وافادہ میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ متعدد عمدہ کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جن میں شرح جامع الاصول اور مختار الاطوار فی الموار المختار لائق تذکرہ ہیں۔ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۸۷ھ کو مدینہ منورہ میں فوت ہوئے۔[۵۷]

۸۔ مولانا ابوالحسن کشمیری

مولانا ابوالحسن کشمیری علامۂ وقت اور فاضلِ کبیر تھے، اپنے علاقے کے مشہور شیخ تھے، حنفی المسلک تھے اور شاہم بابا کے عُرف سے معروف تھے۔ فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ استحضارِ مسائل اور جزئیاتِ فقہ پر عبور میں اپنے تمام معاصرین سے فائق تر تھے۔ حلاوتِ کلام اور عذوبتِ لسان میں نہایت شہرت کے حامل تھے۔ حفظ و ادراک اور اخذِ علوم میں اس نواح میں کوئی ان کا مدِّ مقابل نہ

---

۵۶ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۵، ۶۔ بحوالہ سلک الدرر و تاریخ الجرتی

۵۷ تحفۃ الکرام، ص ۱۲۷ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۵

تھا، تفسیر بیضاوی اور تعلیقات العصام کی عبارتوں کی عبارتیں مستحضر تھیں، علمائے عصر سے مناظرہ و مباحثہ کے وقت قرآنِ مجید کی آیات کثرت سے پڑھتے۔ تفسیر بیضاوی اور دیگر کتبِ درسیہ پر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے جو تعلیقات سپردِ قلم کی ہیں، ان کو ہدفِ تنقید ٹھہراتے، ان کی علمی اور فنی غلطیاں نکالتے اور پورے علمی اعتماد اور دلائل سے ان کو غلط قرار دیتے ـــ بارھویں صدی ہجری کے اس نامور کشمیری عالم و فقیہ کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا پتا چل سکا ہے کہ یہ مغل حکمران شاہ جہان کے عہد کے صاحبِ علم بزرگ تھے۔[۵۸]

۹۔ مولانا ابو الخیر جون پوری

مولانا ابو الخیر بن قاضی ثناء اللہ فاروقی جون پوری شیخ وقت، صالح عالمِ دین اور نامور فقیہ تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ ہوش سنبھالا تو حصولِ علم میں مشغول ہو گئے اور اس ضمن میں مختلف بلاد و امصار کا سفر کیا۔ متعدد علما سے تحصیل کی، علوم سے فارغ ہونے کے بعد خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔ زہد و عفاف اور تدین و قناعت کا پیکر تھے، عبادت گزار اور درس و تدریس میں کثیر الاشتغال تھے۔ ان کے علم و فضل کی وجہ سے انھیں ملک کا منصبِ افتا پیش کیا گیا، لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ علوم و فنون پر عبور و مہارت کا یہ عالم تھا کہ شرح عقائد تفتازانی اور شرح عقائد دوانی پر حواشی تحریر کیے۔

مولانا ابو الخیر جون پوری نے ۱۰۹۸ھ کو جون پور میں وفات پائی اور اسی شہر میں اپنے والد قاضی ثناء اللہ جون پوری کے مدفن کے قریب مدفون ہوئے۔[۵۹]

---

۵۸ حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۷ ـــ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۴۴ ـــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۷ ـــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۱ ـــ روضۃ الابرار، ص ۲۵

۵۹ تجلی نور۔ ج ۲، ص ۱۰۵ ـــ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۵۳، ۵۴ ـــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۸

۱۰۔ سیدابوسعید بریلوی

سیدابوسعید بریلوی، سید علم اللہ بریلوی کے پڑپوتے اور سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد امجاد میں سے تھے ــــ مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: سید ابوسعید بن محمد ضیا بن آیت اللہ بن سید علم اللہ نقشبندی بریلوی ــــ! نہایت متقی بزرگ تھے۔ بارھویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے صلحائے امت اور علمائے ربانیین میں سے تھے۔ رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ مولانا عبداللہ امیٹھوی سے علم حاصل کیا۔ عالمِ شباب ہی میں اپنے عمّ محترم سید محمد صابر سے بیعت کر لی تھی، پھر اپنے والدِ مکرم کے خلیفہ محمد یونس سے آبائے کرام کی نسبت حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق پیدا کیا اور ان سے سلوک کی تکمیل کر کے خلافت کا منصب پایا ــــ شاہ ولی اللہ، ان کے بھائی شاہ اہل اللہ، شیخ محمد عاشق پھلتی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ بعض مکاتیب "کلماتِ طیبات" میں چھپ چکے ہیں۔ مکاتیب کا ایک مجموعہ "مکتوب العارف" کے نام سے سید ابوالقاسم ہسوی نے مرتب کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے سید ابوسعید کو اپنے مکتوبات میں جن الفاظ و القاب سے مخاطب فرمایا، وہ سید ابوسعید کی علوِ شان اور جلالتِ منصب کا شاندار وثیقہ ہیں۔ مثلاً:

- ــــ سیادت و نجابت مآب، حقائق و معارف آگاہ میر ابوسعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔
- ــــ خلاصۂ دودمانِ نجابت میر سید ابوسعید سلمہ اللہ تعالیٰ
- ــــ حقائق و معارف آگاہ، سیادت و نجابت دستگاہ، سلالۃ الاکابر میر ابوسعید۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۳۰ محرم ۱۱۷۶ھ (۲۱ اگست ۱۷۶۲ء) کو فوت ہوئے۔ اس وقت خاندانِ علم اللّٰہی میں سے سید نعمان ان کے پاس تھے۔ انھوں نے سید ابوسعید کو یہ حزن افزا خبر مندرجہ ذیل الفاظ میں پہنچائی۔ (ترجمہ)

حضرت صاحب قدس سرہٗ آپ سے بہت خوشنود تھے اور آپ کے حال پر ان کی توجہات عالیات

بیان میں نہیں آسکتیں۔ اکثر اوقات آپ کے حالات دریافت فرماتے رہتے تھے... شاید آپ سے آخری ملاقات کی آرزو تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا: سید ابو سعید آنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، جلد پہنچ جائیں تو بہت اچھا ہو۔

شیخ محمد عاشق پھلتی سے تفسیر، حدیث، فقہ اور کتبِ تصوف کی سند و اجازہ کا شرف حاصل تھا۔ نیز بہ علوم شروح سے رجوع اور مطالعہ کے بعد طلبا کو پڑھانے کی بھی اجازت تھی۔ علم نحو اور علمِ صرف کے درس کی اجازت سے بھی بہرہ مند تھے۔

سید ابو سعید بڑے بارعب، سخی، مہمان نواز اور غریب پرور تھے۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ کہیں سے آیا، جب تک پورے کا پورا مستحقین میں بانٹ نہ دیا گھر میں قدم نہ رکھا۔ اطرافِ مدراس میں ارادت مندوں کا وسیع حلقہ موجود تھا۔ ان کے خلفا میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

میر عبدالسلام بدخشانی، شیخ محمد مراد انصاری مکی، مولانا جمالی الدین بن محمد صدیق قطب، مولانا عبداللہ آفندی، شیخ عبداللطیف حسینی مصری، شیخ عبدالقادر خالص پوری اور حاجی امین الدین بن حمید الدین کاکوروی۔

سید ابو سعید نے حج کی سعادت بھی حاصل کی، اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ ابوالحسن سندھی صغیر کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے مصابیح کا درس لیا اور چھ مہینے قیام فرما رہے۔ پھر مکہ مکرمہ گئے، وہاں شیخ محمد میرداد انصاری سے جزریہ پڑھا، طائف بھی گئے، ہندوستان واپس آئے تو مدراس میں ٹھہرے، کافی عرصہ وہاں مقیم رہے، اس اثنا میں بے شمار اہلِ علم اور اصحابِ سلوک و تصوف نے ان سے استفادہ کیا۔

سید ابو سعید نے ۹ رمضان المبارک ۱۱۹۳ھ (۲۰ ستمبر ۱۷۷۹ء) کو اپنے وطن رائے بریلی میں وفات پائی۔ پسماندگان میں دو بیٹے تھے اور چار بیٹیاں ــــ بیٹیوں میں سے ایک کا نام ناجیہ یا یافیہ تھا۔ یہ سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ تھیں۔ بیٹوں میں سے سید ابواللیث، سید شہید کے حقیقی ماموں تھے جو حج سے واپسی پر کوٹریال بندر پہنچے تو بیمار ہو گئے، وہیں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔[1]

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۱۰ تا ۱۲ ــــ سید احمد شہید، ص ۵۰، ۵۱

۱۱۔ سیّد ابو سعید کالپوی

سید ابو سعید بن فضل اللہ بن احمد بن محمد بن ابو سعید حسینی ترمذی کالپوی، مشاہیر مشائخ ہند میں سے تھے، صالح اور متدین عالمِ دین تھے۔ کالپی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت حاصل کی۔ اپنے والد شیخ فضل اللہ سے اخذِ علم کیا، انہی سے علم فقہ کی تحصیل کی اور ان کی وفات کے بعد مسندِ مشیخت پر فائز ہوئے۔ والیِ فرخ آباد، نواب غضنفر جنگ ان سے بیعت تھے، امرا اور عمالِ حکومت میں بڑی عزت و منزلت کے حامل تھے۔

سید ابو سعید کالپوی، علمی اعتبار سے بڑے اونچے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے دادا سید احمد اور پردادا سید محمد کالپوی بھی اجل علمائے برصغیر میں سے تھے۔ خاندانی اثراتِ علم اور آبائی علاماتِ تصوف و صالحیت سے یہ پوری طرح بہرہ یاب تھے۔ فارسی کے شاعر بھی تھے لیکن ان کا شمار کم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ عرفاں تخلص کرتے تھے۔ اس نیک بخت عالم و فقیہ نے ۱۱۴۷ھ کو وفات پائی[۱۱]۔

۱۲۔ مفتی ابو سعید گوپاموی

مفتی ابو سعید کا نسب نامہ یہ ہے: ابو سعید بن علیم اللہ بن علیداللہ بن علیلسی بن آدم شہابی گوپاموی، ۱۷ ذی الحجہ ۱۰۸۴ھ کو پیدا ہوئے۔ اور اپنے والدِ مکرم شیخ علیم اللہ گوپاموی سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ اور عالم و فقیہ گردانے گئے۔ اصحابِ دین اور اربابِ عمل علما میں سے تھے، اپنے والد کی وفات کے بعد گوپاموّ کی مسندِ افتا پر فائز ہوئے اور درس و افادہ کا منصب سنبھالا۔ مولوی وہاج الدین گوپاموی اور خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۱۵۱ھ کو فوت ہوئے[۱۲]۔

---

[۱۱] مآثر الکرام، دفتر اول، در ترجمہ میر سید احمد بن میر سید محمد کالپوی، ص ۷۹ تا ۸۱ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۲

[۱۲] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۲

۱۳۔ شیخ ابو الطیب سندھی

شیخ ابو الطیب محمد بن عبد القادر سندھی، شیخ صالح تھے اور علمائے محدثین میں سے گردانے جاتے تھے۔ ولادت اور نشو و نما علاقہ سندھ میں ہوئی اور انہی دیار میں علم حاصل کیا۔ بعد ازاں عازمِ حجاز ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں شیخ حسن بن علی عجیمی کا سلسلہ درس جاری تھا، ان سے حدیث پڑھی۔ صحاح و سنن کی کتابوں کے لیے انہی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، علمِ حدیث کی اکثر کتابیں علامہ طاہر بن ابراہیم بن حسن کورانی مدنی کی شراکت میں پڑھیں۔ شیخ محمد سعید کوکنی قرشی نقشبندی سے بھی تحصیل کی۔ شیخ احمد البناؒ سے سند و اجازہ کا شرف حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے۔ صدق و صلاح کے جوہر سے آراستہ تھے، حنفی المسلک تھے اور طریقہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جامع ترمذی کی عربی زبان میں شرح لکھی اور علمِ فقہ کی کتاب درِ مختار پر حاشیہ سپرد قلم کیا۔

شیخ ابو الطیب سندھی کا حلقہ تلامذہ بڑا وسیع تھا، ان میں شیخ عبد الرحمٰن بن عبد الکریم انصاری مدنی، شیخ عبد اللہ بن ابراہیم البری مدنی، شیخ محمد بن علی شروانی مدنی، شیخ یوسف بن عبد الکریم مدنی اور علمائے عظام کی بہت بڑی جماعت شامل ہے۔[۱۳]

۱۴۔ مولانا ابو الفتح کانی کشمیری

مولانا ابو الفتح بن عارف بن مولانا احمد کانی حنفی کشمیری، شیخ وقت اور دیارِ کشمیر کے نامور فقیہ تھے، فقہائے حنفیہ میں ان کا درجہ بڑا بلند تھا۔ تمام عمر درس و افادہ میں سرگرمِ عمل رہے۔ طریقت و تصوف سے بھی تعلق تھا۔ یہ علم شیخ محمد چشتی اور شیخ محمد مراد نقشبندی سے حاصل کیا تھا۔ متبع سنت اور قاطع بدعت تھے۔ باوجود فراوانی علم و

---

۱۳ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۴

فضل کے نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ ۱۱۴۹ھ کو فوت ہوئے[۱۴]

۱۵۔ مفتی ابو الفتح کلو کشمیری

ارض کشمیر کے یہ ایک اور عالم دین تھے جو مفتی ابو الفتح کے نام سے معروف تھے، ان کی شہرت "کلو" کے عرف سے تھی۔ علم فقہ میں بڑی مہارت رکھتے تھے، معقول و منقول کے جید علما میں سے تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ مولانا حیدر بن فیروز چرخی کشمیری سے اخذ علم کیا اور استدلال و استنباط مسائل میں بڑی شہرت پائی۔ فقہ و اصول، علوم عربیہ اور استخراج مسائل میں اس مرتبۂ بلند کو پہنچے کہ اس میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ آخر عمر میں کشمیر کے منصب افتا پر مامور ہو گئے تھے۔ شیعہ کے رد میں نہایت تیز تھے، ان کے عقائد کی مخالفت میں "سیف السابین" کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی۔ مختلف کتب درسیہ پر تعلیقات بھی لکھیں۔

مفتی ابو الفتح کلو کشمیری نے ۱۱۰۰ھ کو کشمیر میں وفات پائی اور سلطان زین العابدین کشمیری کے مقبرے میں دفن کیے گئے[۱۵]

۱۶۔ قاضی ابو الفرح گجراتی

قاضی ابو الفرح گجراتی، شیخ اور عالم و فقیہ تھے، سرزمین گجرات کے مشاہیر اہل علم میں سے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اپنے علم و فضل کی وجہ سے قاضی عبد اللہ بن محمد شریف گجراتی کی جگہ احمد آباد کی مسند قضا پر فائز ہوئے، عرصہ تک اس منصب جلیلہ پر متمکن رہے۔ ۱۱۲۱ھ کو عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم کے عہد میں معزول کیے گئے اور ان کی

---

[۱۴] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۰، ۲۶۱ ــــ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵، ۱۶

[۱۵] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۸۰ ــــ روضۃ الابرار، ص ۶۱، ۶۲ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۶ ــــ حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۵ ــــ خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۵۸

جگہ قاضی ابوالخیر کو قاضی مقرر کیا گیا۔ پھر وہ بھی جہاں دار شاہ کے عہد میں معزول ہو گئے اور ان کی بجائے قاضی اطہر کو یہ منصب عطا ہوا ۔ بعد ازاں ان کو بھی علیحدہ کر دیا گیا اور ان کی بجائے قاضی خیر اللہ کا تقرر عمل میں لایا گیا[۱۶]

۱۷۔ مولانا ابوالقاسم سندھی

مولانا ابوالقاسم بن مفتی داؤد ٹھٹھوی سندھی، علاقہ سندھ کے مشہور شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ مسلکاً حنفی تھے، فقہ، اصول اور علومِ عربیہ کے ماہر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ درس و افادہ میں سرگرم رہتے تھے، خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا، اورنگ زیب عالمگیر کو ان کے علم و فضل کی وسعت کا پتا چلا تو اس نے محکمہ دار القضا میں وکیلِ شرعی مقرر کیا۔

مولانا ابوالقاسم سندھی نے ۱۱۱۳ھ کو وفات پائی اور ایک شاگرد مخدوم رحمت اللہ نے ذهب العلم من السند تاریخ وفات نکالی[۱۷]

۱۸۔ سید ابو اللیث بریلوی

سید ابو اللیث بن ابو سعید بن محمد ضیا بن آیت اللہ بن شیخ علم اللہ نقشبندی بریلوی۔ یہ سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی ماموں تھے اور فضل و صلاح کے زیور سے آراستہ تھے۔ اپنے جدِ امجد اور دیارِ ہند کے معروف بزرگ سید علم اللہ بریلوی کے زاویہ میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت و تعلیم کی منزلیں طے کیں۔ اپنے والدِ بزرگ وار سید ابو سعید بریلوی سے علمِ فقہ حاصل کیا۔ حصولِ علم کے بعد طریقت و تصوف کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ منزل بھی باپ کی نگرانی میں طے کی ——— پھر ارشاد و تلقین

---

[۱۶] مرآۃ احمدی ۲ص ——— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶

[۱۷] تحفۃ الکرام ۳ص ۲، ۶۷ ——— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶، ۱۷ ——— تذکرہ علمائے ہند، ص ۶

میں ان کی مسند پر بیٹھے۔ بعد ازاں ارضِ حجاز کا قصد کیا اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی، پھر مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور طویل عرصہ تک مدراس میں مقیم رہے، وہیں وفات پائی۔ ان کی قبر ساحلِ سمندر پر گوڑیال بندر میں ہے[۱۸]

۱۹۔ مفتی ابو محمد سہسوانی

مفتی ابو محمد بن محمد عاقل بن محمد فاضل بن عبد الشکور حسینی مودودی سہسوانی، شیخ صالح اور عالم و فقیہ تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے اوائل میں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں پیدا ہوئے، علمی گھرانے کے فرزندِ عظیم اور دودمانِ فضل و کمال کے رجل رشید تھے۔ علومِ معقول و منقول اور فروع و اصول میں درجہ امامت پر فائز تھے صوری و معنوی کمالات و فضائل میں مشہور فی الانام تھے، علومِ دینیہ، تفسیر و حدیث، فقہ و کلام اور اصول میں مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے، احیائے سنت، ردِّ بدعت اور وعظ و ارشاد میں نہایت تیز تھے۔ تحصیلِ علوم و فنون اپنے والد گرامی قدر سید مفتی محمد عاقل سہسوانی سے کی اور پھر ان کی وفات کے بعد ان کی جگہ مسندِ درس و تدریس پر متمکن ہوئے۔ بہت سے لوگوں کو اپنے علم و فضل سے متمتع فرمایا۔ عہدِ محمد شاہ میں پچیس سال تک فرائض شرعی انجام دیتے رہے۔ مفتی ابو محمد کے نام کے کئی شاہی پروانے اور فرامین جن پر شاہی مہر چسپاں ہے، "حیات العلما" کی روایت کے مطابق جو ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۲ء) میں طبع ہوئی، سنِ مذکور تک ان کے گھر میں موجود تھے۔ ان وثیقوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ ان سے بہت ہی مخلصانہ اور عقیدت مندانہ تعلق رکھتا تھا، ان کے زہد و تقویٰ، تقدس و دیانت اور فضل و کمال کا معترف تھا۔

مفتی سید ابو محمد سہسوانی نے ۱۱۵۵ھ کے قریب وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے خواجہ سید نظر محمد سہسوانی مسندِ افتا پر متمکن ہوئے[۱۹]

---

[۱۸] سیرت السادات، ص ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۷ ـــــ سید احمد شہید، ص ۵۱

[۱۹] حیات العلما، ص ۱۸، ۱۹ ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ، ص ۱۷

۲۰- مفتی ابوالوفا کشمیری

مفتی ابوالوفا کشمیری اکابر فقہائے حنفیہ میں تھے اور اپنے عصر کے معروف عالم و شیخ تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ مولانا محمد اشرف چرخی اور شیخ امان اللہ بن خیر الدین کشمیری سے اخذِ علم کیا اور استخراج مسائل فقہیہ میں بڑی شہرت حاصل کی۔ عنفوانِ شباب ہی میں کشمیر کے صدر الصدور اکبر یار خاں گوجواری کی وساطت سے مغل حکمران شاہ عالم بہادر کے دربار میں حاضر ہوئے، شاہ عالم بہادر نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر کشمیر کے منصبِ افتا پر مامور کیا اور جاگیر عطا کی۔ بڑی تحقیق و کاوش سے چار ضخیم جلدوں میں مسائل فرعیہ فقہیہ جمع کیے، ایک رسالہ خصائص نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں "انوار النبوۃ" کے نام سے تصنیف کیا۔ معارضہ و مباحثہ میں بڑے تیز تھے۔ کشمیر کے اس عالم و فقیہ نے ۱۱۷۹ھ میں وفات پائی[۵۲]

۲۱- شیخ احمد صدیقی امیٹھوی - مُلّا جیون

شیخ احمد بن ابوسعید بن عبید اللہ بن عبد الرزاق بن خاصۂ خدا، دیارِ ہند کے عالمِ کبیر اور عظیم المرتبت شیخ تھے۔ ملّا جیون کے لقب سے مشہور تھے، "جیون" ہندی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں زندگی ——— ! شیخ عبد اللہ مکی کی اولاد سے تھے، منقول ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب حضرت صالح علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے۔ نسباً صدیقی، مذہباً حنفی، اصلاً مکی، نسلاً صالحی اور مولداً امیٹھی تھے۔

ملّا جیون منگل کے روز ۲۵ شعبان ۱۰۴۷ھ کو امیٹھی میں پیدا ہوئے جو ضلع لکھنؤ میں واقع ہے۔ علم و فضل کی گود میں تربیت پائی اور اپنے والدِ مکرم شیخ ابوسعید کے

---

۵۲ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۶ ——— حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۹ ——— نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۱۸: ۱۹ ——— روضۃ الابرار، ص ۶۸

حلقہ درس میں داخل ہوئے۔ نہایت ہونہار طالب علم تھے، حافظہ اس درجہ تیز تھا کہ سات سال کی عمر میں قرآنِ مجید حفظ کر لیا۔ پھر کتبِ درسیہ کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ کیے بغیر حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ تیرہ سال کی عمر کو پہنچے تو والد وفات پا گئے اور اکثر کتبِ درسیہ شیخ محمد صادق سترکھی سے اور بعض مولانا لطف اللہ کوروی سے پڑھیں۔ بائیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ پھر اپنے شہر امیٹھی میں سلسلۂ تدریس شروع کر دیا۔ چالیس سال کو پہنچے تو عازمِ اجمیر ہوئے، اجمیر سے دہلی کا قصد کیا، کافی عرصہ وہاں مقیم رہے اور درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ پچپن۵۵ سال کی عمر میں حرمین شریفین گئے اور فریضۂ حج ادا کیا، خاصی مدت وہاں اقامت گزین رہے۔ جب واپس ہندوستان آئے تو ساٹھ سال کو پہنچ گئے تھے، چھ سال بلادِ دکن میں اورنگ زیب عالم گیر کی فوجی چھاونیوں میں مقیم رہے۔ ۱۱۱۲ھ میں دوبارہ سرزمینِ حجاز تشریف لے گئے اور مناسکِ حج ادا کیے، ایک مرتبہ والد کی طرف سے اور دوسری مرتبہ والدہ کی جانب سے۔! وہاں نہایت غور و فکر اور متعدد شروح سے مراجعہ و مطالعہ کے بعد صحیحین کا درس بھی دیا۔ ۱۱۱۶ھ میں وطن (امیٹھی) واپس آئے۔

شیخ یٰسین بن عبدالرزاق قادری سے خرقہ تصوف حاصل کیا۔ اب کی مرتبہ دو سال امیٹھی میں اقامت پذیر رہے۔ پھر دہلی چلے گئے، اس وقت طلبائے علم کی ایک جماعت ان کے ساتھ تھی۔ کافی عرصہ دہلی میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں اورنگ زیب عالم گیر کا بیٹا شاہ عالم دکن سے واپس لوٹا تو ملا جیون نے اجمیر پہنچ کر اس کا استقبال کیا اور اس کے ساتھ لاہور گئے۔ لاہور بھی کافی عرصہ قیام رہا۔ شاہ عالم کی موت کے بعد پھر دہلی چلے گئے اور تا دمِ واپسیں وہیں مقیم رہے۔ فرخ سیر سے بھی تقرب رہا۔

ملا جیون سے بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا۔ لوگوں کی نفع رسانی میں بدرجۂ غایت کوشاں رہتے اور بادشاہ سے ان کی سفارشیں کرتے، کسی دور میں نہ عوام سے علیحدگی اختیار کی اور نہ درس و افادہ کا سلسلہ منقطع کیا۔ حتیٰ کہ وفات کے روز بھی شام کو باقاعدہ

طلبا کو درس دیا۔

اورنگ زیب عالم گیر ملا جیون کا بہت احترام کرتا اور عقیدت سے پیش آتا تھا۔ اسی طرح شاہ عالم بہادر شاہ بھی ان کو لائقِ اکرام گردانتا اور ان سے حسن ظن کا اظہار کرتا تھا۔

ملا جیون بہت سی عمدہ اور مشہور کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے درج ذیل کتابیں خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

تفسیر احمدی : اس کو تفسیراتِ احمدیہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ قرآنِ مجید کی تفسیر ہے اور عربی زبان میں ہے۔ اس میں فقہی انداز سے آیاتِ احکام کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کا آغاز انھوں نے ۱۰۶۴ھ میں کیا تھا، جب کہ صرف سولہ سال کی عمر کے تھے، اس زمانے میں مشہور درسی کتاب "حسامی" پڑھتے تھے۔ ۱۰۶۹ھ میں اس کی تکمیل سے فارغ ہوئے، اس وقت "شرح المطالع" کا درس لیتے تھے۔ یہ کتاب اپنے شہر امیٹھی میں لکھی۔ پھر فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۰۷۵ھ میں اس کی تصحیح کی۔ اس وقت ان کی عمر ستائیس سال تھی۔ یہ تفسیر اپنے موضوع کی وضاحت میں اچھی چیز ہے، لیکن فاضل مصنف بعض مقامات میں لغزشِ فکر کا شکار ہو گئے ہیں اور توجیہِ مسائل میں کتاب و سنت کے واضح احکام کی پابندی کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

نور الانوار : شیخ ابو البرکات نسفی (۷۱۰ھ) کی تصنیف "منار الانوار" کو اصولِ فقہ میں متنِ متین کی حیثیت حاصل ہے۔ ملا جیون نے "نور الانوار" کے نام سے اس کی شرح قلم بند کی۔ اس کا پورا نام "نور الانوار فی شرح المنار" ہے۔ یہ ایک متداول کتاب ہے اور مدارس میں مروج اور درسِ نظامیہ میں شامل ہے۔ خاصی ضخیم اور خالص علمی و فنی نوعیت کی کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے یہ قیام مدینہ منورہ کے زمانے میں تصنیف کی تھی۔ ان کے اشہبِ قلم کی تیزی اور فکر و ذہن کی بے پناہ روانی کا اندازہ کیجیے کہ اس کی تصنیف کا آغاز انھوں نے یکم ربیع الاول ۱۱۰۵ھ کو کیا تھا اور ۷ جمادی الاولیٰ ۱۱۰۵ھ کو کتاب مکمل کر لی تھی۔ یعنی صرف دو مہینے سات دن میں اتنی ضخیم کتاب کی تصنیف سے فارغ ہو گئے تھے۔ یہ کتاب علما و طلبا میں بڑی مقبول ہے اور تعلیق و تدریس میں اہلِ علم

نے اس سے بہت اعتنا کیا ہے۔ حلقۂ علما میں جو تلقّی و قبولیت اس کتاب کو حاصل ہوئی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ اب تک باقاعدہ داخلِ نصاب ہے۔ یہ کتاب بھی عربی میں ہے۔

السوانح : یہ کتاب مولانا عبدالرحمٰن جامی کی لوائح کے انداز کی ہے۔ قیامِ حجاز کے زمانے کی تصنیف ہے، جب کہ وہ دوسری مرتبہ ۱۱۱۲ھ میں وہاں تشریف لے گئے تھے۔

مناقب الاولیا : یہ کتاب مشائخ و علما کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے جو اپنی کبر سنی کے دور میں امیٹھی میں لکھی۔ اس میں خود ان کے اپنے حالات و کوائف بھی درج ہیں۔ اس کا تتمہ اپنے بیٹے عبدالقادر کے لیے تحریر کیا۔

آدابِ احمدی : یہ تصوف کے موضوع پر ہے اور سیر و سلوک کے بعض کوائف و واردات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ملّا جیون کی یہ صغر سنی کے دور کی تالیف ہے۔

دیوانِ حافظ کی طرح ایک دیوانِ شعری لکھا جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

مثنوی معنوی کے انداز و اسلوب میں پچیس ہزار اشعار قلم بند کیے۔

جمعہ اور عیدین کے خطبات تحریر کیے۔

اپنے جدِ بزرگوار شیخ عبیداللہ اور بڑے بھائی شیخ علم اللہ امیٹھوی کی تصنیفات کو مرتب کیا۔

سفرِ حجاز پر روانہ ہوئے تو قصیدہ بردہ کے نہج پر ایک قصیدہ لکھا جو دو سو بیس اشعار کو محتوی ہے۔

جب بندرگاہ سورت میں پہنچے تو ایک عجیب و غریب قلبی کیفیت طاری ہوئی۔ بعد ازاں پہلے قصیدے کی طرح عربی ہی میں انتیس قصیدے اور لکھے۔ اپنے بارے میں یہ چیزیں انھوں نے خود اپنی کتاب "مناقب الاولیا" میں تحریر کی ہیں۔

شیخ احمد امیٹھوی عرف ملّا جیون بارھویں صدی ہجری میں دیارِ ہند کے وہ عالم و فقیہ تھے، جو ذہانت و فطانت، اخذ و ادراک اور حفظ و سماعت میں نہایت تیز تھے۔ بے شمار علما نے ان سے علم حاصل کیا اور بلند مرتبے کو پہنچے۔ تریاسی (۸۳) سال کی عمر پا کر

منگل کی رات ۹ ذی القعدہ ۱۱۳۰ھ کو دہلی میں فوت ہوئے اور میر محمد شفیع دہلوی کے زاویہ میں دفن کیے گئے۔ پھر پچاس دن کے بعد ان کی میت کو ان کے شہر امیٹھی میں منتقل کیا گیا اور اپنے مدرسے میں دفن کیا گیا۔[۱۵۲]

۲۲- شیخ احمد گوپاموی

شیخ احمد بن ابو منصور الخطیب گوپاموی، عالم و فقیہ تھے اور اکابر فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولد و منشا گوپامئو ہے۔ ان کے والد گرامی شیخ ابو المنصور گوپاموی مشہور عالم وقت تھے، ان سے اور نامور عالم و فقیہ شیخ احمد امیٹھوی عرف ملّا جیون سے اخذِ علم کیا اور بحث و اشتغال میں مرتبۂ کمال کو پہنچے، یہاں تک کہ فقہ و اصول اور علومِ عربیہ میں ماہر کامل ہوئے۔ ان کے علم و فضل اور مہارتِ فقہ کا شہرہ اورنگ زیب عالم گیر تک پہنچا تو اس نے ان کو فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل کر لیا۔ ایک روپیہ یومیہ اور کچھ غلہ ان کا وظیفہ مقرر ہوا، جس کا عالم گیر کی طرف سے باقاعدہ ایک تحریری دستاویز کی صورت میں عہد کیا گیا۔ اس دستاویز پر ۱۱ ذی القعدہ ۱۰۷۸ھ کی تاریخ مرقوم ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ان کے لیے یہ وظیفہ شیخ وجیہ الدین گوپاموی کی تصدیق سے مقرر کیا گیا۔

منقول ہے کہ شیخ احمد گوپاموی نے اپنے استاد شیخ احمد امیٹھوی (ملّا جیون) کے ساتھ حجازِ مقدس کا سفر بھی کیا، حج و زیارت سے سعادت اندوز ہوئے اور پھر

---

[۱۵۲] مناقب الاولیا ــــ ماثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۰۶، ۲۰۷ ــــ خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۶۵، ۳۶۶ ــــ ابجد العلوم، ص ۹۰۷ ــــ سبحۃ المرجان، ص ۷۹ ــــ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۶ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۵ ــــ معجم المطبوعات العربیہ، ج ۲، ص ۱۱۶۴، ۱۱۶۵ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹ تا ۲۱ ــــ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۵۸ تا ۶۶۲ ــــ بزم تیموریہ، ص ۲۲۴، ۲۲۵ ــــ برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ، ص ۳۱۰ تا ۳۱۲ ــــ قضاء الارب من ذکر علماء النحو و الادب، ص ۲۰۴، ۲۰۵ ــــ رودِ کوثر، ص ۴۷۵، ۴۷۶۔

اسی ارضِ پاک میں وفات پائی ـــــ یاد رہے، ملا جیون نے دو مرتبہ حجاز کا سفر کیا تھا، پہلی مرتبہ ۱۱۰۲ھ میں، جب کہ پانچ سال وہاں اقامت گزیں رہے۔ دوسری مرتبہ ۱۱۱۲ھ میں ـــــ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شیخ احمد بن ابوالمنصور ان کے ساتھ پہلی مرتبہ حجاز گئے یا دوسری مرتبہ۔

شیخ احمد گوپاموی کی تاریخ ولادت اور سنِ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔[۲۲]

۲۳- شیخ احمد رفاعی

شیخ احمد بن عبدالرحیم بن محمد بن صالح حسنی رفاعی کا شمار معروف رجالِ فضل و صلاح میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کے مشہور شہر سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت حاصل کی۔ گھر میں علم کی شمع روشن تھی اور والدِ گرامی شیخ عبدالرحیم مشہور علما میں سے تھے، علمِ فقہ ان ہی سے حاصل کیا اور جید و متقی علما و فقہا میں سے گردانے گئے۔

شیخ احمد رفاعی نے ۱۲ شعبان ۱۱۱۲ھ کو وفات پائی۔[۲۳]

۲۴- شیخ احمد نائطی مدراسی

شیخ احمد بن عبداللہ نائطی کو شیخ نظام الدین مدراسی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ۱۱۱۳ھ کو پیدا ہوئے، ہوش سنبھالا تو حصولِ علم میں مصروف ہو گئے۔ حدیث، فقہ اور علومِ عربیہ وغیرہ کی کتابیں اس دور کے مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ تحصیلِ علم کے بعد محمد پور کے منصبِ صدارت پر فائز ہوئے۔ نہایت ذکی، امین و متین،

---

۲۲ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۱، ۲۲ ـــــ برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ، ص ۳۰۹، ۳۱۰۔

۲۳ حدیقۂ احمدیہ ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۲

بلند مرتبت اور بہترین اخلاق کے مالک تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سرور الصدور ترجمہ معرب الزبور، فیض الجلیل ترجمہ انجیل، فتح الوہاب المجید ترجمہ القول السدید، فیض الوہاب شرح خلاصۃ الحساب، فارسی زبان میں ہیں ــــ انباء الاذکیا بتحبیب الطیب والنساء الی سید الانبیاء اور وقائع نہضۃ بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں عربی میں ہیں۔ وقائع نہضۃ ناصر جنگ کی لڑائی کے بارے میں ہے جو اس کے بھتیجے مظفر جنگ سے ہوئی۔

شیخ احمد بن عبداللہ نائطی مدراسی نے ۲۲ رمضان المبارک ۱۱۸۹ھ کو وفات پائی۔[۲۴]

۲۵۔ شیخ احمد عثمانی لکھنوی

شیخ احمد بن غلام نقشبند بن عطاء اللہ عثمانی لکھنوی، فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ ان کے والد شیخ غلام نقشبند لکھنوی عالم و فاضل بزرگ تھے، لائق بیٹے نے انہی سے اخذِ علم کیا۔ پھر شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کی خدمت میں گئے، ان سے بھی استفادہ فرمایا۔ ان کے والد شیخ غلام نقشبند، شیخ پیر محمد سلونی کے مدرسے میں فرائض تدریس انجام دیتے تھے، ان کی وفات کے بعد بیٹے نے یہ مسند سنبھالی۔ مسندِ مشیخت کو بھی زینت بخشی۔ رسالہ قطبیہ کی روایت کے مطابق بہت سے علما و طلبا ان سے مستفید ہوئے۔ بحرِ زخار میں مرقوم ہے کہ شیخ احمد عثمانی لکھنوی نے پینتیس[۳۵] سال تک درس و افادہ کا ہنگامہ گرم کیے رکھا۔ شیخ احمد نے ۱۱۵۹ھ میں وفات پائی، ان کے بعد ان کے بیٹے شیخ قطب الہدیٰ مسندِ مشیخت پر فائز ہوئے۔[۲۵]

۲۴؎ تاریخ النوائط، ص ۵۲۱، ۵۲۲ ـــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۲، ۲۳

۲۵؎ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۴ بحوالہ تذکرۃ الکملا

۲۶- شیخ احمد ہرکامی

شیخ احمد بن مسعود حسینی ہرکامی، ہدیۃ کے عرف سے معروف تھے اور اپنے دَور کے فاضل اور علامہ تھے۔ علمِ نحو اور علومِ عربیہ کے علما میں سے تھے۔ ہرکام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے عمِ محترم شیخ معز الدین بن شیخ محمد شفیع ہرکامی سے علم حاصل کیا، پھر درس و افادہ کی مسند پر متمکن ہوئے۔ بہت سی کتب و رسائل کے مصنف تھے، جن میں ایک رسالہ میراث سے متعلق ہے، جو "الوجیز" کے نام سے موسوم ہے۔ ایک رسالہ "حساباً یسیراً" کے نام سے علمِ حساب کے بارے میں ہے۔ یہ دونوں رسالے ۱۱۰۲ھ میں تصنیف کیے۔ ان رسالوں کے متن کی شرح بھی سپردِ قلم کی۔ "نادر البیان" کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ علم نحو کے موضوع پر لکھا۔ یہ رسالہ کبر سنی میں امیر غلام احمد خاں اور اپنے بیٹے جلیل الرحمٰن کے لیے قلم بند کیا تھا۔ ۱۱۵۰ھ کو "باہر البیان" کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی رسالے ضبطِ تحریر میں لائے۔

شیخ احمد ہرکامی نے ۱۹ شوال ۱۱۷۵ھ کو وفات پائی[۲۶]

۲۷- قاضی احمد جون پوری

قاضی احمد بن ابو احمد عثمانی جون پوری، مشہور شیخ اور معقولات و منقولات کے جلیل القدر عالم تھے۔ اپنے جدِ امجد یوسف بن حامد عثمانی جون پوری سے کسبِ علم کیا اور اصحابِ فضل و کمال علما کی جماعت میں گردانے گئے۔ اپنے عصر کے نامور عالم اور صاحبِ فتویٰ بزرگ تھے۔ استحضارِ مسائل اور جزئیاتِ فقہیہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ شہر "کوڑہ جہان آباد" میں عہدۂ قضا پر مامور ہوئے اور عمر بھر فرائضِ قضا انجام

---

[۲۶] نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۲۵

دیتے رہے۔ اسی شہر میں وفات پائی، جون پور میں ان کی میت لے جائی گئی اور وہاں کے محلہ چاچک پور میں دفن کیے گئے[۵۲۷]

بارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم کی ولادت اور وفات کی تاریخ کا پتا نہیں چل سکا۔

۲۸- حاجی احمد دہلوی

حاجی شیخ احمد بن ابو احمد دہلوی فاضل کبیر اور محدثِ جلیل تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد تھے، ان سے علمِ حدیث کی تکمیل کی۔ پھر شیخ فخر الدین بن نظام الدین دہلوی سے منسلک ہوگئے۔ طویل عرصے تک ان کی صحبت و ملازمت اختیار کیے رکھی۔ ان سے اخذِ طریقت بھی کیا۔ بعد ازاں عازمِ حجاز ہوئے اور حج و زیارت سے بہرہ مند ہو کر مراجعت فرمائے ہند ہوئے[۵۲۸]

۲۹- قاضی احمد حماد فتح پوری

قاضی احمد حماد بن جان محمد بن محمد دولت انصاری سہالوی ثم فتح پوری، اپنے وقت کے شیخ اور عالم و فقیہ تھے، اور بارھویں صدی ہجری میں دیارِ ہند کے فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فتح پور میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت پائی اور اپنے عم محترم علامہ کمال الدین بن محمد دولت فتح پوری سے علم حاصل کیا۔ ان کے والد قاضی جان محمد، فتح پور کے منصبِ قضا پر متعین تھے، ان کی وفات کے بعد فاضل بیٹے [قاضی احمد حماد] کو ان کی جگہ قاضی مقرر کیا گیا۔ نیک اور صاحبِ ورع و تقویٰ عالمِ دین

---

۵۲۷ تجلی نور۔ ج ۲، ص ۴۶ —— تاریخ شیرازِ ہند جون پور، ص ۷۱۵
نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۵

۵۲۸ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۵

تھے۔ ستر سال سے زائد عمر پا کر فوت ہوئے[۲۹]

۳۰۔ شیخ احمد عبد الحق لکھنوی

شیخ احمد عبد الحق بن محمد سعید بن شیخ شہید قطب الدین محمد انصاری سہالوی لکھنوی، ۱۹ یا ۲۷ رجب ۱۱۰۳ھ کو قصبہ سہالی میں پیدا ہوئے، اسی تاریخ کو ان کے جد امجد شیخ قطب الدین محمد انصاری نے وفات پائی تھی۔ کچھ بڑے ہوئے تو لکھنؤ آئے اور اپنے عالم و فاضل چچا شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے، ان سے تحصیلِ علم کی اور اپنے تمام اقران و معاصرین سے فوقیت لے گئے۔ درس و افتا کی مسند پر فائز ہوئے اور اپنے استاذ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کی زندگی ہی میں اکابر علما میں شمار ہونے لگے۔ اس عصر کے اکابر فضلا اور علمائے متبحرین و مشہورین میں سے تھے۔

شیخ احمد عبد الحق لکھنوی تصنیف و تالیف سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے اور تحشیہ نویسی میں بڑے ماہر تھے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی محب اللہ عثمانی بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ) کی منطق کی مشہور کتاب "سلم العلوم" کی مبسوط و مفصل شرح لکھی، میر زاہد کے حاشیۂ الرسالہ پر حاشیہ تحریر کیا، نیز میر زاہد نے جلال الدین دوّانی کی "شرح التہذیب" اور "شرح المواقف" پر جو حواشی لکھے ہیں، ان پر حواشی قلم بند کیے۔

شیخ احمد عبد الحق انصاری لکھنوی نے ۹ ذی الحجہ ۱۱۸۷ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی[۳۰]

۳۱۔ قاضی احمد علی سندیلوی

قاضی احمد علی بن فتح محمد حنفی سندیلوی، اپنے دور کے شیخ اور علامہ تھے۔ بالخصوص

---

۲۹ اغصان الانساب، ص ——— نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۷

۳۰ تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۲۳ تا ۲۵ ——— نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۸

منطق اور فلسفے کے ماہرین میں سے تھے۔ صوبہ یوپی کے مشہور شہر سندیلہ میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت پائی اور اپنے سسر شیخ حمد اللہ بن شکر اللہ سندیلوی (متوفی ۱۱۶۰ھ) سے (جو دیارِ ہند کے بہت بڑے ماہر منطق و حکمت تھے) علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سندیلہ کی مسندِ قضا پر متعین ہوئے۔ ہر وقت مطالعۂ کتب میں مشغول اور تدریسِ طلبا میں مصروف رہتے۔ منطق و حکمت کی بعض درسی کتابوں پر تعلیقات و حواشی بھی تحریر کیے۔ مثلاً "الرسالہ" پر، سید زاہد کے حاشیہ پر حاشیہ لکھا، شرح تہذیب اور شرح المواقف پر بھی حواشی تحریر کیے۔ قاضی محب اللہ بہاری کی "سلم العلوم" کی ایک بسیط و مفصل شرح قلم بند کی۔ میراث کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا۔

ان شروح و تعلیقات کے علاوہ قاضی احمد علی سندیلوی نے تدریسی خدمات بھی انجام دیں اور بہت سے علما و طلبا نے ان سے مختلف کتابوں کا درس لیا۔ ان کے شاگردوں میں شیخ حمد اللہ سندیلوی کے بیٹے شیخ حیدر علی بھی شامل ہیں۔

قاضی احمد علی سندیلوی نے ۱۲۰۰ھ کو سندیلہ میں وفات پائی۔[۳۱]

۳۲۔ شیخ احمد اللہ خیر آبادی

شیخ احمد اللہ بن صفت اللہ حسینی رضوی خیر آبادی، اپنے علاقے اور عصر کے عالمِ کبیر تھے۔ ان کا شمار فقہ، اصول، کلام اور علومِ عربیہ کے ماہرین میں ہوتا ہے۔

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مشہور شہر خیر آباد میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت حاصل کی۔ صغر سنی ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ تو اپنے والدِ محترم شیخ صفت اللہ سے پڑھتے رہے، ان سے علمِ نحو، بعض علوم عربیہ اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ حدیث بھی ان ہی سے پڑھی۔ پھر فتح پور کا عزم کیا، وہاں علامہ کمال الدین بن محمد دولت

---

[۳۱] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۰ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۸

فتح پوری (متوفی ۱۴ محرم ۱۱۷۵ھ) کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور مختلف علوم میں ان سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں اپنے شہر خیر آباد کو مراجعت کی اور درس و افادہ میں مصروف ہو گئے، ان سے بہت سے علما و طلبا نے تحصیل کی۔

شیخ احمد اللہ خیر آبادی نے یکم رجب ۱۱۶۷ھ کو خیر آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔[۳۲]

۳۳۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی

مولانا احمد اللہ پانی پتی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے بیٹے اور شاگرد اور مرزا مظہر جان جاناں دہلوی کے مرید تھے۔ حدیث و فقہ کے ماہر اور عابد و زاہد تھے۔ ۱۱۹۸ھ (۸۴-۱۷۸۳ء) کو عالمِ جوانی میں انتقال کیا۔[۳۳]

۳۴۔ شیخ اسماعیل غوری پشاوری

شیخ اسماعیل غوری نقشبندی پشاوری، مشہور مشائخ میں سے تھے۔ اپنے زمانے کے عالم اور زاہد و فقیہ بزرگ تھے۔ سیر و سیاحت کے شائق تھے اور علما و مشائخ سے ملاقات اور استفادے کو اپنے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ بہت سے طویل سفر کیے، متعدد ممالک میں گئے اور وہاں کے اصحابِ علم اور اربابِ تصوف سے مستفید ہوئے۔ پہلے حجاز مقدس کا عزم کیا اور حج و زیارت کی نعمت حاصل کی۔ وہاں سے بغداد، بخارا، کربلا، بسطام اور یمن گئے، ان علاقوں اور ملکوں میں مشائخِ کرام کی ایک بڑی جماعت سے ملے اور ان سے اخذِ فیض کیا۔ پھر ہندوستان کو معاودت کی اور شیخ سعدی بخاری لاہوری (متوفی ۳ ربیع الاول ۱۱۰۸ھ) سے تحصیلِ

---

۳۲ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۸۹ در ترجمہ حاجی صفت اللہ خیر آبادی ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۹۔ مقامات مظہری ص ۶۸۔ ۳۳ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴ ـــــ خزینۃ الاصفیا۔ ج ۱، ص ۶۸۷

طریقت فرمائی۔ ان سے منسلک ہوئے اور بہت سے فیوض حاصل کیے۔

شیخ اسماعیل غوری تجارت کرتے اور اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔ ۱۱۱۱ھ کو پشاور میں فوت ہوئے[۳۴]

۳۵- شیخ اشرف قلی جائسی

شیخ اشرف قلی بن عبدالسبحان بن مبارک بن جلال بن مبارک اشرفی جائسی فاضل و علامہ تھے اور فقہ و اصول، کلام اور علوم عربیہ کے علمائے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ عمر بھر سلسلۂ درس و افادہ جاری رکھا۔ شیخ کبیر نظام الدین بن قطب الدین سہالوی لکھنوی نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور فقہ، اصول اور علم کلام کی تحصیل کی[۳۵]

شیخ اشرف قلی جائسی کی ولادت و وفات کی تاریخ کا پتا نہیں چل سکا۔

۳۶- شیخ افضل راجیندروی

شیخ افضل کا سلسلۂ نسب یہ ہے: افضل بن امین بن فاضل بن ابراہیم بن خوندمیر حسینی رفاعی راجیندروی، معروف علما و صلحا اور نامور مشائخ میں سے تھے۔ مولد و منشا راجیندری ہے، جو مدراس کے علاقہ ارکاٹ میں واقع ہے۔ شیخ شیخن اورنگ آبادی سے اخذ طریقت کیا اور ایک مدت تک ان سے وابستہ رہے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں مشہور کتابیں مرآۃ العارفین، معدن الجواہر تحفۃ الصالحین، شرح فقہ الاکبر اور شرح نام حق ہیں۔ مؤخر الذکر دو کتابیں مسائل فقہ سے متعلق ہیں۔ ایک رسالہ وحدت الوجود کے بارے میں لکھا۔ مثنوی معنوی،

۳۴ھ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۶۵۲ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۳۳، ۳۴

۳۵ھ تاریخ جائس، — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۳۴

فصوص الحکم، لوائح اور لمعات کا درس بڑے شوق اور وجد آفریں انداز میں دیتے تھے ـــــ ۱۵ رمضان ۱۱۹۳ھ کو راجیندری میں فوت ہوئے[۳۶]

۳۷-مولانا اکبر یار کشمیری

مولانا اکبر یار کشمیری دیارِ کشمیر کے شیخ و فاضل اور علومِ عربیہ میں یگانہ تھے۔ حنفی المسلک تھے، جائے ولادت کشمیر ہے، نشوونما کشمیر میں ہوئی۔ ان کے والد مولانا خیر الدین کشمیری عالمِ وقت تھے، ان سے اخذِ علم کیا۔ پھر عازمِ دہلی ہوئے۔ وہاں شیخ القرا عبد الخالق دہلوی سے قرأت و حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اخذِ طریقت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی اور دیگر مشائخ سے کیا ـــــ ۱۱۵۸ھ کو وفات پائی[۳۷]

۳۸- شیخ اکرم الدین گجراتی

شیخ اکرم الدین بن محی الدین بن قاضی عبد الوہاب حنفی احمد آبادی گجراتی، فاضل بزرگ تھے اور معقول و منقول کے ماہر تھے۔ مولد و منشا احمد آباد ہے، شیخ نور الدین بن محمد صالح گجراتی سے اخذِ علم کیا، اپنے والد شیخ محی الدین گجراتی کی وفات کے بعد ۱۱۰۰ھ کو گجرات کے منصب صدارت پر مامور کیے گئے اور پھر تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹے شاہ عالم نے ان کو سیف الاسلام خاں کا لقب دیا تھا۔ ان کی قابلِ ذکر اور بہترین خدمات میں سے احمد آباد کا مدرسہ ہدایت بخش ہے۔ اس کی تعمیر پر انھوں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے خرچ کیے۔ ۱۱۰۲ھ کو اس کی تعمیر کا آغاز کیا اور ۱۱۰۹ھ کو تکمیل ہوئی۔ بعض لوگوں نے تکمیل کی تاریخ قرآن کی اس آیت سے نکالی:

---

۳۶ محبوب ذی المنن، ص ۹۶ تا ۹۹ ـــــ نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۳۵

۳۷ نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۳۵ ـــــ روضۃ الابرار، ص ۶۲، ۶۳

اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ -

بعدازاں ۱۱۱۱ھ کو اس مدرسے کی عمارت میں مزید اضافہ کیا - ایک صاحب نے اس کی ان الفاظ میں تاریخ نکالی : مدرسۃ فیہا الہدیٰ للعٰلمین -

طلبا کے مصارف کی غرض سے اعمالِ پٹن میں مدرسے کے لیے دو گاؤں وقف کیے اور ایک گاؤں نواح جانپانیر میں وقف کیا - اس طرح شیخ اکرم الدین گجراتی نے مدرسہ ہدایت بخش کے نام پر تین گاؤں وقف کیے اور کثیر رقم اس کی تعمیر پر خرچ کی - یہ ان کی بہت بڑی دینی، علمی اور اسلامی خدمت تھی [۳۸]

۳۹ - شیخ اللہ بخش گوپاموی

شیخ اللہ بخش بن عبدالحی بن عبدالقادر عمری قنوجی ثم گوپاموی عالم و فاضل اور فقہ و اصول اور عربیہ کے ماہر تھے - ہمیشہ علما و طلبا کو پڑھانے اور درس و افادہ میں مصروف رہتے [۳۹]

۴۰ - شیخ اللہ داد گوپاموی

شیخ اللہ داد گوپاموی، بہت بڑے عالم، نہایت نیک اور اللہ کے صالح بندے تھے - شیخ اللہ بخش گوپاموی کے بیٹے تھے - اصول بزدوی پر مفید تعلیقات قلم بند کیں [۴۰]

۴۱ - شیخ امام الدین جون پوری

شیخ امام الدین بن سعد الدین بن نور الدین جعفر مداری جون پوری، ۱۰۷۷ھ

---

۳۸ مرآۃ احمدی، ص —— نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۳۶

۳۹ تذکرۃ الانساب، مصطفٰی علی خاں گوپاموی، ص —— نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۳۶

۴۰ ایضاً

میں پیدا ہوئے، بعض کتبِ درسیہ اپنے جدِ امجد شیخ نورالدین جعفر سے اور اکثر اپنے والدِ گرامی شیخ سعدالدین سے پڑھیں۔ توضیح اور تلویح کا درس شیخ محمد افضل عباسی الٰہ آبادی سے لیا، کسبِ طریقت بھی ان ہی سے کیا، یہاں تک کہ اپنے علاقے کے عالم و فقیہ اور فنونِ عربیہ اور علومِ دینیہ کے ماہر قرار پائے۔ شیخ محمد افضل عباسی الٰہ آبادی سے انھیں انتہائی تعلقِ خاطر تھا، سال کے بارہ مہینوں کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ چھ مہینے جون پور میں قیام کرتے اور چھ مہینے شیخ محمد افضل کی خدمت میں الٰہ آباد رہتے۔ شیخ محمد یحییٰ بن محمد امین عباسی الٰہ آبادی (صاحب وفیات الاعلام) سے بہت رابطہ رکھتے تھے۔

شیخ امام الدین جون پوری، شاعر بھی تھے، انھوں نے فارسی میں نہایت عمدہ اور اچھے شعر کہے۔ علاوہ ازیں عابد و زاہد، صلاح و تقویٰ کے زیور سے آراستہ اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ ماہِ رجب ۱۱۲۶ھ میں فوت ہوئے[۱۴۱]

۴۲۔ مولانا امان اللہ کشمیری دہلوی

مولانا امان اللہ بن خیرالدین حنفی کشمیری، شیخ اور فاضل آدمی تھے، صغر سِنی ہی میں علومِ درسیہ سے فراغت حاصل کر لی تھی اور محبوبِ اقران ہو گئے تھے، دیارِ کشمیر کے کبار علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حسنِ اخلاق کے مالک اور نہایت نیک تھے۔ کشمیر میں درس و افادہ کی مسند بچھائی، اس لیے کشمیر کہلائے۔ پھر عازمِ دہلی ہوئے اور وہاں عہدۂ صدارت پر مامور کیے گئے، لہٰذا دہلوی مشہور ہوئے۔ شیخ الاسلام کے منصب سے سرفراز ہوئے۔ کتبِ درسیہ پر تعلیقات و حواشی تحریر کیے اور اپنے وقت کے جید علما میں سے گردانے گئے ـــــ ۱۱۵۱ھ کو پانی پت اور کرنال کے درمیان نادر شاہ درانی سے جو معرکۂ قتال

---

[۱۴۱] وفیات الاعلام، ص ـــــ تجلیٔ نور۔ ج ۲، ص ۵۷ ـــــ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۷۲۰، ۷۲۱ ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۳۷، ۳۸

گرم ہوا، اس میں قتل کیے گئے۔[۴۲]

۴۳ - حافظ امان اللہ بنارسی

حافظ امان اللہ بن نور اللہ بن حسین حنفی بنارسی، عالمِ کبیر اور شیخ وقت تھے۔ فقہ، اصول اور علمِ کلام کے ماہر تھے۔ مولد و منشا بنارس ہے۔ قرآنِ مجید حفظ کیا اور حصولِ علم کی غرض سے عازمِ سفر ہوئے۔ کتبِ درسیہ شیخ محمد ماہ دیوکامی، شیخ قطب الدین حسینی شمس آبادی اور دیگر علما و اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں لکھنؤ کی مسندِ صدارت پر مامور ہوئے ——— صاحبِ "سُلّم" اور "مسَلّم" قاضی محب اللہ بہاری سے ان کے مباحثات و مطارحات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مصنف و شارح بھی تھے، ان کی تصنیفات میں اصولِ فقہ کے موضوع پر ایک کتاب "المفسر" ہے، پھر "المحکم الاصول" کے نام سے اس کی شرح سپردِ قلم کی۔ تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا۔ علاوہ ازیں عضدی، تلویح، حاشیۃ القدیم، شرح المواقف، شرح عقائد (جلال الدین دوانی) اور رشیدیہ (شیخ محمد رشید جون پوری) پر حواشی اور شروح لکھے۔ صاحب "الافق المبین" سید محمد باقر حسینی اور صاحب "الشمس البازغہ" علامہ محمود جون پوری پر حکمت و فلسفہ کے بعض مسائل میں انھوں نے محاکمہ تحریر کیا۔ نیز شیخ محب اللہ الہ آبادی کی "تسویہ" کی شرح قلم بند کی۔

حافظ امان اللہ بنارسی نے ۱۱۳۳ھ کو بنارس میں وفات پائی۔[۴۳]

---

[۴۲] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۶ ——— حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲، ۴۴۳ ——— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۳۸، ۳۹ ——— تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷ روضۃ الابرار، ص ۶۰، ۶۱

[۴۳] سبحۃ المرجان، ص ۷۸ ——— تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷ ——— ابجد العلوم، ص ۹۰۶ ——— حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۶، ۴۳۷ ——— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۳۹ ——— مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۰۲، ۲۰۳ ——— تذکرہ مشائخ بنارس، ص ۲۹ تا ۴۲

۴۴۔ مولانا امین الدین کنتوری

مولانا امین الدین بن مولانا بدیع الدین بن عطاء اللہ بن محمد شریف حسینی مداری کنتوری، شیخ، عالم، فقیہ اور اللہ کے صالح بندے تھے۔ کنتور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ شیخ نظام الدین سہالوی سے اخذِ علم اور کسبِ طریقت کیا۔ شیخ صفت اللہ حسینی خیرآبادی محدث سے سندِ حدیث حاصل کی۔ اپنے والد مولانا بدیع الدین کنتوری کی ایک کتاب "عطار الایمان" کی شرح لکھی۔

مولانا امین الدین کنتوری کے تین بیٹے تھے اور تینوں عالم تھے۔ ان کے نام یہ تھے: فائق علی، عبدالواسع، عبدالجامع۔[۴۴]

۴۵۔ مولانا امین الدین مدراسی

مولانا امین الدین بن سیف الدین بن نظام الدین صدیقی مدراسی، اہل فضل و کمال بزرگ تھے اور مدراس کے علمائے مشاہیر میں گردانے جاتے تھے۔ ۱۱۲۶ھ کو پیدا ہوئے اور بعض کتبِ درسیہ اپنے علاقے کے نامور اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں مولانا نظام الدین بن قطب الدین انصاری سہالوی کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو کر اخذ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وطن کو مراجعت کی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان سے خلقِ کثیر نے استفادہ کیا، جن میں شیخ محمد غوث بن ناصر الدین شافعی مدراسی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔

مولانا امین الدین مدراسی اپنے علاقے اور زمانے کے جید عالم تھے، تمام مروجہ علوم و فنون پر گہری نظر رکھتے تھے، کثیر الدرس اور کثیر الفوائد بزرگ تھے۔ ۶ رمضان المبارک ۱۱۹۵ھ کو رامنات میں فوت ہوئے اور حظیرہ امان اللہ خاں میں بلدۂ ویلور میں

۴۴؎ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۳۹، ۴۰ بحوالہ بحر ذخار

دفن کیے گئے۔[۴۵]

۴۶۔ مولانا امین الدین جون پوری

مولانا امین الدین بن غیاث الدین محمود عمری جون پوری، حنفی المسلک تھے، اپنے علاقے اور عہد کے شیخ و فاضل بزرگ تھے، فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ۲۵ رجب ۱۰۷۲ھ کو جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بعض درسی کتابیں صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری کے بیٹے شیخ محمد ارشد جون پوری سے پڑھیں اور اکثر کتابوں کی تکمیل دیگر اساتذہ عصر سے کی۔ بحث و اشتغال میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ فقہ اور دیگر علوم دینیہ کے علاوہ ہیئت، ہندسہ، حساب، اصطرلاب اور مواریث وغیرہ بہت سے فنون و مباحث میں ماہر کامل تھے، حصولِ علم کے بعد مسندِ تدریس پر فائز ہوئے۔

مولانا امین الدین جون پوری سے بہت سے علما و طلبا نے استفادہ کیا، ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں شیخ غلام رشید بن محب اللہ جون پوری بھی شامل ہیں۔ ممدوح کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، ان کی تصنیفات میں ایک کتاب "وسیلۃ النجات" ہے، جس کو تذکرۂ مشائخ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں شیخ محمد رشید جون پوری سے لے کر شیخ معین الدین اجمیری تک کے حالات مندرج ہیں۔ ایک کتاب "المقتنیات" ہے، جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی "اشعۃ اللمعات" کی تلخیص ہے، ایک "منتخبات گنج ارشدی" ہے۔ "شرح المعمول" پر حاشیہ سپردِ قلم کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض کتب و رسائل تحریر کیے۔

مولانا امین الدین جون پوری ۱۱۳۵ھ تک زندہ تھے۔[۴۶]

---

[۴۵] حدیقۃ المرام، ص — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۴۰

[۴۶] تذکرۃ العلما۔ ج ۲، ص ۹۷ — تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۷۴۸ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۴۰، ۴۱

۴۷- مولانا انگنون جون پوری

مولانا انگنون صدر جہان حنفی جون پوری، شیخ اور عالم کبیر تھے، معقولات و منقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے، جون پور کی منصبِ صدارت پر فائز ہوئے اور نصف عمر تک یہ خدمت انجام دی۔ صالحیت، تدین اور عفت میں یگانہ تھے، قضا کے سلسلے میں بہترین کردار اور شہرت کے مالک تھے، مباحثہ و مناظرہ سے انتہائی دلچسپی رکھتے تھے اور درس و افادہ میں بہت مصروف رہتے تھے۔ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔[۴۷]

۴۸- مولانا اوغلان خراسانی

مولانا اوغلان حسینی خراسانی، مسلکاً حنفی تھے، شیخ اور فاضل بزرگ تھے، فقہ، اصول اور علومِ عربیہ کے عالم تھے۔ خراسان کے باشندے تھے، اپنے تلمیذ غازی الدین خاں کے ساتھ ہندوستان آئے اور اورنگ زیب عالم گیر سے تقرب پیدا کیا، عالم گیر نے ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے کام بخش کا معلم مقرر کر دیا تھا۔ اس کے بعد ارتقاو ترقی کی مختلف منزلیں طے کرنے لگے۔ ۱۰۹۶ھ میں عرض مکرر کا منصب عطا ہوا اور سیادت خاں کے لقب سے سرفراز کیے گئے۔ پھر دیوانِ خاص کے ناظر بنادیے گئے۔ بعد ازاں ہندوستان کی صدارتِ عظمیٰ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے، لیکن بہت تھوڑے دن اس منصب پر متمکن رہے اور ۱۱۰۹ھ میں وفات پا گئے۔[۴۸]

ب

۴۹- شیخ باسط علی قلندر الہ آبادی

شیخ باسط علی قلندر کا سلسلۂ نسب یہ ہے: باسط علی بن محمد ماہ بن فیروز بن سالم

---

[۴۷] تذکرۃ العلماء- ج ۲، ص ۹۷ —— تاریخ شیرازِ ہند جون پور، ص ۴۸، —— نزھۃ الخواطر- ج ۶، ص ۴۱

[۴۸] مآثر عالم گیری، ص ۳، ۴۷، ۵۱۸ —— نزھۃ الخواطر- ج ۶، ص ۴۱

بن قاسم بن ناصر بن بہار الدین نقوی نیسا پوری کنتوری ثم الہ آبادی۔ شیخ باسط علی اعمالِ الہ آباد کے ایک گاؤں بدگدھا میں پیدا ہوئے۔ چند ابتدائی کتابیں پڑھیں اور شیخ اللہ دیہ احمد لاہر پوری سے بیعت ہو گئے، ایک سال ان کی خدمت میں رہے۔ پھر شیخ نے ان کو حصولِ علم کا حکم دیا اور وہ ۱۱۴۴ھ میں خیر آباد چلے گئے۔ وہاں شیخ صفت اللہ خیر آبادی کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے۔ پانچ سال ان کے حلقۂ تلمذ میں رہے۔ ان سے ہدایۃ الفقہ، شرح المواقف مع حاشیہ سید زاہد اور باقی کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ سندِ حدیث بھی انہی سے حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن الہ آباد تشریف لے گئے اور درس و افادہ کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ ان سے بہت سے علما و طلبا نے استفادہ کیا، جن میں شیخ عبدالقادر عمادی جون پوری، شیخ محمد کاظم قلندر کاکوروی اور خلقِ کثیر شامل ہے۔

شیخ باسط علی الہ آبادی مشہور مشائخ عصر، معروف علمائے وقت اور نامور فقہا میں سے تھے۔ انھوں نے ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ کو الہ آباد میں وفات پائی [۱]

۵۰۔ شیخ بدر الدین جون پوری

شیخ بدر الدین جون پوری حنفی المسلک اور اپنے دور کے نامور عالم و فقیہ تھے، شیخ کبیر الدین انصاری کی اولاد سے تھے، جن کا سلسلۂ نسب شیخ الاسلام اسماعیل تک منتہی ہوتا ہے۔ علمِ طریقت شیخ پیر محمد لکھنوی سے حاصل کیا، تصوف و طریقت اور شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کے اشعار میں سے چند شعر یہ ہیں:

گفتم بطبیب از دردِ نہان — گفتا کہ ز غیر دوست بر بند زبان
گفتم کہ غذا، گفت ہمیں خونِ جگر — گفتم پرہیز، گفت از ہر دو جہان
قومی ہمہ نیستی ز ہستی نگرند — جمعی ہستی ز نیستی باز خرند

۱؎ اصول المقصود، ص —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۴۳

آنہاں کہ زہست و نیست آسان گزرند بیناتر و آشناتر و آسودہ تر اند

شیخ بدرالدین جون پوری نے یکم ربیع الاوّل ۱۱۱۱ھ کو بہتر ۷۲ سال عمر پاکر جون پور میں انتقال کیا۔[۵۲]

۵۱ - شیخ بدر رفاعی

شیخ بدر بن غالب بن یعقوب بن شعبان حسینی رفاعی، گلبرگہ کے رہنے والے تھے۔ نیک اور صالح عالم دین تھے۔ محدث و فقیہ، عارف و صوفی اور کمالاتِ ظاہری و باطنی سے متصف تھے۔ ۴ شعبان ۱۱۰۸ھ کو گلبرگہ (ہندوستان) میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔[۵۳]

۵۲ - شیخ بدرِ عالم ساداموی

شیخ بدرِ عالم بن محمد باقر قدوائی سادامؤی نے بعض کتبِ درسیہ حافظ محمد قاسم بن عبدالکریم بجنوری سے اور زیادہ تر دیگر اساتذہ سے پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حافظ محمد قاسم سے اخذِ طریقت بھی کیا اور ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہے۔ پھر خود مسندِ ارشاد بچھائی۔ فقیہ، مجاہد، مرتاض اور صاحبِ کشوف و کرامات تھے۔ شیخ غلام یحییٰ بہاری اور دوسرے حضرات نے ان سے فیض حاصل کیا —— ۴ شعبان ۱۱۸۰ھ کو سادامئو میں وفات پائی جو ہندوستان کے صوبہ یوپی میں ایک قریہ ہے۔[۵۴]

۵۳ - شیخ بہلول برکی

شیخ بہلول برکی جالندھری، فاضل بزرگ تھے اور علاقہ جالندھر کی اس افغان برادری

---

۵۲ نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۴۴، ۴۵۔ بحوالہ گنج ارشدی

۵۳ نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۴۵، ۴۶۔ بحوالہ مہر جہاں تاب

۵۴ نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۴۶ بحوالہ بحر زخار

سے تعلق رکھتے تھے، جو برکی کہلاتے ہیں۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔
اس زمانے میں جالندھر کو دیار پنجاب میں علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور وہاں سید عبدالرشید، سید کبیر اور سید عتیق اللہ کے درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے، شیخ بہلول نے انہی سے استفادہ کیا۔ پھر شیخ محمد سعید بن محمد یوسف انبالوی کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے اخذ طریقت کیا اور بہت مستفیض ہوئے۔ بعد ازاں لاہور کا قصد کیا اور شیخ بلاق لاہوری سے طریقۂ قادریہ میں حصول فیض کیا۔
شیخ بہلول جالندھری کو تصنیف و تالیف سے خاص دلچسپی تھی، کثیر التصانیف بزرگ تھے، بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں فوائد الاسرار، احوال نامہ، شرح دیوان حافظ شامل ہیں۔ شیخ بہلول برکی شاعر بھی تھے، ان کا ایک دیوانِ شعری موجود ہے ــــــ ۱۰۷۰ھ کو جالندھر میں فوت ہوئے ۵۵

ت

۵۴۔ مفتی تابع محمد لکھنوی

مفتی تابع محمد بن مفتی محمد سعید حسینی لکھنوی، شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی۔ کچھ کتابیں اپنے والد مفتی محمد سعید سے پڑھیں۔ پھر شیخ احمد بن ابو سعید امیٹھوی معروف بہ ملا جیون کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ علم و فضل میں ماہرِ کامل ہوئے اور اللہ نے فتویٰ و تدریس کی صلاحیت سے بہرہ یاب کیا۔ ان کے والد مفتی محمد سعید حسینی لکھنؤ کے منصبِ قضا پر متعین تھے، والد کی وفات کے بعد مفتی تابع محمد نے یہ مسند سنبھالی۔ فقہ حنفی میں عبور حاصل تھا، ۱۱۲۸ھ میں اس موضوع پر "السراج المنیر" کے نام سے

---

۵۵ خزینۃ الاصفیا، ص ۴۹۸ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۴ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۴۸ ــــ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ۔ پنجاب یونیورسٹی بہ ضمن لفظ برکی۔

ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

منك الهداية واليك النهاية يا من نوّر بعلم الفقه قلوب اولى الالباب۔

علامہ سید عبدالحی حسنی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے[۱]

۵۵۔ میر تاجو کشمیری

میر تاجو حسینی کشمیری، حنفی مسلک کے حامل تھے، شیخ اور فاضل بزرگ تھے، فقہ، اصول اور علومِ عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ خواجہ حیدر چرخی کشمیری اور خواجہ محمد ٹوپی گر کشمیری کے شاگرد تھے۔ طویل عمر پا کر ۱۱۱۱ھ میں انتقال کیا۔ زندگی کے آخری دم تک فقر و قناعت کی کیفیت طاری رہی اور علومِ دینیہ کی تدریس میں مشغول رہے[۲]۔

ج

۵۶۔ مرزا جان جاناں دہلوی

علمی و فکری لحاظ سے زرخیز اور پُر ثروت ارضِ ہند نے جن نامور اصحابِ علم اور مقتدر اربابِ کمال کو جنم دیا، ان میں مرزا جان جاناں جو تاریخ میں مرزا مظہر جان جاناں کے نام سے معروف ہیں، ایک رفیع المرتبت عالمِ دین تھے۔ ان کے والد کا اسمِ گرامی مرزا جان، دادے کا نام عبدالسبحان اور پردادے کا نام محمد زمان علوی تھا۔ مرزا نسباً علوی تھے۔ اکیس واسطوں سے ان کا سلسلۂ نسب، محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے ـــــ بارھویں صدی ہجری میں وہ اس برِ صغیر

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۹

[۲] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۹۱ ـــــ خزینۃ الاصفیا۔ ج ۲، ص ۳۵۹ ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۵۰

کے شیخ، امام، عالم، محدث، فقیہ اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔

مرزا جانِ جاناں کے والد مرزا جان، مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے منصب دار تھے اور دکن میں متعین تھے۔ اورنگ زیب دکن میں تھا کہ انھوں نے ملازمتِ شاہی ترک کر دی اور تمام ساز و سامان غربا و فقرا میں تقسیم کر دیا۔ صرف پچیس ہزار روپے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے بچا کر رکھے تھے، ایک دوست کو ضرورت پڑی تو وہ بھی دے دیے۔ مرزا جان حکومت کے منصب و جاہ سے الگ ہونے کے بعد اکبر آباد (آگرہ) جا رہے تھے کہ علاقہ مالوہ میں کالا باغ کے مقام پر قیام کیا، اور وہیں جمعہ کی شب ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۱۱ھ (ایک روایت کے مطابق ۱۱۱۳ھ) کو ان کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی۔ اس کی اطلاع بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر کو پہنچی تو اس نے نومولود کا نام مرزا جان کے نام کی مناسبت سے جانِ جان رکھا، اور کہا:

پسر جانِ پدر می باشد ازیں وجہ نامش جانِ جان مقرر کردیم۔

بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے، اس لیے ہم نے اس کا نام جانِ جان قرار دیا۔

جانِ جان بعد میں بدل کر جانِ جاناں ہو گیا۔ اس نام نے اتنی شہرت پائی اور اس درجہ مقبولیت حاصل کی کہ خود مرزا صاحب بھی اپنے خطوط میں یہی نام (یعنی جانِ جاناں) لکھنے لگے ـــــ شمس الدین حبیب اللہ ان کا لقب تھا، اور مظہر تخلص کرتے تھے۔ پورا نام شمس الدین حبیب اللہ مرزا مظہر جانِ جاناں تھا۔

مرزا جانِ جاناں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے، آغوشِ پدری میں تربیت پائی۔ شفیق باپ نے ہونہار بیٹے کو آداب و اخلاق، فنونِ سپاہ گری اور دیگر مروجہ علوم کی تعلیم دی۔ چند فارسی رسائل بھی پڑھائے۔

مرزا صاحب نے قرآنِ مجید مع قراءت و تجوید کے قاری عبدالرسول دہلوی سے پڑھا جو شیخ القرا عبدالخالق مصری کے تلمیذ تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچے تو والد وفات پا گئے۔ ان کے بعد حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تحصیل کی۔ ان علوم سے فارغ ہونے کے بعد خود مسندِ تدریس آراستہ کی اور بے شمار لوگوں کو مستفید فرمایا۔

پھر طریقت و تصوف کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی اور نقشبندی سلسلے کے ایک بزرگ شیخ نور محمد بدایونی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ چار سال ان سے کسبِ فیض کرتے رہے اور ۱۱۳۵ھ میں خرقہ و اجازت حاصل ہوئی۔ شیخ نور محمد بدایونی سے مرزا صاحب کو انتہائی عقیدت تھی۔ ان کی وفات کے بعد ایک اور بزرگ حافظ سعد اللہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ بارہ سال ان کی خدمت میں رہے، ان کے انتقال کے بعد شیخ محمد عابد سنامی سے بیعت ہوئے ——— ۱۱۵۵ھ میں مرزا ممدوح نے خود سلسلۂ رشد و ہدایت کا آغاز کیا۔

خود نوشت حالات

مرزا صاحب نے تین مقامات پر اپنے مختصر حالات لکھے ہیں۔ ایک جگہ تو کسی صاحب کے خط کے جواب میں، دوسرے اپنے فارسی دیوان کے دیباچے میں اور تیسرے میر سید غلام علی آزاد بلگرامی کی فرمائش پر ان کی تصنیف "سروِ آزاد" کے لیے۔! یہ مرزا صاحب اور ان کے اجدادِ کرام کا بہت ہی مختصر سا تعارف ہے، اور وہ بھی نہایت انکسار کے ساتھ۔! ان تینوں مقامات کا اردو ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ ایک خط کے جواب میں انھوں نے جو کچھ لکھا، وہ درج ذیل ہے:

"برخوردار! تم نے دوبارہ التماس کی ہے کہ فقیر اپنا حسب و نسب لکھے۔ چوں کہ اس میں کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، اس لیے میں نے تغافل کیا۔ اب جب کہ [تمھاری] منت سماجت حد سے بڑھ گئی ہے، تو مختصر طور پر تحریر کیا جاتا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے، حقیقت میں تو اس فقیر کے سرمایۂ وجود کا آغاز ایک قطرۂ آب اور انجام ایک مشتِ خاک ہے۔ اور اس عالمِ اعتبار میں خاکسار کی نسبت کا سلسلہ چھبیس [۲۶] واسطوں سے حضرت محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ فقیر کے اجداد میں سے ایک بزرگ [جن کا نام امیر کمال الدین تھا] آٹھویں صدی ہجری میں کسی وجہ سے [ترکِ وطن کر کے] طائف سے ترکستان آ گئے تھے۔ انھوں نے اس علاقے کے ایک حاکم (جو قبیلۂ الوس قاقشان کا سردار تھا) کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس حاکم کا کوئی لڑکا نہ تھا، لہٰذا

اس علاقے کی حکومت کا تعلق ان کی اولاد سے ہو گیا۔ جب ہمایوں بادشاہ نے مملکتِ ہندوستان کو سرکش پٹھانوں سے نجات دلائی تو وہ اس خاندان کے دو بھائیوں محبوب خاں اور بابا خاں کو ساتھ لایا، جن کا سلسلہ تین پشت پر امیر کمال الدین سے ملتا تھا۔ ان دونوں کا حال عہدِ اکبری کی تاریخوں میں مرقوم ہے۔ ان بزرگوں کا مادری نسب نامہ امیر صاحبِ قران [تیمور لنگ] کے خاندان تک پہنچتا ہے، اور فقیر کا سلسلہ چار واسطوں سے بابا خاں تک منتہی ہوتا ہے۔ خان مذکور [بابا خاں] نے عہدِ اکبری میں بغاوت کی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں میرے والد بھی کم منصبی کی سزا میں گرفتار تھے۔ انھوں نے عمر کا بڑا حصّہ اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں گزارا۔ آخر ترکِ دنیا کی دولت سے مفتخر اور ممتاز ہوئے اور سلسلۂ قادریہ کے ایک بزرگ سے استفاضہ کیا۔ میرے والد نے ۱۱۳۰ھ میں اس دنیا سے رحلت کی۔ فقیر کی ولادت ۱۱۱۳ھ میں ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ بیس سال کی عمر میں کمرِ ہمت باندھ کر دنیا سے ہاتھ اٹھالیا اور فقر کی راہ میں ریاضت شروع کی۔ علومِ متعارفہ والد کے زمانے میں پڑھے اور کتبِ حدیث حاجی محمد افضل سیال کوٹی کی خدمت میں پڑھیں، جو شیخ المحدثین شیخ عبداللہ بن سالم مکّی کے شاگرد تھے۔ قرآنِ مجید شیخ القرا شیخ عبدالخالق شوقی کے شاگرد حافظ عبدالرسول دہلوی سے پڑھا۔ طریقہ نقشبندیہ کا خرقہ اور اجازتِ مطلقہ جناب سید السادات نور محمد بدایونی سے حاصل کیے، جن کا سلسلہ دو واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ ایک عمر اُن کی خدمت میں گزاری۔ ان کی وفات کے بعد اس طریقے کے متعدد مشائخ سے استفادہ کیا اور پھر مدت تک فیض آشیانہ حضرت شیخ الشیوخ محمد عابد سنامی کے آستانہ پر جبہ سائی کی۔ ان کا سلسلہ بھی دو واسطوں سے حضرت مجدد سے ملتا ہے۔ ایک عرصے تک ان کی خدمت کر کے قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ طریقوں کا خرقہ اور اجازت ان سے حاصل کی۔ آج تک کہ ۱۱۸۵ھ ہے، ان بزرگوں کے حکم کے مطابق تیس سال سے طالبانِ خدا کی تربیت کر رہا ہوں۔ خدا خاتمہ بالخیر کرے —— ۱۱۸۵ھ

دیباچہ دیوانِ فارسی میں لکھتے ہیں:

"حمد و صلوٰۃ کے بعد فقیر جان جاناں، متخلص بہ مظہر پسر جان، جانی تخلص کہ علوی نسب و ہندی مولد و حنفی مذہب اور نقشبندی مشرب ہے، اپنے احوال دوستوں کی خدمت میں پہنچاتا ہے —— سولہ سال کی عمر میں یہ خاکسار یتیم ہوگیا اور بیس سال کی عمر میں درویشوں میں شامل ہوگیا۔ تیس سال تک مدرسہ اور خانقاہ میں جاروب کشی کی، باقی زندگی بھی اسی شغلِ شریف میں گزار دی۔ اللہ کی دی ہوئی ہمت اور توفیق سے پوری زندگی، دستِ طلب کو دنیا کی گندگی سے آلودہ نہیں کیا اور پائے سعی کو اس راہ میں نہ رکھا۔ آج کہ ۱۱۷۰ھ ہے اور میری عمر ساٹھ (۶۰) سال ہے، بیس سال سے کنجِ عزلت میں پناہ گزین ہوں اور حضرات مشائخ کے احکام کے مطابق انسانوں کے نسخۂ وجود کی تصحیح میں مشغول ہوں، جن کی ذات کے فردِ باطل میں ہزاروں غلطیاں ہیں۔ عہدِ جوانی میں شورِ عشق کی تحریک پر جو کہ جوانی کے خمیر کا نمک ہے، نالہائے درد موزوں کیے تھے، جس لیے شاعری میں میرا نام آگیا۔ والاہمتی کی وجہ سے اجزائے مسودات و موادِ کلیات اکٹھا نہ کیا، بہت سا سرمایۂ سخن برباد ہوگیا۔ باقی میں اربابِ نقل و روایت نے نمایاں تصرف کر کے غلط کلام کو رواج دے دیا۔ کور سوادوں نے جو آنکھوں سے محروم تھے، انصاف کو پسِ پشت ڈال دیا۔ شاعری پر اعتراضات کیے اور مغزِ سخن کو نہ پہنچ پائے۔ ان اعتراضات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوئی۔ اس کم فرصتی کے زمانے میں جب کہ موت کا خوف بہت زیادہ ہے اور یہ طویل سفر درپیش ہے، ان اعتراضات کا جواب میرے بس میں نہیں تھا۔ ایک نوجوان سراپا جان نے اس کلام کو ترتیب دینے اور تصحیح کرنے کے لیے کہا، بہت تلاش و جستجو کے بعد بیس ہزار اشعار میں سے تقریباً ایک ہزار ملے اور وہ بھی بے ترتیب ردیف، اور اکثر غزلیں ناتمام ہاتھ آئیں۔ اس مجموعے کے علاوہ جو کچھ سامنے آئے، اسے [میرے اشعار سے] خارج سمجھا جائے۔ ہاں وہ تازہ کلام جو کہنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے، اور جو کلام قدیم مسوداتِ میر سے ملے، اس میں شامل کر لیا جائے۔ بیس سال پہلے فقیر کے کچھ اشعار ایک عزیز فراہم کر کے میرے پاس لایا تھا اور اس پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے چند سطریں لکھ دی تھیں، اب اسے قابلِ اعتبار نہ سمجھا جائے،

کیوں کہ وہ تمام اشعار بھی اسی میں شامل ہیں۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی تصنیف "سروِ آزاد" کے لیے مرزا صاحب سے ان کے حالات طلب کیے تو مندرجہ ذیل سطور لکھ کر ارسال فرمائیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

"فقیر جانِ جاناں متخلص بہ مظہر، پسر مرزا جان متخلص جانی، نسباً علوی، مولداً ہندی، مذہباً حنفی، مشرباً نقشبندی ہے۔ ظاہری نشو و نما اکبر آباد میں ہوئی اور باطنی تربیت شاہ جہان آباد میں حضرت سید نور محمد بدایونی نقشبندی مجددی کی خدمت میں ہوئی۔ سلسلۂ نسب اٹھائیس[1] واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر منتہی ہوتا ہے۔

"اس فقیر کے جدِ اعلیٰ امیر کمال الدین نویں[2] صدی ہجری کے ابتدا میں طائف کے علاقے سے نکل کر ترکستان کے علاقے میں آباد ہو گئے اور اس ملک کے بعض فرماں رواؤں کے ساتھ زندگی گزاری۔ ان کی بہت زیادہ اولاد تھی۔ ان میں سے امیر مجنون اور امیر بابا اس زمانے میں ہندوستان آئے جب ہمایوں بادشاہ نے ملک فتح کیا۔ اس کے بعد سلاطین مغلیہ کی خدمت اور رفاقت اس خاندان کا شعار رہا ہے۔ (میرے والد) مرزا جان جن کا سلسلۂ نسب چھٹی پشت پر امیر بابا سے اور بارھویں پشت پر امیر کمال الدین سے ملتا ہے، عہدِ اورنگ زیب بادشاہ علیہ الرحمۃ میں منصبِ[3] عالی ترک کر کے گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ بچپن ہی سے اس خاکسار کو ہوس جاہ و مال نے پریشان نہیں کیا۔ اس امید پر کہ دوسری دنیا میں چشمِ بصیرت وا ہو سکے، حصولِ ضروریات کے بعد اس فقیر نے خود کو فقرا کے دامن سے وابستہ کر لیا، اور نقشِ قدیم کی طرح ان کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ لہٰذا اس فقیر کا

---

[1] اس سے پہلے چھبیس واسطے لکھا جا چکا ہے۔ قرینِ صحت معلوم نہیں کیا ہے۔ چھبیس یا اٹھائیس۔

[2] پہلے گزر چکا ہے کہ ایک مکتوب میں مرزا صاحب نے آٹھویں صدی ہجری تحریر کیا ہے۔ معلوم نہیں، صحیح کیا ہے؟

[3] اس سے پہلے مرزا صاحب نے خود لکھا ہے "میرے والد بھی کم منصبی کی سزا میں گرفتار تھے"۔

دماغ ضعفِ قویٰ کا شکار ہے، اس میں تدبیر اسباب کی تاب نہیں رہی، تجرید و تعزیہ اختیار کرلی ہے۔ گُل کی طرح تمام زندگی ایک ہی لباس میں گزار دی، شورِ عشق کی تحریک سے جو کہ اس کے خمیر کا نمک ہے، کبھی کبھی فریاد کے لیے لب کھولتا ہے۔ چوں کہ اس کا نالہ موزوں ہوتا ہے، اس لیے احباب جوہر شناسی کی وجہ سے انھیں اشعار سے تعبیر کرتے ہیں، ورنہ اپنی بے سرمائیگی کے پیشِ نظر غایت انصاف کی بنا پر اس نے دکان سخن نہیں لگائی۔"

مرزا کے بعض آبا و اجداد

مرزا صاحب کے خود نوشت مختصر حالات میں متعدد حضرات کے نام آئے ہیں، ان کے بعض آبا و اجداد کے بھی اور بعض اساتذہ و مرشدین کے بھی —! مناسب معلوم ہوتا ہے یہاں اختصار کے ساتھ ان کے حالات بھی بیان کر دیے جائیں۔ ان کے آبا و اجداد میں امیر مجنون، امیر بابا اور خود مرزا کے والد مکرم مرزا جان کے نام دکھائی دیتے ہیں، اور مرشدین و اساتذہ میں حاجی محمد افضل سیالکوٹی اور سید نور محمد بدایونی کے! ان کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

۱۔ امیر مجنون خان کا نام ان لوگوں میں شامل ہے جو ہندوستان پر ہمایوں کے حملے کے زمانے میں اس کے ساتھ ہندوستان آئے۔ ہمایوں کی وفات کے وقت مجنون خاں نارنول کا جاگیر دار تھا۔ بعد میں حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ مجنون خاں دہلی آگیا اور اکبر بادشاہ نے اسے مانک پور کی جاگیر عطا کر دی۔ مجنون خاں امیر بابا کا بھائی تھا، اس نے بہت سے اہم معرکوں میں حصہ لیا۔ ۹۷۱ھ میں جب جون پور کے صوبہ دار علی قلی خاں نے اکبر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو اس کی سرکوبی کے لیے بادشاہ خود فوج لے کر آگے بڑھا۔ مجنون خاں دائیں بازو کی فوج کا سپہ سالار تھا، اس معرکے میں شاہی فوج فتح یاب ہوئی۔

۹۷۶ھ میں اکبر نے اسے تسخیرِ کالنجر پر مامور کیا، مجنون خاں فوج لے کر گیا تو کالنجر کے حاکم رام چندر نے مقابلے میں آنے کی جرأت نہیں کی اور بغیر جنگ کے ہتھیار ڈال دیے۔ اس سے اکبر کے دل میں امیر مجنون خاں کا احترام بہت بڑھ گیا اور ۹۸۹ھ میں جب شاہی فوج نے بنگال فتح کیا تو مجنون خاں اور بابا خاں کو گھوڑا گھاٹ کی جاگیر عنایت کی اور مجنون خاں کو سہ ہزاری

منصب داروں میں شامل کیا۔ ۹۸۹ھ ہی میں مجنوں خاں کا انتقال ہوگیا[۵۴]۔ مجنوں خاں کی وفات کے بعد گھوڑا گھاٹ کی جاگیر کا حق دار اس کا بیٹا جباری خاں تھا، لیکن اکبر نے تمام جاگیر بابا خاں کو دے دی تھی۔

بابا خاں بھی عہدِ اکبری کے امرا میں شامل تھا، اکبر کے زمانے میں گجرات کا صوبے دار مظفر خاں تھا۔ اس نے "آئینِ داغ" نافذ کیا تھا۔ اس آئین کی رو سے ضروری تھا کہ تمام جاگیر دار اپنی فوج بھیجیں کہ سوار کا حلیہ لکھوائیں اور گھوڑے کے چہرے یا پچھلی ٹانگوں پر ایک داغ لگوائیں۔ لوگوں کی اکثریت اس قانون کے خلاف تھی۔ بابا خاں داغ کے لیے اپنے سوار بھیجتا تو مظفر خاں کے کارندے رشوت طلب کرتے۔ بابا خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ میں ستر ہزار روپے خرچ کر چکا ہوں لیکن ابھی تک سو گھوڑے بھی نہیں داغے گئے۔ مظفر خاں کے مظالم سے تنگ آکر جب معصوم خاں کابلی نے بغاوت کی تو مجنوں خاں کا لڑکا جباری خاں اور بابا خاں دونوں باغیوں میں شامل ہوگئے۔ مظفر خاں ٹانڈہ میں پناہ گزین ہوگیا تھا، وہ باغیوں کے ہاتھوں مارا گیا اور باغیوں نے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ فتح کے بعد منصب اور خطاب تقسیم ہوئے تو بابا خاں نے اپنے لیے خان خاناں کا خطاب اختیار کیا۔ اس کامیابی کے بعد بابا خاں بیمار پڑ گیا اور پھر اسی بیماری میں اس کی وفات ہوگئی —— اکبر نے جب باغیوں پر قابو پالیا تو مجنوں خاں کے بیٹے جباری خاں کو گرفتار کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد جباری خاں نے بغاوت میں شمولیت پر اظہارِ ندامت کیا تو اکبر نے اسے رہا کر دیا۔

اس بغاوت کے نتیجے میں بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر نے اس خاندان کے لیے حکومت کے اعلیٰ مناصب بند کر دیے —— اس کے طویل عرصے بعد اورنگ زیب عالم گیر کا دور آیا تو صرف مرزا مظہر جان جاناں کے والد مرزا جان جانی کا نام مغلیہ حکومت کے منصب داروں میں شامل ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی ملازمت کی کیا نوعیت تھی۔ وہ اعلیٰ مناصب

---

۵۴ تفصیل کے لیے دیکھیے: اکبر نامہ - ج ۲، ص ۳۵۷ —— آئینِ اکبری - ج ۱، ص ۲۲۳ —— مآثر الامرا - ج ۳، ص ۲۰۹ تا ۲۱۱ —— تذکرہ ہمایوں و اکبر، ص ۲۴۱

کے لوگوں میں شامل تھے یا کم حیثیت کے ملازمین میں!

مرزا کے والد مرزا جان اورنگ زیب کے شاہی ملازمین میں سے تھے۔ ۱۱۱۰ھ میں وہ اورنگ زیب کے ساتھ دکن میں مقیم تھے۔ اسی سال انھوں نے ملازمت ترک کی اور مال و اسباب فقرا و مساکین کو دے دیا۔ منقول ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے پچیس ہزار روپے بچا کر رکھے تھے، ایک دن انھیں معلوم ہوا کہ ایک دوست کو روپے کی ضرورت ہے، ساری رقم اسے دے دی۔

مرزا جان کی قناعت اور توکل کے بارے میں کئی واقعات مشہور ہیں۔ کہتے ہیں، ایک بار انھوں نے گھر میں کدو کی بیل لگائی۔ ملازمہ نے کہا یہ بیل تو آپ نے لگالی ہے، ایسا نہ ہو کہ گھر میں کسی وقت تنگ دستی کی نوبت فاقے تک پہنچ جائے اور آپ اس بیل کے پتے کھانے لگیں، یہ بات شیوۂ توکل اور روحِ قناعت کے خلاف ہوگی۔ مرزا جان نے ملازمہ کی یہ بات سنی تو اسے معرفتِ الٰہی پر محمول کیا اور بیل جڑ سے اکھاڑ دی۔

مرزا جان، سلسلۂ قادریہ سے منسلک تھے اور شاہ عبدالرحمٰن قادری سے بیعت تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور جانی تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے نہ تصوف میں شہرت پائی، نہ شاعری میں —! گم نامی کی زندگی بسر کی۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا اور صوفیا کے تذکروں میں نہ ان کے حالات ملتے ہیں، نہ کلام کا پتا چلتا ہے[۵]

اساتذہ اور مرشد

مرزا صاحب نے کتب حدیث حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھیں۔ حاجی صاحب موصوف، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فرزندِ گرامی شیخ محمد معصوم کے خلیفہ تھے۔ ایک عالم اور متقی بزرگ تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی ان سے علمِ حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ کتابوں کے اس قدر شائق تھے کہ کسی طرف سے جو آمدنی ہوتی، اس سے کتابیں خرید لیتے۔ ایک مرتبہ کسی نے پندرہ ہزار روپے پیش کیے، انھوں نے اس تمام

---

۵ تفصیل کے لیے دیکھیے: معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۵ ــــ مقاماتِ مظہری، ص ۴ تا ۱۷

روپے کی کتابیں خرید لیں۔ ۱۱۴۶ھ کو دہلی میں فوت ہوئے اور مقبرہ خواجہ باقی باللہ میں دفن کیے گئے۔

سید نور محمد بدایونی سے مرزا صاحب نے فیض طریقت حاصل کیا۔ سید ممدوح سلسلۂ نقشبندیہ کے ممتاز بزرگوں میں سے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ سیف الدین بن شیخ محمد معصوم کے فیض یافتہ اور خلیفہ تھے۔ دیگر حضرات سے بھی کسبِ فیض کیا تھا۔ عابد و زاہد اور متبع سنتِ نبوی تھے۔ ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۳۵ھ کو دہلی میں وفات پائی اور بستی نظام الدین میں دفن ہوئے۔

ملوک و امرا سے کنارہ کشی

مرزا صاحب خوش شکل، خوب رو، وجیہ اور بارعب عالمِ دین تھے۔ نہایت مہذب، با اخلاق اور درویش منش بزرگ تھے، دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے اور اس کو رفع کرنے کی پوری کوشش کرتے، متوکل علی اللہ، مستغنی المزاج اور پیکرِ زہد و عبادت تھے۔ امرا و حکام اور اربابِ ثروت سے دور رہتے اور ان سے ملنے اور تحفے قبول کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے۔ اگر کوئی کچھ پیش کرتا تو صاف لفظوں میں انکار کر دیتے۔ ایک امیر نے رہنے کے لیے ایک حویلی اور خانقاہ اور غربا و مساکین کے لیے کچھ ذرائع خدمت پیش کیے، مگر مرزا صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ جب مکان اور مال و متاع چھوڑ کر ہی دنیا سے جانا ہے تو اپنا ہو یا دوسرے کا سب برابر ہے، ہر شخص کی روزی خدا کے ہاتھ میں ہے، جو ہر حالت میں بقدر حصہ پہنچتی ہے۔

ایک مرتبہ ہندوستان کے مغل حکمران محمد شاہ نے اپنے وزیر قمر الدین خاں کی وساطت سے پیغام بھجوایا کہ خدا نے ہمیں وسیع ملک عطا کیا ہے، جو علاقہ آپ مناسب سمجھیں قبول فرمایے مرزا صاحب نے جواب دیا قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ[۵۶]۔ متاع ہفت اقلیم قلیل فرمود

---

[۵۶] یہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۷۷ کے الفاظ ہیں۔ ترجمہ یہ ہے: (اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!) فرما دیجیے کہ دنیا کا مال و متاع چند روزہ ہے۔

است، نزدِ شما ہفتم حصہ آں قلیل، یک اقلیم ہندوستان است، پیش شما چیست کہ سرہمت فقرا بقبول آں فرود آید؟[۵۷]

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ "(اے رسول اکرم!) دنیا کا مال واسباب بہت قلیل ہے" ــــــ اللہ نے تو متاعِ ہفت اقلیم کو بھی قلیل قرار دیا ہے۔ آپ کے پاس تو اس قلیل کا بھی بہت کم حصہ ایک ہندوستان ہے، آپ کس بل بوتے پر یہ کہتے ہیں کہ فقرا اُسے قبول کریں۔

مرزا مظہر جان جاناں کے صبر واستغنا اور توکل کے بارے میں اس قسم کے بہت سے واقعات ان کے حالات میں مرقوم ہیں:

اخذ و قبولِ نذر کے پیمانے

انھوں نے تمام عمر مکان نہیں بنایا، ہمیشہ دوسروں کے مکان میں کرایہ پر یا عاریتاً مقیم رہے۔ خود کھانا نہیں پکاتے تھے، ضرورت کے وقت کھانا پکا ہوا لے آتے اور کھا لیتے۔ لباس کا یہ عالم تھا کہ کبھی دو جوڑے نہیں سلائے، ہمیشہ ایک جوڑا رکھا، میلا ہوا تو دھولیا، کسی کی نذر قبول نہیں کرتے تھے، البتہ اس ضمن میں انھوں نے چھ پیمانے مقرر کر رکھے تھے، کوئی اس معیار پر پورا اترتا تو اس کی نذر قبول فرما لیتے:

۱۔ نذر پیش کرنے والا بلند کردار آدمی ہو۔

۲۔ امرا اور اہلِ دنیا سے اختلاط اور میل جول نہ رکھتا ہو۔

۳۔ مجموعی طور پر صالح اور متقی انسان ہو۔

۴۔ حلال اور حرام کی تمیز رکھتا ہو اور پھر اس پر عامل بھی ہو۔

۵۔ غصب و نہب سے متنفر اور لوٹ مار سے کنارہ کش رہتا ہو۔

۶۔ جو کچھ دیتا ہو اس میں خلوصِ قلب کارفرما ہو۔

فرمایا کرتے کہ تحفے اور ہدیے کو ٹھکرا دینا اگرچہ ممنوع ہے، تاہم قبول کرنا بھی ضروری

---

۵۷ مقاماتِ مظہری، ص ۳۴

نہیں، میں اپنے انہی رفقا اور متعلقین کا تحفہ قبول کرتا ہوں، جن کے بارے میں یقین ہو کہ اخلاص اور احتیاط سے پیش کر رہے ہیں۔ میں اغنیا کا تحفہ قبول نہیں کرتا، ان کے تحائف و ہدایا عام طور سے مشتبہ اور مشکوک ہوتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اغنیا حقوق العباد کا خیال نہیں رکھتے، لہٰذا ان سے تحفہ قبول کرنا قیامت کے روز اللہ کے دربار میں بازپرس کا باعث بن سکتا ہے۔

اس ضمن میں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ ایک مرتبہ نظام الملک نے ان کی خدمت میں تیس ہزار نقد روپے پیش کیے، آپ نے قبول نہیں فرمائے اور کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ نظام الملک نے عرض کیا، اگر آپ کو ذاتی ضرورت نہیں تو مجھ سے لے کر مسکینوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیجیے، فرمایا، میں تمھارا خازن نہیں ہوں، اگر تقسیم کرنا چاہتے ہو تو یہاں سے باہر جا کر خود ہی تقسیم کر دو۔

مرزا مظہر جانِ جاناں، بارھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے عجوبۂ روزگار عالمِ دین تھے، ذکاوت و فطانت، زہد و ورع، قوتِ ادراک، اتباعِ سنت، ذکرِ الٰہی اور اقتفارِ آثارِ سلف میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ وہ مشائخ و صوفیا کے رسوم و عوائد کے پابند نہ تھے، ان کی مجالس میں جانے کے عادی نہ تھے اور نہ خود اپنا ہی اس قسم کا کوئی خاص حلقۂ تصوف و طریقت قائم کیا۔

اتباعِ سنت کا شدید جذبہ

مرزا مظہر جان جاناں کے زمانے کے حالات پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ہر طرف انحطاط ہی انحطاط اور زوال ہی زوال تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کا اقتدار تقریباً ختم ہو چکا تھا اور اس کے عروج کا آفتاب لب بام آ گیا تھا۔ بادشاہ اور امرا و رؤسا سب عیش و عشرت میں مبتلا تھے۔ صوفیا اور علما میں سے بھی بعض لوگ منصبِ اصلاح کو ترک کر چکے تھے، عقائدِ صحیحہ کو نظر انداز کر دیا گیا تھا، تعلیمِ قرآن اور اتباعِ سنت کا احساس تک بھی بہت سے ذہنوں میں باقی نہ رہا تھا۔ اس ماحول میں واقعی ایک مصلح کی ضرورت تھی، اور مرزا مظہر جان جاناں نے اس ضمن میں جو خدمات انجام دیں، وہ ہر اعتبار سے

لائقِ تحسین ہیں۔ وہ اتباعِ کتاب وسنت کا اس درجہ التزام کرتے تھے کہ اس دورِ انحطاط میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ ایک مرتبہ ان کے والد مرزا جان، انھیں اپنے پیرومرشد شاہ عبدالرحمٰن قادری کے پاس لے گئے۔ شاہ مذکور اس وقت سکر وسماع کی حالت میں تھے، اس حالت میں انھوں نے عصر اور مغرب کی نمازیں نہیں پڑھیں۔ مرزا صاحب نے شاہ عبدالرحمٰن کی یہ حالت دیکھ کر دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر والد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو کہا تو انکار کر دیں گے۔ مگر خیریت گزری کہ والد نے بیٹے کو بیعت کے لیے نہیں کہا۔

مرزا صاحب ممدوح کی پوری زندگی اتباعِ سنتِ نبوی کی واضح مثال تھی۔ وہ سلام کرنے میں بھی سنتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ملحوظ رکھتے تھے۔ شاہ غلام علی لکھتے ہیں:

مردم را با داب سلام موافقِ سنتِ رسولِ خدا تاکید می نمودند، و از دست بر سر داشتن و خم شدن منع می فرمودند[۵۸]

لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق سلام کرنے کی تاکید کرتے، اور سلام کے لیے سر پر ہاتھ رکھنے اور جھکنے سے منع فرماتے۔

مرزا صاحب جس طرح خود متبع سنتِ نبوی تھے، اسی طرح اپنے عقیدت مندوں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ وہ ان ہی لوگوں کو پسند فرماتے، جو اللہ اور رسول کے احکام کے پابند تھے۔ اپنے مریدوں سے کہا کرتے:

ایمان مجمل کہ ایمان آوردم بخدا و رسولِ خدا و آنچہ پیغمبر از خدا آوردہ است، دوست دارم، دوستانِ خدا و رسول را، و بے زارم از دشمنانِ خدا و رسول۔ بہ جہتِ نجات کافیست[۵۹]

میں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور اس چیز پر جو رسول اللہ اپنے خدا کی طرف سے لے کر آئے، ایمان لایا ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول سے پیار کرنے والوں سے پیار

---

۵۸ مقاماتِ مظہری، ص ۳۵ ۵۹ ایضاً، ص ۳۶

کرتا ہوں اور ان کے دشمنوں سے بے زار ہوں۔ بس نجات کے لیے یہی کافی ہے۔

مرزا صاحب کی اتباعِ سنت کی وجہ سے لوگ ان کو مرکزِ محبت ٹھہراتے، ان کا احترام کرتے اور کثیر تعداد میں ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوتے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ روہیلوں کی بہت بڑی تعداد ان کے مریدین میں شامل تھی۔ جس قدر روہیلے ان کے مرید تھے، شاید ہی کسی دوسرے بزرگ کے ہوں۔

مرزا صاحب شاہ ولی اللہ کی نظر میں

مرزا جان جاناں کے علم و فضل اور اتباعِ سنت کی وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ان کا انتہائی احترام کرتے تھے اور ان کی نظر میں مرزا صاحب بدرجہ غایت قدر و منزلت کے حامل تھے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مکتوب میں شاہ صاحب انھیں ان الفاظ سے مخاطب فرماتے ہیں:

"بنام مرزا صاحب خدائے عزوجل آں قیمِ طریقہ احمدیہ و داعی سنتِ نبویہ را دیر گاہ داشتہ مسلمین را متمتع و مستفید گرداند۔"[۱۰]

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:

"مرزا صاحب منح اللہ المسلمین بافادات قیم الطریقۃ الاحمدیہ دردی ریاض الطریقۃ بتوجہات النفس الزکیۃ"[۱۱]

ظاہر ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے دور کے عظیم عالم تھے، وہ مرزا صاحب کی عظمت کا اعتراف نہایت شان دار الفاظ میں کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

آنچہ قدر ایشاں ما مردم می دانیم شما چہ دانید، احوالِ مردمِ ہند برما مخفی نیست کہ خود مولد و منشا فقیر است، و بلادِ عرب را نیز دیدہ ام و سیر نمودہ۔ احوال مردم ولایت از ثقاتِ آں جا شنیدہ ایم و تحقیق کردہ ایم عزیزے کہ بر جادہ شریعت و طریقت و اتباع کتاب و سنت ہم چنیں استوار و مستقیم باشد، و در ارشادِ طالبان شانے عظیم و نفسے قوی دارد، دریں جزو زمان مثل ایشاں در بلادِ مذکور دریافتہ نمی شود، مگر در گزشتگان، بلکہ در ہر

---

۱۰ کلماتِ طیبات، ص ۱۵۸ ۱۱ ایضاً، ص ۱۵۹

جزو زمان وجود ایں چنیں عزیزاں کم تر بودہ است، چہ جائے ایں زمان کہ پُر فتنہ و فساد است۔[۱۲]

ان حضرات کی جو قدر ہم جانتے ہیں، تم کیا جانو۔ ہندوستان کے لوگوں کے احوال ہماری نظر سے اوجھل نہیں ہیں۔ میں نے بلادِ عرب کو بھی دیکھا ہے اور وہاں گھوما پھرا ہوں۔ وہاں کے معتمد علیہ لوگوں سے اس عزیز (مرزا مظہر جانِ جاناں) کے دین و تقویٰ کے بارے میں سنا اور تحقیق کیا ہے، وہ جادۂ شریعت پر قائم، منزلِ طریقت کے راہ نوورد اور کتاب و سنت کی صراطِ مستقیم پر گام فرسا ہیں۔ طالبانِ رشد و ہدایت میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اور وہ عظیم کردار کے مالک ہیں۔ ان بلاد میں ان کے مرتبے کا کوئی شخص نہیں ہے۔ البتہ گزشتہ دور میں ان کے پایہ کے لوگ موجود تھے، مگر وہ بھی بہت کم۔ اس دورِ پُرفتن میں تو ان اوصاف کے حامل ناپید ہیں۔

کیفیتِ نماز

"ذکر طریق کیفیتِ صلوٰۃ" کے عنوان کے تحت نعیم اللہ بہرائچی معمولاتِ مظہریہ کے صفحہ ۷۵ پر لکھتے ہیں:

معمول چنیں بود کہ صلوٰۃِ خمسہ را در اوقاتِ مخصوصہ و مستحبہ ادا می نمودند و رعایت اعتدال رکوع و سجود و قیام و قعود و قومہ و جلسہ بجا می آوردند و می فرمودند کہ شریعت عبارت از ہمیں اعتدال و اقتصاد است و دست را برابر سینہ می بستند و می فرمودند کہ ایں روایت ارجح است از روایتِ زیرِ ناف۔

حدیث ہی کو مدارِ عمل ٹھہراتے

مرزا ممدوح فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے اور فروعات میں اسی مسلک کے پیرو تھے، لیکن اگر مسائلِ حنفیہ کے خلاف کوئی صحیح حدیث انھیں مل جاتی تو قولِ امام کو ترک کر دیتے اور اس حدیث کو مدارِ عمل ٹھہراتے۔ جو لوگ حدیثِ صحیح چھوڑ کر روایاتِ فقہیہ پر عمل کرتے ہیں، ان پر تعجب کا اظہار فرماتے، چنانچہ علامہ سید عبدالحی حسنی فرماتے ہیں:

---

[۱۲] کلماتِ طیبات، ص ۱۵۸ حاشیہ

ویقول، العجب کل العجب ان الحدیث الصحیح غیر المنسوخ لا یعمل به مع انه یروی عن النبی المعصوم عن الخطاء صلی الله علیه وسلم ببضع وسائط من الرواة ویعمل بالروات الفقهیة التی نقلها القضاة والمفتون بوسائط عدیدة عن الامام غیر المعصوم مع ان ضبطهم وعدلهم غیر معلوم[13]

بڑے تعجب کی بات ہے کہ ان صحیح اور غیر منسوخ احادیث پر تو عمل نہ کیا جائے جو اللہ کے معصوم عن الخطا پیغمبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے چند ثقہ روات کے واسطے سے مروی ہیں، اور اس کے برعکس ان فقہی روایات کو معمول بہا ٹھہرایا جائے جو امام غیر معصوم سے قضات اور ارباب فتویٰ حضرات نے ان متعدد واسطوں سے نقل کی ہیں، جن کا عدل و ضبط بھی معلوم نہیں۔

رفع سبابہ اور فاتحہ خلف الامام

اسی طرح کتبِ تاریخ میں ان کے حالات کے ضمن میں مرقوم ہے کہ حنفی المسلک ہونے کے باوجود، تشہد میں رفع سبابہ اور فاتحہ خلف الامام پر عامل تھے۔ چنانچہ الیانع الجنی میں ہے:

ویقوّی قرأة الفاتحة فیما لا یجهر الامام فیه بالقرأة[14]

یعنی حضرت مرزا مظہر جان جاناں کا یہ معمول تھا کہ وہ سرّی نمازوں میں سورہ فاتحہ پڑھنے پر زور دیتے تھے۔

مولانا محمد حیات سندھی مدنی محدث فرماتے ہیں کہ مسائل میں وہ عمل بالحدیث کو ضروری قرار دیتے تھے، اگرچہ ان کے مذہب (حنفیت) کے خلاف ہی ہو۔

عمل بالحدیث کی تاکید

مرزا ممدوح ہر معاملے میں اتباعِ سنت کو ملحوظِ خاطر رکھتے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے بارے میں منقول ہے کہ وہ رفع سبابہ یعنی نماز میں انگشتِ شہادت اٹھانے کے قائل

---

[13] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۵۲

[14] الیانع الجنی، ص ۹۶

نہ تھے، اس ضمن میں مرزا صاحب سے کسی بزرگ نے خط کے ذریعے استفسار کیا تو اس کے جواب میں نہایت وضاحت سے لکھا کہ مجدد صاحب کو یہ حدیث نہیں پہنچی اگر پہنچتی تو اس پر ضرور عمل کرتے۔ ان کے فرزند شیخ محمد یحییٰ سرہندی رفعِ سبابہ کے قائل تھے، اس سلسلے میں انھوں نے ایک رسالہ بھی لکھا ہے، جس میں حدیث کی روشنی میں رفع سبابہ کا ثبوت دیا ہے۔ مرزا صاحب مزید فرماتے ہیں کہ کسی اہلِ علم یا کسی امام یا کسی صحابی کو حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ پہنچنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس ضمن میں ان کے فارسی خط کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ اس کی پوری وضاحت ہو جائے اور یہ معلوم ہو سکے کہ اس باب میں حضرت مرزا صاحب ممدوح کا نقطۂ نظر کس درجہ صاف اور واضح ہے۔ لکھتے ہیں۔

"آپ نے لکھا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مکتوبات میں سے ایک مکتوب میں رفع سبابہ (نماز میں انگشتِ شہادت اٹھانے) سے منع کیا ہے اور آپ (یعنی مرزا مظہر جان جاناں) حضرت مجدد سے اتنی محبت کے باوجود رفع سبابہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ محب کے لیے ضروری ہے کہ اپنے محبوب کا اتباع کرے ــــ مخدوما! اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کی پیروی انسانوں کے لیے فرض ٹھرائی ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ[۵۱]

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ۔

یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اپنی خواہش کو اس کے تابع نہ کر دے، جو میں لایا ہوں۔

---

۵۱ یہ سورہ احزاب کی آیت نمبر ۳۶ ہے۔ ترجمہ یہ ہے: اور کسی مسلمان مرد یا مسلمان عورت کو لائق نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو [illegible] اپنے کام میں کوئی اختیار باقی رہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے کامل نائب ہیں، انھوں نے اپنے طریقے کی بنیاد کتاب وسنت پر رکھی ہے، اور علما نے رفعِ سبابہ کے ثبوت میں بہت سے ایسے رسائل تصنیف کیے ہیں، جن میں فقہائے حنفیہ کی روایات اور صحیح احادیث سے اس مسئلے کو ثابت کیا گیا ہے، یہاں تک کہ حضرت مجدد کے چھوٹے صاحب زادے شیخ محمد یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے، انھیں ایک بھی ایسی حدیث نہیں ملی، جس سے رفعِ سبابہ کی نفی ثابت ہوتی ہو۔ یاد رکھیے، حضرت مجدد الف ثانی کا ترک رفعِ سبابہ، امرِ اجتہادی ہے، اور وہ سنت جو منسوخ نہ ہوئی ہو، مجتہد کے اجتہاد سے بہر حال مقدم ہے۔ سنتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے رفعِ سبابہ کا ثبوت مل جانے کے بعد، محض اس وجہ سے ترکِ رفع کرنا کہ حضرت مجدد نے بھی ترک کر دیا تھا، معقول بات نہیں ہے۔ خود حضرتِ مجدد بھی تو سنتِ رسول کے بارے میں بہت محتاط تھے، وہ حنفی مذہب کے حامل تھے، اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

اذا ثبت الحدیث فھو مذھبی۔

یعنی جب حدیث ثابت ہو جائے تو وہ میرا مذہب ہے۔

نیز ارشاد ہے: واترکوا قولی بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مقابلے میں میرا قول ترک کر دو۔

اس لیے امید ہے کہ حضرت مجدد اس امرِ اجتہادی کو ترک کرنے اور صحیح احادیث کو قبول کرنے سے ناراض نہ ہوں گے —— اور اگر لوگ یہ کہتے ہیں کہ کیا حضرتِ مجدد کو اپنے وسیع علم کے باوصف یہ معلوم نہیں تھا کہ احادیث سے رفعِ سبابہ کا ثبوت ملتا ہے، تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ان کے زمانے تک ہندوستان میں ان کتابوں اور رسالوں نے شہرت نہیں پائی تھی، لہٰذا وہ ان کی نظر سے نہیں گزرے، اور انھوں نے ترکِ سبابہ پر عمل کیا، اگر مل جاتے اور ان کے مطالعہ میں آجاتے تو ہرگز ترکِ رفعِ سبابہ نہ کرتے، کیونکہ وہ اس امت کے اکابر میں سے اتباعِ سنت کے سب سے زیادہ متمنی

تھے —— اور اگر یہ کہا جائے کہ کشف کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی نہ پاکر انھوں نے ترکِ رفع سبابہ کر دیا، تو ہم کہتے ہیں کہ کشف کو طریقت کے سلسلے میں تو قابلِ اعتبار مانا جا سکتا ہے، احکامِ شریعت میں کشف ہرگز حجت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں حضرت مجدد نے اپنے اس مکتوب میں مسئلہ زیرِ بحث کے بارے میں کشف کا کوئی دعویٰ بھی تو نہیں کیا —— بہر حال یہ جزوی مخالفتِ سنت، حضرت مجدد کے قاعدہ کلّی یعنی ترغیبِ اتباعِ سنت کے ذیل میں آتی ہے اور بار آور ہوگی۔ والسلام۔"[۱۶]

انتقالِ مذہب اور تقلید کے سلسلے میں

اسی طرح ایک اہلِ علم نے ایک مکتوب کے ذریعے انتقالِ مذہب یعنی ایک فقہی مسلک سے دوسرے فقہی مسلک میں منتقل ہو جانے کے بارے میں، مرزا صاحب موصوف سے ایک استفسار کیا تو انھوں نے تفصیل سے اس کی وضاحت فرمائی، اور جواب میں جو خط تحریر فرمایا، اس میں مولانا محمد حیات سندھی مدنی محدث کے اس رسالے کا فارسی میں خلاصہ تحریر کیا ہے، جو حضرتِ محدث ممدوح نے عربی میں لکھا ہے، نیز امام سیوطی کی تصنیف "جزیل المواہب فی انتقال المذاہب" کا حوالہ نقل کیا ہے۔ اس سے مختلف مذاہبِ فقہی سے متعلق مرزا صاحب کی صحتِ فکر کا پتا چلتا ہے، اور واضح ہوتا ہے کہ مسائل کو سمجھنے اور ان پر عمل کی بنیادیں استوار کرنے کا ان کے نزدیک اصل پیمانہ کتاب و سنت ہے۔ ان کا زاویۂ نظریہ ہے کہ جو فقہی مسلک، کتاب و سنت سے ہم آہنگ ہو، اسی کو قبول اور اختیار کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں مرزا صاحب کے فارسی خط کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

"آپ نے حدیث کے مطابق عمل کرنے کی غرض سے ایک مسلک سے دوسرے مسلک میں منتقل ہونے کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ مخدوما! حدیث کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں شیخ محمد حیات مدنی نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس کی تلخیص فارسی میں تحریر کی

---

[۱۶] کلمات طیبات ص ۲۷، ۲۸ مکتوب ۱۵۔

جاتی ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے :

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ - (آل عمران : ۳۱)

(اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دیجیے کہ) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں :

لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ[۱]

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں : تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اس کی خواہش ان امور کی تابع نہ ہو، جنھیں میں لایا ہوں۔ یہ صحیح حدیث ہے۔ ابوالقاسم بن اسماعیل بن فضل اصفہانی نے "کتاب الحجۃ" میں اسے روایت کیا ہے۔ "روضۃ العلما" میں بھی مذکور ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے :

اترکوا قولی بخبر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم و قول اصحابہ رضی اللہ عنہم۔

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور آپ کے صحابہ کرام کے قول کے مقابلے میں میرا قول ترک کردو۔

امام ابوحنیفہ کا مشہور قول ہے :

اذا صح الحدیث فھو مذھبی۔

حدیثِ رسولِ اکرم ہی میرا مذہب ہے۔

اگر اطلاع کے باوجود کوئی شخص حدیثِ صحیح پر عمل نہ کرے تو اس نے امام صاحب کے اس قول کی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں میرا قول ترک کردو" مخالفت کی۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ کسی بھی عالم نے تمام احادیث کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ امام صاحب کا یہ قول کہ آنحضرت کے فرمان کے مقابلے میں میرا قول ترک

---

[۱] مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، فصل ثانی

کر دو، اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ امام ابوحنیفہ کو تمام احادیث نہیں پہنچی تھیں، ان میں سے بعض رہ گئیں، اور کیوں نہ رہتیں، جب کہ اہلِ امت میں خلفائے راشدین جیسے بلند مرتبت حضرات سے بھی جو ہر وقت آنحضرتؐ کی خدمتِ اقدس میں رہتے تھے، بعض حدیثیں فوت ہو گئیں۔

ہر وہ شخص جسے فنِ حدیث میں معارضت ہے، خوب جانتا ہے کہ امت کے افراد پر فقط اتباعِ پیغمبر واجب ہے، ائمہ میں سے کسی کا اتباع واجب نہیں۔ اس لیے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ کسی بھی مجتہد کا فقہی مسلک اختیار کر لے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صحیح حدیث پر عمل کرنے سے انسان امام ابوحنیفہ کے مذہب سے نکل جاتا ہے تو اس کے پاس اپنے دعوے کے لیے جو دلیل ہے، اسے پیش کرے۔ البتہ ان مشہور مذاہبِ فقہیہ میں سے ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں منتقل ہونے کے مسئلے کا بیان تفصیل چاہتا ہے۔

امام سیوطی نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس کا نام "جزیل المواہب فی انتقال المذاہب" ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں منتقل ہو جانا جائز ہے۔ امام رافعی نے بھی اس کی تائید کی ہے، امام نووی بھی یہی کہتے ہیں۔ صاحب "روضہ" لکھتے ہیں کہ مذاہبِ فقہ کی تدوین کے بعد کیا یہ جائز ہے کہ مقلد ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں چلا جائے۔؟ ہم کہتے ہیں کہ مقلد پر یہ لازم ہے کہ دونوں مذاہب کے مجتہدین کے مطابق طلبِ علم کرے، اور جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ دوسرا مجتہد زیادہ عالم ہے تو انتقالِ مذہب جائز ہے، بلکہ لازم ہے۔ نیز اگر ہم اسے انتقالِ مذہب کا اختیار دے دیں تو بھی جائز ہے۔

مقلد کی بھی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ یہ چار چیزوں سے خالی نہیں۔ مقلد، جاہل ہے یا عالم۔ پھر ان دونوں [یعنی مقلد جاہل یا مقلد عالم] کے انتقالِ مذہب کی وجہ دینی ہے یا دنیوی۔

اگر جاہل ہے، فقہ سے واقف نہیں اور اپنے مذہب کے بارے میں سوائے نام کے کچھ نہیں جانتا، صرف مال وجاہ حاصل کرنے کے لیے مذہب بدلتا ہے تو اس کی یہ حرکت

صحیح نہیں ہے۔

اگر عالم اور فقیہ ہے اور صرف دنیوی غرض کے لیے مذہب بدلتا ہے تو یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے، کیونکہ وہ فقط دنیوی مقاصد کے لیے مذہب سے کھیلتا ہے اور یہ بالکل ناجائز ہے۔

اگر فقیہ ہے اور مذہب بدلنے کی وجہ دینی اسباب ہیں، دوسرا مذہب اس کی نظر میں قوی دلائل کے ساتھ ترجیح کا حامل ہے تو ایسے شخص کے لیے انتقالِ مذہب واجب ہے، ایک روایت کے مطابق جائز ہے۔

اگر فقہ سے واقف نہیں ہے، کسی اور شخص نے اسے اپنے مذہب میں داخل کیا ہے، خود جاہل رہا ہے۔ دوسرے مذہب میں فقہ کی اہمیت سے واقفیت اور تفقہ حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے تو ایسے شخص کے لیے بھی انتقالِ مذہب واجب ہے، کیوں کہ مذہب میں تفقہ، جہل سے بہتر ہے۔ کسی ایک مذہب میں درجہ فقاہت حاصل کرنا، تمام مذاہب کے جہل سے بہرحال اولیٰ ہے۔ غالباً جاہل کی عبادت بھی صحیح نہیں ہوتی۔

اگر انتقالِ مذہب کا کوئی دینی یا دنیوی مقصد نہیں ہے بلکہ محض عمل ہی اس کی وجہ ہے تو عام آدمی کے لیے تو جائز ہے، لیکن فقیہ کے لیے ممنوع ہے، کیوں کہ اس نے طویل مدت میں اس مذہب کی فقہ حاصل کی ہے۔ اب اگر دوسرے مذہب میں جائے گا تو اس کی فقہ حاصل کرنے کے لیے پھر ایک عمر چاہیے، اس پر عمل جو اصل مقصد ہے نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا اس کے لیے مذہب تبدیل نہ کرنا بہتر ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی غیر حنفی، حنفی مذہب اختیار کرلے تو جائز ہے اور حنفی مذہب کا حامل دوسرے مذہب میں چلا جائے تو ناجائز ہے، یہ محض ان کا تعصب ہے۔ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب امام برابر ہیں۔ اگر حنفی مذہب یا کسی اور مذہب کی تقدیم کے بارے میں کوئی آیت یا حدیث وارد ہوتی تو اس مذہب کی تقلید امت کے ہر فرد پر واجب ہوتی، دوسرے مذہب کی تقلید ناجائز قرار پاتی۔ یہ نقطۂ نظر اجماع کے خلاف ہے۔

صاحب جامع الفتاویٰ حنفی مذہب کے ماننے والے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی مرد اور کسی عورت کا شافعی مذہب سے حنفی مذہب اختیار کر لینا یا حنفی مذہب سے شافعی مذہب میں منتقل ہو جانا جائز ہے۔ بزرگانِ دین میں سے بہت سے حضرات نے انتقالِ مذہب کیا ہے۔ اگر ناجائز ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ جو کوئی اس کے خلاف کہتا ہے، اس کا قول بے دلیل اور غیر معقول ہے[۱۸]

دورِ پیری کا ایک خط

مرزا جانِ جاناں کے خطوط بڑے متوازن ہیں، لوگوں نے ان سے مختلف علمی سوالات کیے اور تصوف و طریقت کے پیچیدہ اور متنازعہ مسائل دریافت کیے، لیکن انھوں نے توازن اور اعتدال کی حدود میں رہ کر ان کے جواب دیے۔ ایک خط انھوں نے ایک بزرگ سید موسیٰ خاں دھبیدی کو لکھا۔ یہ مرزا صاحب کے دورِ پیری کا خط ہے۔ اس وقت حضرت مرحوم کی عمر اسّی سال کے قریب ہو چکی تھی۔ یہ خط کسی علمی یا فقہی سوال کے جواب میں نہیں ہے، لیکن اس سے پتا چلتا ہے کہ اس عمر میں بھی وہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے اور باقاعدہ حلقۂ تصوف قائم تھا۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی اور ایامِ گزشتہ کا ذکر کرتے ہیں۔ فارسی خط کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

الحمد للہ علی نوالہ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ وصحبہ و آلہ۔
بعد حمد و صلوٰۃ۔ فقیر جان جاناں کی طرف سے حضرت سید موسیٰ صاحب ملاحظہ فرمائیں۔ فقیر اس وقت اوائل ماہ صفر ۱۱۸۸ھ میں پانی پت کے اندر عافیت سے ہے۔ محلۂ دہلی کے لوگ بھی بخیر ہیں۔ میری عمر اب اسّی کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بڑھاپے کا ضعف غالب ہے۔ روزانہ چار وقت حلقہ ہوتا ہے۔ صبح، دوپہر، شام اور رات کو۔۔۔! لوگ حاضر ہوتے ہیں، علما و سادات کے گروہ کے گروہ اجازت حاصل کر کے (اپنے اپنے) شہروں کو جانے کی رخصت پاتے ہیں۔ اب میرے ہم عمروں میں کم لوگ باقی رہے ہیں۔ اس وقت

۱۸؎ کلمات طیبات ص ۲۸ تا ۳۰، مکتوب ۱۶۔

ہندوستان کی حالت ابتر ہے۔ ہر طرف فتنہ برپا ہے۔ ارادۂ حج تھا، ناتوانی اور بے سامانی نے اجازت ہی نہ دی۔ اب سفرِ دراز آخرت درپیش ہے۔ حق تعالیٰ بزرگوں کی دعا سے آسانی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ آپ کے جدا ہونے کے بعد سے آج تک آپ کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ بعد انتظارِ بسیار حاجی عبدالقادر نے جو آپ کے مخلصوں میں سے ہیں، آپ کی سلامتی کا پیغام پہنچایا، جس سے اس مردۂ صد سالہ کے جسم میں جانِ تازہ آگئی اور ایامِ گزشتہ کی صحبتیں یاد آنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر اور ارشاد و تلقین میں برکت عطا فرمائے۔

آپ نے اس علاقے کو منور کر دیا ہے۔ آپ سے اظہارِ اشتیاقِ ملاقات کروں تو بے کار ہے۔ اسبابِ ظاہری کے پیشِ نظر آپ سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بشرطِ حسن خاتمہ، بہشتِ جاوداں میں خاطر خواہ ملاقات میسّر آئے گی۔

چوں کہ بُعدِ مسافت کے باعث بہت کم ہندوستانی آپ کے علاقے میں آتے جاتے ہیں، اس لیے ارسالِ خط و کتابت سے بھی قاصر ہوں، اور آپ بھی معذور ہیں۔ الحمد للہ دعا سے غافل نہیں ہوں۔ آپ بھی خاتمہ بالخیر کی دعا سے مجھ کو فراموش نہ فرمائیں۔

ہمارے ہم پیروں (پیر بھائیوں) میں سے اس ہندوستان میں سوائے مرزا مظفر کے جو کہ ارشاد و تلقین میں مشغول ہیں، اب کوئی زندہ نہیں رہا۔ بلکہ خاندانِ عالی شان میں بھی ایسے صاحب زادگان جو اصحابِ ارشاد و تاثیر ہوں، نہیں ہیں۔ والسلام۔

(دیگر یہ کہ) اقامتِ دہلی کو ترک کرنے کا سبب یہ ہے کہ طالبانِ خدا، شہر میں کم اور قصبات میں زیادہ ہیں۔ تنعم و تجمل کے اسباب جو سرمایۂ غفلت ہوا کرتے ہیں، شہر میں زیادہ اور دیہات و قصبات میں کم ہیں۔ والسلام[۵۱۹]

---

۵۱۹ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔ بحوالہ ''الفرقان''، لکھنؤ۔ بابت جمادی الاخریٰ ۱۳۸۱ھ۔

ہندو مذہب کے بارے میں

مرزا مظہر جان جاناں سے ایک شخص نے ہندو مذہب، ہندوؤں کے معتقدات اور ہندوؤں کی کتابوں کے بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے ایک مکتوب میں اس کی بھی وضاحت کی۔ خط طویل ہے، لیکن بعض علمی جزئیات کو محیط ہے، لہٰذا پورے خط کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ اس سے مرزا صاحب کی وسعتِ معلومات کا پتا چلتا ہے۔

"تم نے دریافت کیا ہے کہ آیا مشرکینِ عرب کی طرح کفارِ ہند کا دین بے اصل ہے یا اس کی کوئی حقیقت تھی، جو بعد میں منسوخ ہو گئی؟ اور یہ کہ ان کے پیشروؤں کے متعلق کیا عقیدہ رکھنا چاہیے؟

"اختصار کے ساتھ اس کا تحقیق اور انصاف کی روشنی میں جواب تحریر کیا جاتا ہے۔ — معلوم ہونا چاہیے کہ اہلِ ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ پتا چلتا ہے، وہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی پیدائش کے آغاز میں رحمتِ الٰہی نے ان کی دنیوی اور اخروی اصلاح کے لیے "وید" نام کی ایک کتاب، ایک فرشتے کے ذریعے جو "برہما"[۵۲] کے نام سے موسوم ہے اور جو اُن

---

[۵۲] اس لفظ کے حاشیے میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام "رودِ کوثر" (ص ۶۴۶، ۶۴۷) میں لکھتے ہیں کہ "علامہ اقبال کا بھی کسی زمانے میں یہی خیال تھا۔ جب "مخزن" میں انھوں نے ہندوؤں کے مقدس بھجن گایتری کا (۱۹۰۲ء میں) ترجمہ شائع کرایا تو اس میں ایک شعر یہ تھا:

ہر چیز کی حیات کا ہے پرور دگار تو   زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

"زائیدگانِ نور" کی ترکیب کے متعلق اقبال نے یہ نوٹ دیا تھا — "زائیدگانِ نور" یعنی دیوتے۔ سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں۔ یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو، دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح، مخلوق تصور کرتے تھے، ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہو گا، جس کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیوں کہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے، اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا موجب گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔" (اقبال)

کے عقیدے کے مطابق دنیا کی ایجاد کا ذریعہ اور آلہ ہے، بھیجی تھی۔ یہ کتاب چار دفاتر کو محیط ہے اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کی خبروں پر مشتمل ہے۔ ان کے علما نے اس کتاب سے چھ مذاہب استخراج کیے ہیں، اور اپنے اصولِ عقائد کی بنیاد اسی کو قرار دیا ہے۔ اس فن کو وہ "دھرم شاستر" کے نام سے پکارتے ہیں۔ یعنی فنِ ایمانیات، ہماری اصطلاح میں اسے "علم کلام" کہا جاتا ہے۔

"نوع انسان کو انھوں نے چار فرقوں میں منقسم کیا ہے اور اس کتاب سے چار مسلک اخذ کیے ہیں۔ ہر فرقے کا ایک مسلک ٹھہرایا ہے اور فروع اعمال کی اساس انھی پر رکھی ہے، اس فن کا نام ان کی بولی میں "کرم شاستر" ہے، یعنی فنِ عملیات، جسے ہم اپنی اصطلاح میں "علمِ فقہ"، سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لوگ چوں کہ فسخ احکام کے قائل نہیں ہیں، اور ہر دور اور ہر زمانے کے اہلِ دانش کے طبائع کے مطابق تبدیلی ضروری ہے، لہٰذا انھوں نے دنیا کی طویل عمر کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے کا نام "جگ" رکھا ہے۔ پھر ہر جگ" کے لیے کتاب (وید) کے چاروں دفاتر سے طریقِ عمل اخذ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے متاخرین نے اس میں جو تصرفات یا تغیرات کیے ہیں، وہ قابلِ اعتنا نہیں ہیں۔

"ان کے تمام فرقے اللہ کی توحید پر ایمان رکھتے ہیں اور دنیا کو حادث و مخلوق مانتے ہیں۔ فنائے عالم، حشرِ جسمانی اور نیک و بد اعمال کی جزا کا انھیں یقین ہے۔ ان لوگوں کو عقلی و نقلی علوم، ریاضات، مجاہدات، تحقیقِ معارف اور مکاشفات میں بڑی دسترس حاصل ہے۔ ان کے کتاب خانے آج تک موجود ہیں۔ ان لوگوں میں بُت پرستی کی جو رسم جاری ہے، اس کی تہہ میں شرک فی الالوہیت کا جذبہ کارفرما نہیں ہے، بلکہ اس کی حقیقت دوسری ہے۔

"ان کے عالموں اور دانشمندوں نے انسانی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، جس کی ترتیب یہ ہے۔ حصۂ اول میں علوم و آداب کی تحصیل۔ حصۂ دوم میں حصولِ معاش اور حصولِ اولاد۔ حصۂ سوم میں تصحیحِ اعمال اور اصلاحِ نفس۔ حصۂ چہارم میں ترک و تجرید کی مشق و ریاضت، جو انسان کی منتہائے کمال ہے، اور نجاتِ کبریٰ جسے وہ

"مہامکت"، کہتے ہیں، اسی حصّہ چہارم میں منحصر ہے۔

"ان کے دین میں مکمل نظم و نسق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتب دین تھا، لیکن اب منسوخ ہوگیا ہے، شریعتِ اسلامی میں، منسوخ شدہ مذاہب میں سوائے یہود اور نصاریٰ کے دین کے اور کسی دین کا ذکر نہیں، حالاں کہ ان کے علاوہ بھی بہت سے مذاہب منسوخ ہوئے اور بہت سے پیدا ہوئے اور ختم بھی ہوئے۔

"معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کی آیاتِ کریمہ: وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔ ٥ [۲۲] (کہ کوئی امت ایسی نہیں، جس میں ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو) اور وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ۔ [۲۳] (اور ہر امت میں رسول آیا) کے مطابق ممالکِ ہند میں بھی نبی اور رسول بھیجے گئے ہیں، اور ان کے احوال ان کی کتابوں میں مرقوم بھی ہیں، نیز جو ان کے آثار باقی ہیں، ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کمال و تکمیل کے مرتبے تک پہنچ گئے تھے اور رحمتِ عامہ نے اس وسیع مملکت کے انسانی معاملات کو فراموش نہیں کیا تھا۔

"منقول ہے کہ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہر قوم میں پیغمبر بھیجے گئے تھے اور پوری قوم پر اپنے پیغمبر کی اطاعت اور فرماں برداری واجب تھی، نہ کہ دوسری قوم کے پیغمبر کی — ! ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد (جو پوری دنیا کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں، اور خاتم الانبیا ہیں اور جن کا دین مشرق و مغرب کے تمام ادیان کو منسوخ کر دینے والا ہے) جب تک دنیا باقی ہے، کسی کو ان کی اطاعت و فرماں برداری کے دائرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے آج تک کہ اس پر ایک ہزار ایک سو اسّی سال گزر چکے، جو کوئی ان کی اطاعت میں نہ آیا، کافر ہے۔

---

۲۲ سورۂ فاطر : ۲۴

۲۳ سورۂ یونس : ۴۷

لیکن آپ کی آمد سے پہلے لوگوں پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا ــــ چوں کہ اسلام اس آیتِ کریمہ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ[۲۴] کے مطابق بہت سے انبیا کے احوال سے متعلق خاموش ہے، لہٰذا ان کے بارے میں خاموش رہنا ہی اولیٰ ہے۔ نہ تو ہمیں ان کی پیروی کرنے والوں کے کفر و ہلاک کا یقین کرنا ضروری ہے اور نہ ان کی نجات پر ہی یقین کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں حسنِ ظن سے کام لینا ضروری ہے۔ بشرطیکہ طبیعتوں میں تعصب کا عمل دخل نہ ہو۔ اہلِ فارس کے بارے میں بھی بلکہ ہر ملک کے باشندوں کے بارے میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے گزرے ہیں، اور شریعت کی زبان جن کے متعلق خاموش ہے، یہی عقیدہ رکھنا بہتر ہے، اور بغیر کسی قطعی دلیل کے کسی کو کافر کہنا آسان نہیں سمجھنا چاہیے۔

"ان لوگوں کی بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے جو اللہ کے حکم سے اس عالمِ کون و فساد میں تصرف رکھتے ہیں، یا بعض کاملین کی ارواح جن کا اجسام سے ترکِ تعلق کے بعد بھی اس کائنات میں تصرف باقی ہے، یا بعض ایسے زندہ افراد جو ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق حضرتِ خضر کی طرح حیاتِ جاوید رکھتے ہیں، یہ لوگ ان کے بت تراش کر اُن کو مرکزِ توجہ ٹھہراتے ہیں، اور اس توجہ کی وجہ سے کچھ مدت بعد یہ صاحبِ صورت سے ربط پیدا کر لیتے ہیں، اور پھر اس ربط کی بنا پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کے تعلق کے سبب سے ان کی احتیاجیں پوری کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل اس ذکرِ رابطہ سے مشابہت و مماثلت رکھتا ہے، جو بعض مسلمان صوفیا کے ہاں مروّج ہے کہ وہ اپنے پیر کی صورت کا

---

[۲۴] یہ سورہ مومن کی آیت نمبر ۷۸ کا ایک ٹکڑا ہے۔ آیت کے چند الفاظ یہ ہیں: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ۔ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے: (اے پیغمبر) ہم آپ سے پہلے بہت پیغمبر بھیج چکے ہیں۔ ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ کو بتا دیا اور بعض کا نہیں بتایا۔

تصور کرتے ہیں اور اس سے فیض اٹھاتے ہیں۔ (یعنی تصور شیخ) فرق صرف یہ ہے کہ مسلمان صوفیا، پیر کا بت نہیں تراشتے۔ لیکن یہ بات کفارِ عرب کے عقیدے سے مطابق نہیں رکھتی، کیونکہ وہ بتوں کو اپنی ذات سے مؤثر اور متصرف جانتے تھے، اللہ تعالیٰ کے تصرف کا آلہ نہیں سمجھتے تھے، وہ لوگ ان بتوں کو زمین کا خدا قرار دیتے تھے اور خدا کو آسمان کا — ! یہ شرک فی الالوہیت ہے۔

"لیکن ان [کفارِ ہند] کا سجدہ ریز ہونا، سجدۂ تہنیت ہے، سجدۂ عبودیت نہیں، یہ وہی سجدہ ہے جو ان لوگوں کے مذہب کے مطابق وہ ماں، باپ، پروہت اور استاد وغیرہ کو بھی سلام کی جگہ کرتے ہیں، اور اسے یہ "ڈنڈوت" کہتے ہیں — باقی رہا تناسخ، تو جاننا چاہیے کہ عقیدۂ تناسخ سے کفر لازم نہیں آتا۔ والسلام۔"[۲۵]

اس خط سے کئی چیزوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک یہ کہ مرزا جانِ جاناں، ہندو مذہب کے طریقِ عبادت سے بھی آگاہ تھے، اور ان کی مذہبی کتابوں کے مندرجات سے واقفیت رکھتے تھے۔ دوسرے کسی کو کافر قرار دینے کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ تیسرے وسیع القلب اور فراخ حوصلہ عالمِ دین تھے۔

بلندئ اخلاق اور بلندئ کردار کی تلقین

مرزا صاحب بہت بلند اخلاق اور بلند کردار عالمِ دین تھے، اور لوگوں کو بھی یہی تعلیم دیتے تھے۔ بالخصوص علما اور اپنے مریدین کو بار بار حلم اور بردباری کی تلقین کرتے۔ ایک خط میں ایک شخص شاہ محمد سالم کو لکھتے ہیں:

اپنی بد خلقی سے پیروں کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی تمھارے طریقے کی طرف رجوع کرے تو اس سے خدمت لینے کی بجائے، خود اس کی خدمت کرو۔ البتہ اگر وہ غلبۂ محبت کی وجہ سے خود ہی تمھاری خدمت کرے تو دوسری بات ہے[۲۶]

---

۲۵ کلمات طیبات ص ۲۵ تا ۲۶۔ مکتوب ۶۷۔

۲۶ مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط، ص ۱۳۶۔

ایک خط میں ایک خاتون عقیدت مند کو بڑے کے لیے ادب اور چھوٹوں پر رحم و شفقت کی ان الفاظ میں تاکید فرماتے ہیں :

اگر بزرگوں کے ساتھ ادب اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے زندگی گزارو تو کوئی تم سے برائی نہیں کرے گا۔ شوہر کی خدمت اور اطاعت کی پوری کوشش کرنی چاہیے، غصہ و غضب پی جانا چاہیے۔

مرزا صاحب کی گھریلو زندگی بڑی تلخ تھی، ان کی بیوی انتہائی تند مزاج تھیں، پھر ان کو جنون کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ وہ عمر بھر ان کے لیے دردِ سر بنی رہیں۔ شاہ غلام علی لکھتے ہیں :

حضرت ایشاں می فرمودند کہ ایشاں را عارضہ سودا لاحق گشت و غلبۂ جنون عقل را مستور ساخت[۲۷]

حضرت مرزا صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ ان کی اہلیہ کو سودا کی بیماری لاحق ہو گئی ہے اور غلبۂ جنون عقل پر چھا گیا ہے۔

لیکن نہ کبھی بیوی پر سختی کی اور نہ کبھی دل میں علیحدگی اختیار کرنے کا خیال پیدا ہو۔ ہمیشہ اس کی خدمت اور خاطر داری کو شعار بنائے رکھا۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو اُن کے زمانے میں دیارِ ہند کے بہت بڑے عالم و فقیہ تھے، مرزا صاحب کے خاص مریدین میں سے تھے، مرزا صاحب کے ان سے انتہائی مخلصانہ مراسم تھے۔ ان کی بیمار بیوی قاضی صاحب مرحوم کے پاس پانی پت گئیں تو مرزا صاحب نے بیوی کے بارے ان کو خط لکھا کہ :

ان کی درخواست پر پانی پت بھیجنے کا فیصلہ ہوا ہے، جب وہ پانی پت پہنچیں تو تمہارا فرض ہے کہ ان کی دل جوئی اور خاطر داری میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھو۔ وعظ و نصیحت میں ان پر سختی نہ کرنا، ان سے بہت ہی نرمی کا برتاؤ کرنا، اگر اس فقیر کی پس پشت برائی کریں تو

---

۲۷ مقاماتِ مظہری، فصل شانزدہم، ص ۶۳

ہرگز ان کا مقابلہ نہ کرنا، ان سے ہرگز بددل نہ ہونا، کیونکہ ہماری اور تمھاری خیریت اسی میں ہے۔

مرزا صاحب کی بیوی کی حالت کبھی بہتر ہو جاتی تو نہایت مسرت کا اظہار کرتے اور خوش ہوتے کہ اب انھیں افاقہ ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے متعدد خطوط میں کیا ہے۔

مرزا صاحب کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود تو اولاد سے محروم تھے، لیکن ان کی بیوی کا ایک عزیز تھا جس کا نام پیر علی تھا، یہ بھی جنون اور سودا کا مریض تھا، اس کے اسلوبِ زندگی سے بھی مرزا صاحب بہت تنگ تھے، لیکن بے بس تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

سیاسی حالات

سیاسی اعتبار سے مرزا صاحب کے زمانے کے حالات نہایت ابتر تھے، مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہو چکی تھی اور اس کی شان و شوکت ختم ہو رہی تھی۔ ملک کے مختلف علاقوں میں سکھ اور مرہٹے بالخصوص مسلمانوں پر بے پناہ ظلم ڈھا رہے تھے۔ لوگ اس صورتِ حال سے انتہائی پریشان تھے۔ خود مرزا صاحب اپنے بعض مکتوب میں اس کا بڑے دکھ اور تکلیف کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ وہ ملک کے سیاسی نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر تھے، دہلی اور دوسرے بلاد ملک میں جو کچھ اکھاڑ پچھاڑ ہو رہی تھی، اس سے وہ بدرجہ غایت نالاں تھے۔ خود مسلمان امرا و وزرا بھی ظلم و ستم ڈھانے میں کسی سے پیچھے نہ تھے، شاہ عالم ثانی کا وزیر نجف عالم بڑا ظالم شخص تھا، مرزا صاحب ایک خط میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جس دن سے نجف خاں آیا ہے، اس شہر (دہلی) میں فقیر سے لے کر بادشاہ تک ہر شخص کی حالت خراب ہے۔"

مرزا صاحب بڑی دور رس نگاہ رکھتے تھے۔ اس زمانے کے سیاسی اُتار چڑھاؤ کی کوئی بات ان سے مخفی نہ تھی۔ غلام عسکری خاں کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"شہر کے حالات سے لے کر محل کی خبروں تک فقیر سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے، تمام حقائق فقیر تک پہنچ جاتے ہیں۔"

شعروشاعری

مرزا صاحب بہت سے اوصاف کے حامل تھے، وہ شاعر بھی تھے، جیساکہ پہلے بتایا گیا ہے، ان کے اشعار کا مجموعہ خود اُن کی زندگی میں تیار ہوچکا تھا، جس پر انھوں نے مقدمہ بھی لکھا۔ یہ شعر ان ہی کے ہیں :

ہوسِ عشق مکن اے دل بے صبر و قرار
عاشقی فن شریف است مگر کارِ تو نیست
ساقی بدہ آں مے کہ ز مستی نشناسیم
پیمانہ کدام و لبِ جانانہ کدام است

یہ اشعار بھی مرزا صاحب کے ہیں، جو وہ آخری دنوں میں شدت تکلیف اور عالم اضطراب میں پڑھتے تھے :

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را
سیلِ خوں از سینہ گرمم رواں کرد ست عشق
نازم اعجازش کہ طوفاں از تنور آوردہ است
زخمِ دلِ مظہر مبادا بہ شود آگاہ باش
کایں جراحت یادگارِ ناوکِ مژگانِ اوست

اردو کلام

مرزا مظہر ممدوح نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں، انھیں اردو زبان کا محسن کہنا چاہیے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بے کس افسوس ہے
کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

چلے اب گُل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا — نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا — ڈبویا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا
جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے — غلط تھا جانتے تھے تجکو جو ہم مہرباں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم — کہ دولتخواہ اپنا، مظہر اپنا، جانِ جاناں اپنا

نہیں کچھ غم کہ کیوں جلتا نہیں پیماں گسل میرا — کہ میں روتا ہوں دل کی بےکسی پر ہائے دل میرا

جواں مارا گیا خوباں کے اوپر میرزا مظہر — بھلا تھا یا بُرا تھا زور کچھ تھا خوب کام آیا
زخمی تری نگہ کا اک پل جیا تو پھر کیا — صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار — ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور — کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک — جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم — مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

گر گل کو گل کہوں تو ترے رُو کو کیا کہوں — بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

توفیق دے کہ شور سے اک دم وہ چپ رہے — آخر یہ میرا دل ہے، الٰہی جرس نہیں

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر — فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

آج مت رنگِ حنا سے کفِ پا لال کرو — اے بتاں اس دلِ پُرخون کو پامال کرو

یہ بلبلوں کا صبا مشہدِ مقدس ہے — قدم سنبھال کے رکھیو نرا یہ باغ نہیں

کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن — نہایت منہ سے لگایا ہے سجن نے بیڑۂ پان کو
آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلا کہو — مت اس ستارۂ سوختہ کو دل کہا کرو

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ — اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہاتھ
آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے — مینا لگا ہے جب سے مجھ بے نوا کے ہاتھ
مرتا ہوں میرزا یئے گل دیکھ ہر سحر — سورج کے ہاتھ چنوری تو پنکھا صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک کو اپنے تو — یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

تجلی گر نہ ہی پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی
فلک یوں چرخ کیوں کھاتا، زمیں کیوں فرش ہو جاتی
حنا تیرے کفِ پا کو نہ اس شوخی سے سہلاتی
یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں ہنسوں کی نیند کیوں جاتی
الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے منہ نہ برساتی

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے
نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے
نہ مجکو وہ دماغ و دل رہا ہے
نہیں آتا کسی تکیہ اوپر خواب
یہ سر پانوں کے تیرے ہل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل
یہیں تک تھی ہماری زندگانی

وفات

مرزا مظہر جان جاناں کی موت قاتل کی گولی سے واقع ہوئی۔ اس کی تہ میں سیاسی اور مذہبی دونوں اسباب کار فرما تھے۔ اس متن کی تشریح یہ ہے کہ مرزا صاحب کے اربابِ عقیدت اور اصحابِ ارادت کی کثیر تعداد روہیلوں پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ مغل حکومت کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکے تھے۔ نجف خاں کے زمانۂ وزارت میں جو شاہ عالم ثانی کے عہدِ حکومت میں اس منصب پر فائز تھا، روہیلوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور انھوں نے دہلی کے مختلف علاقوں میں باقاعدہ سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ لوگ اس وقت تک عیش و عشرت سے دور تھے اور اپنے دست و بازو میں طاقت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نجف خاں سیاسی طور پر ان سے خوف زدہ رہتا تھا اور اپنے اقتدار کے لیے ان سے شدید خطرہ محسوس کرتا تھا۔ مرزا جان جاناں کی خانقاہ روہیلوں کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ نجف خاں متعصب شیعہ بھی تھا اور مرزا صاحب کے مسلکی افکار و تصورات اس سے بالکل برعکس تھے۔ لہٰذا اس کے نزدیک سوا اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ مرزا صاحب کو قتل کرا دے۔ چنانچہ ۷ محرم ۱۱۹۵ھ کی شب کا کافی حصہ گزر چکا تھا کہ کچھ لوگوں نے مرزا صاحب کے دروازے پر دستک دی۔ ملازم باہر آیا۔ اس نے نو واردوں سے آنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے مرزا سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔

ملازم نے اندر جاکر اطلاع دی، مرزا صاحب خواب گاہ سے باہر آئے، ان میں سے ایک مغل نوجوان نے آگے بڑھ کر پوچھا، "مرزا مظہر آپ ہی ہیں؟" مرزا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے دو ساتھیوں نے اس کی تصدیق کی۔ مغل نوجوان نے فوراً مرزا پر طمنچہ کی گولی داغ دی۔ گولی سینے میں بائیں جانب دل کے قریب پیوست ہوگئی۔ مرزا زمین پر گر پڑے، اور قاتل فرار ہوگئے۔ مسلمان جراحوں نے بہت علاج کیا، مگر افاقہ نہ ہوا۔

یہاں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ جب قاتل کا پتہ نہ چلا تو بادشاہِ دہلی نے مرزا صاحب کو پیغام بھیجا کہ قاتل کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر آپ اس کے بارے میں کچھ بتائیں تو ہم اس کو سزا دیں۔ جواب میں فرمایا، "فقیر کشتۂ راہِ خدا ہیں۔ مُردے کو مارنا قتل نہیں کہلاتا۔ قاتل ملے تو آپ سزا نہ دیں، اُسے یہاں بھیج دیں"۔

آخر تیسرے دن ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ کو مغرب کے وقت انتقال کر گئے۔[۲۸]

نماز کے لیے بے چینی

مرزا صاحب، نماز اور روزے کے لیے سخت پریشان رہتے اور ہمیشہ وقت پر یہ فریضہ ادا کرتے۔ یہی کیفیت موت کے وقت بھی ان پر ساری تھی۔ شاہ غلام علی وفات کے موقع پر ان کی خدمت میں حاضر تھے۔ وہ اس سلسلے میں ان کی بے چینی کا مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار کرتے ہیں:

از نہایت ضعف، آوازِ مبارک شنیدہ نمی شدہ، روزِ سوم، روزِ جمعہ بعد نماز صبح از بندہ پرسیدند کہ یازدہ نماز از وقضا شدہ، و تمام بدن خون آلودہ است، طاقت برداشتن سر نہ باشد، نماز موقوف باید داشت و باشارہ بر و ادا کنند، شما دریں مسئلہ چہ معلوم است؛ عرض نمودم، مسئلہ آں است کہ حضرتِ ایشاں فرمودند۔ بعد از گذاشتن نیم روز سر دو دست برداشتہ تا دیرے فاتحہ خواندند۔[۲۹]

۲۸ھ مقاماتِ مظہری، ص ۶۱ ۲۹ھ ایضاً

انتہائی کمزوری اور ضعف کی وجہ سے آواز سنائی نہ دیتی تھی، جمعہ کے روز، روزہ رکھتے تھے، نماز فجر کے بعد مجھ سے پوچھا کہ گیارہ نمازیں قضا ہوگئی ہیں، تمام بدن خون آلود ہے، سر اٹھانے کی ہمت نہیں، اٹھ کر نماز نہیں پڑھی جاسکتی، اشارے سے پڑھتا ہوں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا، مسئلہ وہی ہے جو آپ نے فرمایا۔ دوپہر کے وقت دونوں ہاتھ اُٹھا کر دیر تک دعا کرتے رہے۔

تدفین

مرزا صاحب کو دہلی میں ترکمان دروازے کے باہر ایک حویلی میں دفن کیا گیا۔ یہ حویلی ان کی بیوی کی ملکیت تھی۔ بعد میں یہ حویلی خانقاہ شاہ غلام علی کہلائی، آج کل یہ خانقاہِ شاہ ابوالخیر کے نام سے مشہور ہے — لوحِ قبر پر خود مرزا کا یہ شعر کندہ ہے:

بہ لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

اکثر معتقدین و معاصرین نے ان کی وفات کی تاریخیں کہیں، جن میں ایک میر قمرالدین منّت ہیں، انھوں نے حدیث کے ان الفاظ سے تاریخ نکالی:

عاش حمیدًا و مات شہیدًا
۱۱۹۵ھ

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے قرآنِ مجید کی اس آیتِ مبارکہ سے تاریخ نکالی:

اُولٰٓئِکَ مع الذین انعم اللہ علیہم[۳۰]
۱۱۹۵ھ

مرزا صاحب کا وصیّت نامہ

مرزا جان جاناں نے وفات سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھا تھا، جس سے ان کی اتباعِ کتاب و سنت کا پتا چلتا ہے۔ یہ وصیت نامہ حسبِ ذیل ہے:

"حمد و صلوٰۃ کے بعد فقیر جان جاناں محمدی مجددی، اس حالت میں کہ جس میں

---

۳۰ قاتلانہ حملے اور وفات کی تفصیلات شاہ غلام علی نے مقاماتِ مظہری میں بیان کی ہیں۔ دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی اس سلسلے کے واقعات تحریر کیے ہیں۔

اقرار و مقر صحیح و معتبر ہوتا ہے، ان احباب کو چند وصیتیں کرتا ہے، جنھوں نے اس سے اخذِ طریقت کیا ہے۔

"فقیر کی تجہیز و تکفین میں سنتِ نبوی پر عمل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔ اس کے بعد میری قبر پر دکان نہ لگائی جائے، کیوں کہ میں زندگی میں بھی اس کا مخالف تھا۔ مَیں بندگانِ خدا میں سے ایک بندہ ہوں، مَیں نے صرف خدا کے نام پر تعلیم دی ہے اور بس —!

"چند روز پہلے میری بیوی نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اپنے امورِ آخری کی تدبیر ان پر چھوڑ دوں۔ میں نے اس سلسلے میں انھیں ایک تحریر دے دی ہے تاکہ میرے بعد میرے مخلص ان کی مخالفت نہ کریں۔ وہ جہاں چاہیں مجھے دفن کریں، مَیں نے اس بات کا زبانی اقرار کر لیا ہے۔ لیکن ان دنوں یہ مستورہ کسی قطعۂ زمین کی مالک نہ تھیں۔ حال ہی میں انھوں نے ایک حویلی خرید لی ہے، میں اس جگہ سے سخت متنفر ہوں۔ اگر وہ مجھے اس جگہ دفن کرنا چاہیں تو دوستی کے تقاضے سے میرے احباب پر واجب ہے کہ ہرگز یہ بات منظور نہ کریں۔ ہاں اس جگہ کے علاوہ جہاں بھی جگہ میسّر ہو، ان کی مرضی کا خیال رکھیں۔ بیرونِ ترکمان دروازہ مناسب تر جگہ ہے۔

"اس مستورہ نے عارضۂ سودا اور طویل عمری کی وجہ سے مجھے پریشان کیا ہے، جو دوستوں سے مخفی نہیں، لیکن میں نے سب معاف کر دیا ہے۔ اس محبت کے خیال سے جو انھیں خدا اور رسول سے ہے، میرے نشین پر میرے حقِ وفا کے مطابق ان کی دل جوئی لازم ہے۔

میرے مخلصین کو یہی وصیت کافی ہے کہ تا دمِ آخر اتباعِ سنت میں کوشاں رہیں، اور خدا کے سوا کسی کو مقصودِ حقیقی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کو متبوعِ واجب الاتباع نہ سمجھیں۔ فقیروں کے طور طریق اپنائیں اور دنیاداروں سے میل جول سے گریز کریں۔ علومِ دین کے شغل سے خود کو معذور نہ رکھیں۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْھُمْ۔ [۱۳۱]

---

[۱۳۱] مرزا صاحب نے یہ وصیت نامہ تحریر کر کے اپنے خلیفہ نعیم اللہ بہرائچی کو دے دیا تھا، جنھوں نے یہ معمولاتِ مظہریہ میں نقل کیا ہے۔

نجف خاں

مرزا مظہر جان جاناں کو چوں کہ نجف خاں نے قتل کرایا تھا، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ اس کے حالات بھی بیان کر دیے جائیں۔

نجف خاں، ایرانی نژاد تھا اور ایران کے بادشاہ حسین خاں صفوی کے وزیر اعظم آغا نجف خاں کا پوتا تھا۔ ۱۷۳۷ء کو اصفہان میں پیدا ہوا، اٹھارہ سال کی عمر میں اپنی اس بہن کے ساتھ جو صفدر جنگ کے بھائی محمد محسن کے عقد میں تھی، ہندوستان آیا اور الہ آباد کے حاکم محمد قلی خاں کے ہاں ملازم ہو گیا۔ ۱۷۶۱ء میں شجاع الدولہ نے محمد قلی خاں کو قتل کر دیا تو نجف خاں فرار ہو کر بنگال چلا گیا، وہاں نواب قاسم علی خاں نے اسے ملازم رکھ لیا اور فوج کی تیاری کے لیے تین لاکھ روپے دیے۔ ۱۷۶۴ء میں جب بکسر کی لڑائی کے بعد نجف خاں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر شجاع الدولہ کو قتل کیا اور قلعہ الہ آباد پر انگریزوں کا قبضہ کرا دیا تو اسے شاہی جرنل تسلیم کر لیا گیا، کیوں کہ انگریز سیاسی مصالح کی بنا پر شاہ عالم ثانی کی حمایت میں جنگ کر رہے تھے۔ پھر انگریزوں کی سفارش پر اسے کوڑا کا شاہی فوج دار مقرر کیا گیا، لیکن پورا لگان وصول نہ کر سکنے کے الزام میں تین سال بعد اس منصب سے الگ کر دیا گیا۔ اس اثنا میں نجف خاں ایک سال الہ آباد میں بے کار پڑا رہا۔ مئی ۱۷۷۱ء میں جب مغل حکمران عالم شاہ ثانی الہ آباد سے دہلی آیا تو نجف خاں کو بھی ساتھ لے آیا۔ اب وہ شاہی فوج کا کپتان مقرر ہوا، اور فوج کو منظم اور مسلح کرنے کے لیے اسے پچاس ہزار روپے دیے گئے۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ جب بادشاہ الہ آباد سے دہلی آیا تو یہ شہر بادشاہ کے دشمنوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ جاٹ، مرہٹے، سکھ اور روہیلے اپنی اپنی طاقت آزمانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ صرف نجف خاں ہی وہ شخص تھا، جس نے ان تمام طاقتوں کو کچلا۔ اس نے خاص طور پر روہیلوں کو اپنا نشانہ بنایا، جن کی بڑھتی ہوئی طاقت مغل حکومت کے لیے ایک مستقل خطرہ بنتی جا رہی تھی۔

دہلی کا دربار عرصے سے شیعہ اور سُنّی فرقوں کا اکھاڑہ بن چکا تھا۔ ایرانی اور تورانی

باشندوں کے باہمی جھگڑوں کی بنیادی وجہ یہی مذہبی اختلاف تھا۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد جب ساداتِ بارہ کے دو بھائیوں نے طاقت پکڑی تو شیعیت کو بہت عروج ہوا۔ صفدر جنگ اور عماد الملک کی چپقلش کا بڑا باعث یہی چیز تھی۔ نجف خاں کٹر شیعہ تھا اور اس کے دورِ اقتدار میں سُنّی علما کو ہدفِ ستم ٹھہرایا گیا۔ اسی بنا پر بہت سے لوگ نجف خاں سے علانیہ اظہارِ نفرت کرنے لگے تھے۔ چنانچہ مرزا مظہر جان جاناں ایک خط میں صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ جس دن سے نجف خاں دہلی آیا ہے، فقیر سے لے کر بادشاہ تک ہر شخص کی حالت خراب ہے۔

مصحفی نے تذکرۂ ہندی گویان میں لکھا ہے کہ میں نجف خاں کے دور میں بارہ سال تک خانہ نشین رہا۔ اس حشر اجساد و اموات میں، تلاش معاش کے لیے ہر گز گھر سے نہیں نکلا۔

مولانا فخر الدین جو مرزا مظہر جان جاناں کے معاصر اور بارھویں صدی ہجری کے بہت بڑے ہندی عالم، صوفی اور مدرس تھے، نجف خاں سے انتہائی نالاں تھے۔ مرتے وقت اس نے مولانا فخر الدین کو بلوایا، وہ اس کے پاس چلے تو گئے مگر فرمایا کہ ہمارا اور تمھارا کوئی باہمی تعلق نہیں ہے، صرف عیادت کو آگیا ہوں۔ نجف خاں کے جنازے میں مولانا فخر الدین شامل نہیں ہوئے۔

نجف خاں مئی ۱۷۷۱ء میں عالم شاہ ثانی کے ساتھ الہ آباد سے دہلی آیا، اور اُسے شاہی فوج کے کپتان کا منصب عطا ہوا۔ ۵ جون ۱۷۷۲ء کو اسے میر بخشی مقرر کیا گیا۔ ۱۷۷۹ء کو وکیل مطلق بنایا گیا۔ ۱۷۸۱ء (۱۱۹۶ھ) کو اس کا انتقال ہوگیا۔

نجف خاں حکومت کے مختلف بلند مناصب پر فائز رہا، مگر انتظامی صلاحیتوں سے محروم تھا، عیاش بھی ہوگیا تھا۔ یہ تمام عیب اس کے زوال کا باعث بنے۔

آخر میں یہ پھر عرض کر دیں کہ حضرت میرزا مظہر جان جاناں، سرزمین برصغیر کے جلیل القدر عالم، بلند مرتبہ فقیہ، مشہور شیخ، معروف صوفی اور بہت ہی نیک اور متقی بزرگ تھے۔ فارسی اور اردو کے بہترین شاعر تھے۔ ان کے دور کے علما و مشائخ اور ادبا و شعرا کھلے

دل سے ان کی تعریف کرتے اور ان کو مختلف قسم کے علمی اوصاف کا مالک قرار دیتے تھے۔
حقیقت یہ ہے کہ ان کا علم ہم دوش عمل اور ان کا فکر ہم آہنگ تحقیق تھا۔

کتاب و سنت کے اس شیدائی کو اللہ نے مرتبۂ شہادت سے سرفراز کیا ——
اللّٰھمّ اغفر لہ وارحمہ۔[۳۲]

۵۷۔ مولانا جار اللہ سائینپوری

مولانا جار اللہ بن محمود بن عطار اللہ بن عبد الحی بن علم الدین سائینپوری کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے کہ وہ حدیث اور فقہ کے ممتاز علمائے ہند میں سے تھے۔ "کتاب الشتی" کے نام سے ان کی ایک مفید تصنیف بھی ہے۔ انھوں نے ۱۱۳۶ھ میں وفات پائی۔[۳۳]

۵۸۔ مولانا جان محمد لاہوری

مولانا جان محمد لاہوری، بارھویں صدی ہجری میں بلدۂ لاہور کے مشاہیر افاضل میں سے تھے۔ حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ لاہور میں پیدا

---

[۳۲] مرزا مظہر جان جاناں کے حالات کے لیے دیکھیے: خزینۃ الاصفیا۔ ج ۱، ص ۶۸۴ تا ۶۸۷۔ مقاماتِ مظہری —— حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۳ —— انوار العارفین، ص ۴۲۲ تا ۴۲۵ —— سروِ آزاد، ص ۲۳۲ —— الیانع الجنی، ص ۶۷ —— گلزارِ اولیا، ص ۴۱ تا ۴۷ —— ملفوظات شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، ص ۵۰، ۴۴ —— کلماتِ طیبات —— تذکرہ بے نظیر، ص ۱۱۶ تا ۱۱۸ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۵۰ تا ۵۴ —— تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۶، ۲۲۷ —— مفتاح التواریخ، ص ۳۵۸ —— مرقع دہلی، ص ۴۰، ۴۱ —— گل رعنا، ص ۱۲۰ تا ۱۳۲ —— معمولات مظہریہ —— مکاتیب مرزا مظہر۔ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط —— آبِ حیات، ص ۴۱ تا ۴۷ —— رودِ کوثر، ص ۶۴۴ تا ۶۴۹

[۳۳] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۵۴

ہوئے اور اسی شہر میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ معرفت و طریقت میں بھی بڑی شہرت کے مالک تھے۔ لاہور کے حلہ پرویز آباد میں، جس کی آبادی شہر سے باہر تھی، سکونت پذیر تھے۔

مولانا جان محمد کے حالات میں مذکور ہے کہ صغر سنی میں شیخ اسماعیل (جو بڑے میاں کے عُرف سے معروف تھے، اب بھی لاہور کے محلہ باغ بان پورہ میں بڑے میاں کا درس موجود ہے) کے خلیفہ شیخ عبدالحمید سے تحصیلِ علم کرتے تھے۔ ایک روز اپنے استاذ (شیخ عبدالحمید) کے ساتھ میاں صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میاں صاحب نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا، اے لڑکے! اگر تم عالم و فاضل ہو جاؤ تو کیا ہمارے ساتھ حدیث کا تکرار کرو گے؟ مولانا جان محمد ابھی عمر کی ابتدائی منزلوں میں تھے، شرم و حیا اور پاسِ ادب سے خاموش رہے۔ شیخ عبدالحمید نے جو اُن کے استاذ تھے، فرمایا، جواب دو کہ اگر آپ کی دعا اور توجہ سے تحصیلِ علم کی نعمت سے بہرہ ور ہو گیا تو حاضرِ خدمت ہوں گا۔ چنانچہ سعادت مند شاگرد نے میاں صاحب ممدوح کے سامنے یہی کلمات دہرا دیے۔ میاں صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کی جو درجۂ قبولیت کو پہنچی اور جان محمد بہت تھوڑی مدت میں علم و فضل کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ یہاں تک کہ علمی فضیلت و قابلیت میں اپنے استاد شیخ عبدالحمید سے بھی فوقیت لے گئے۔ شیخ عبدالحمید، لائق شاگرد کے علم و فضل اور ذہانت و فطانت سے بہت خوش تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اب شاگرد استاذ سے بھی آگے نکل گیا ہے اور اس کا طائرِ ہمت مزید بلندی کی طرف محوِ پرواز ہے تو اپنے سے علیحدہ کر کے خود ہی شیخ تیمور کے حلقۂ درس میں داخل کرا دیا، جو لاہور کے اکابر علمائے وقت میں سے تھے۔ کچھ عرصہ ان سے استفادہ کیا اور دستارِ فضیلت حاصل کی۔ اس کے بعد میاں اسماعیل عرف میاں کلاں کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور حسبِ وعدہ ان سے حدیث کا تکرار کرنے لگے۔ اس کے لیے جمعہ اور دوشنبہ کا دن مقرر ہوا۔ جب تک میاں صاحب زندہ رہے، ہفتے میں دو دن بالالتزام دونوں کے درمیان تکرارِ حدیث کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا جان محمد لاہوری نے ۱۱۲۰ھ کو لاہور میں وفات پائی[۳۴]

۵۹- شیخ جلال الدین گجراتی

شیخ جلال الدین بن محمد بن جعفر بن جلال بن محمد حسینی بخاری گجراتی، ۲ جمادی الاولی ۱۰۶۲ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ گرامی شیخ محمد گجراتی ایک نامور عالم تھے، بیٹے نے انہی سے علم حاصل کیا اور فقہ کی تحصیل بھی کی، طریقت و تصوف بھی انہی سے سیکھا، جہاں تک کہ علم و فضل اور فقہ و تصوف کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ دو رسالے بھی تصنیف کیے۔ ایک خوابوں کی تعبیر سے متعلق، جس کا نام "مرآۃ الرویا" ہے۔ دوسرا اذکار و اشغال اور وظائف کے بارے میں، اس کا نام "مفتاح الحاجات" ہے۔

وفات سے پہلے سخت بیمار ہو گئے تھے، بیماری کچھ اس نوعیت کی تھی کہ غذا بالکل ترک کر دی تھی۔ البتہ تھوڑا سا پھل انار یا انجیر وغیرہ کھا لیتے تھے۔ ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۱۴ھ کو احمد آباد میں فوت ہوئے۔ "محبوب ذی المنن" کی روایت کے مطابق ۱۱۰۴ھ کو وفات پائی[۳۵]

۶۰- مولانا جلال الدین مچھلی شہری

مولانا جلال الدین جعفری ہاشمی مچھلی شہری، قاضی ثناء الدین جعفری زینبی ہاشمی کی نسل سے تھے۔ سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مشہور مقام مچھلی شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ علم حاصل کیا اور فقہ و اصول کے ماہرین میں گردانے گئے۔ عمر بھر درس و

---

۳۴ تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۹ —— حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۳ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۵۵ —— خزینۃ الاصفیا، ص ۴۸۳، ۴۸۴۔

۳۵ محبوب ذی المنن حصہ دوم، ص ۲۳۵، ۲۳۶ — مرآۃ احمدی۔ ج ۲، ص ۲۹ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۵۶۔

تدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف رہے۔ علم فقہ میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ فتاوی عالمگیری کی ترتیب و تدوین میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ کہتے ہیں، انھوں نے فتاوی عالم گیری کی پہلی جلد تصنیف کی۔[۳۶]

۶۱- شیخ جمال الدین گجراتی

شیخ جمال الدین بن رکن الدین عمری چشتی گجراتی، عالمِ صالح اور اپنے دور کے مشہور شیخ تھے۔ ۱۰۸۸ھ کو احمد آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے والدِ گرامی شیخ رکن الدین گجراتی سے جو عالمِ کبیر تھے، علم حاصل کیا۔ عرصے تک ان سے منسلک رہے، طریقت و تصوف کی تحصیل بھی ان ہی سے کی۔ علوم سے فارغ ہونے کے بعد درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ متعدد کتابوں پر شروح و حواشی لکھے۔ بڑے نیک، صاحب جود و سخا اور پیکر کرم و احسان تھے۔ طلبا کی ایک جماعت ان سے استفادہ کرتی تھی، ان کے ساتھ انتہائی سخاوت کا برتاؤ کرتے۔ مسافروں کی بہت مدد کرتے۔ ان کے شب و روز کے دو ہی مشاغل تھے، ایک نیکی و عبادت، دوسرے تدریس و تصنیف!

ان کی تصنیفات و شروح میں سے مندرجہ ذیل کتابیں لائق تذکرہ ہیں۔

شرح جامی پر حاشیہ، منہل الصافی پر حاشیہ، زبدہ پر حاشیہ، قطب الدین رازی کی شرح شمسیہ پر حاشیہ، علمِ معانی و بیان کی مشہور کتاب مطول پر حاشیہ، سعد الدین تفتازانی کی شرح العقائد پر حاشیہ، حاشیہ الخیالی پر حاشیہ، مختصر المعانی پر حاشیہ، تلویح پر حاشیہ، تفسیر المدارک پر حاشیہ، تفسیر بیضاوی پر حاشیہ، تفسیر المحمدی پر حاشیہ، تفسیر حسینی پر حاشیہ۔ ان تفاسیر قرآن پر حواشی کے علاوہ خود انھوں نے تفسیر المختصر اور تفسیر نصیری کے نام سے تفسیریں لکھیں۔ علاوہ ازیں فتح الجمال تصنیف کی۔

---

[۳۶] تجلّی نور۔ ج ۲، ص ۱۲۱، ۱۲۲ ——— برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، ص ... ——— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۵۶، ۵۷ ——— تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۷۶

پھر مولانائے روم کی مثنوی کی شرح سپردِ قلم کی۔ سوا طح جامی کی شرح لکھی۔ جام جہاں نما کی شرح لکھی، فصوص الحکم کی شرح لکھی، سید محمد بن یوسف حسینی کی "اسمار الاسرار" کی شرح لکھی، مرآۃ العارفین کی شرح، التعرف کی شرح، عوارف المعارف کی شرح، آداب المریدین کی شرح، اسرار الخلوت کی شرح، بحر الاسرار کی شرح بھی ان کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے، علاوہ ازیں درۃ التاج، مرقاۃ السلوک، قرۃ العین، نور الاولیا، رکن الطریقہ، مشہد الجمال، آثار السلوۃ، مراصد الکمال، کمند وحدت، شرح التقسیم وغیرہ متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اس عالمِ دین کو ہر موضوع پر عبور حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات و شروح کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں ایک سو بیالیس شروح و تصانیف ان کی یادگار ہیں۔

شیخ جمال الدین گجراتی شاعر بھی تھے۔ چنانچہ فارسی کا ایک دیوان بھی ان کے رشحاتِ فکر میں شامل ہے۔

اس عالمِ دین نے ٦ ربیع الثانی ۱۱۲۴ھ کو وفات پائی۔[۳۷]

ح

۶۲- مولانا حامد جون پوری

مولانا حامد جون پوری حنفی المسلک تھے، بہت بڑے عالم، شیخ اور کبار فقہائے ہند میں سے تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے، لیکن آغاز جوانی ہی میں ترکِ وطن کر گئے تھے۔ زیادہ تر کتبِ درسیہ سید محمد زاہد بن سید محمد اسلم ہروی سے پڑھیں اور بعض کے لیے دانشمند خاں یعنی علامہ محمد شفیع یزدی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، پھر اس مرتبہ علمی کو پہنچے کہ اکثر علوم و فنون میں اپنے شیوخ و اساتذہ کی زندگی ہی میں مہارت پیدا کر لی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسندِ تدریس آراستہ فرمائی اور علمی و فنی مباحث میں درجۂ کمال سے سرفراز ہوئے۔

ان کی فراوانیٔ علم و فضل سے متاثر ہو کر بادشاہِ ہند شاہ جہان نے ان کے لیے یومیہ

---

۳۷ نزہۃ الخواطر۔ ج ٦، ص ۵۸، ۵۹ ــــ محبوب ذی المنن حصہ دوم، ص ۲۲۹ تا ۲۳۳

وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ بعد ازاں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں "فتاویٰ عالم گیری" کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا تو عالم گیر نے اس خدمتِ علمی پر مامور کر دیا۔ عالم گیر نے ان کو اپنے بیٹے شاہ زادہ محمد اکبر کا اتالیق بھی بنا دیا تھا۔[1]

ڈاکٹر زبید احمد نے مولانا حامد جون پوری کے حاشیہ تفسیر بیضاوی کی نشان دہی بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ بوہار لائبریری (ہوگلی) میں موجود ہے۔[2]

۶۳۔ شیخ حبیب اللہ بہاری

شیخ حبیب اللہ بن ذکی الدین حنفی بہاری، شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کی اولاد سے تھے۔ بلدۂ بہار میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد شیخ ذکی الدین بہاری سے جو ایک عالمِ دین، بزرگ تھے، تحصیل کی۔ بعد ازاں عازمِ جون پور ہوئے، وہاں شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کے بیٹے شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ یہاں تک کہ مختلف علوم و فنون اور فقہ میں کمال حاصل کیا۔ پھر واپس اپنے شہر بہار تشریف لے گئے اور اپنے اسلاف کی مسندِ مشیخت کو زینت بخشی۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ ہدیۃ السالکین اور تحفۃ الذاکرین کے نام سے دو کتابیں تصنیف کیں۔

جمعرات کے روز ۲۹ ربیع الاوّل ۱۱۱۸ھ کو وفات پائی۔[3]

---

[1] تجلی نور۔ ج ۲، ص ۹۳، ۹۴ — فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۱۲۹، ۱۳۰ — بزمِ تیموریہ، ص ۲۴۰، ۲۴۱ — انفاس العارفین، ص — سبحۃ المرجان، ص — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۴ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۶۰ — برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ، ۲۹۸، ۲۹۹ — "معارف" اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۴۷ء

[2] عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، ص ۲۷۳

[3] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۶۰ بحوالہ گنجِ ارشدی

۶۴۔ قاضی حبیب اللہ تاج پوری

قاضی حبیب اللہ تاج پوری، عابد و زاہد، متقی و متورع اور نامور عالم و فقیہ تھے۔ تاج پور شہر کے منصبِ قضا پر فائز تھے۔ طریقت و تصوف سے بھی وابستگی تھی اور اس سلسلے میں شیخ محمد ارشد بن محمد رشید عثمانی جون پوری سے فیض یافتہ تھے۔ رشد و ہدایت کے پیکر تھے، فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے۔ عمر بھر لوگوں کی ظاہری و باطنی اصلاح میں مصروف رہے۔ ۱۸ ذی الحج ۱۱۰۸ھ کو وفات پائی۔ مدن پور میں مدفون ہیں، جو اعمالِ سارن میں ایک قریہ تھا۔[۵۴]

۶۵۔ شیخ حبیب اللہ قنوجی

شیخ حبیب اللہ قنوجی کا مولد و منشا شہر قنوج ہے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کے لیے سندیلہ کا عزم کیا۔ وہاں کے بعض علما سے "ضوء المصباح" کا درس لیا۔ پھر جون پور گئے جو اس زمانے میں علم و فضل کا مرکز تھا۔ وہاں مولانا عبدالباقی صدیقی جون پوری کے مدرسے میں داخلہ لیا اور تمام مروّجہ کتبِ درسیہ پڑھیں۔ پھر الٰہ آباد کا قصد فرمایا، وہاں شیخ عبدالجلیل الٰہ آبادی (متوفی ۶ شعبان ۱۱۱۴ھ) سے اخذِ طریقت کیا اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہ کر تصوف و سلوک کی منزلیں طے کیں۔

شیخ موصوف حنفی المسلک تھے، عالمِ باعمل اور فقیہ نامدار تھے۔ لوگوں کی اصلاح و ارشاد ان کا اصل کام تھا۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ مذاق الصوفیہ: یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور تصوف سے متعلق ہے، آغاز "حمد بے حد مر جلیلے را" کے الفاظ سے ہوتا ہے۔

۲۔ خلاصۃ الاکتساب: یہ کتاب بھی سلوک و تصوف کے بارے میں ہے اور فارسی

---

[۵۴] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۱ بحوالہ گنج ارشدی

میں ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: سبحان اللہ منہ البدایۃ و النہایۃ۔

۳۔ جواہر الخمسۃ۔

۴۔ تذکرۃ الاولیا۔

۵۔ روضۃ النبی فی الشمائل۔

۶۔ انیس العارفین۔

۷۔ ایک کتاب الفاضل کے نام سے مسائلِ فقہ کے بارے میں تصنیف کی۔

۸۔ ایک رسالہ علمِ منطق کے موضوع میں لکھا۔

شیخ حبیب اللہ قنوجی نے ۱۱۴۰ھ کو قنوج میں وفات پائی۔ بعض علما نے اس عالم و فقیہ کی تاریخ وفات الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب۔ کے الفاظ سے نکالی[۵]

۶۶۔ سید حسن دہلوی عرف رسول نما

سید حسن بن ابوالحسن حسینی نارنولی ثم دہلوی، رسول نما کے عرف سے معروف تھے۔ شیخ وقت اور عالم و فقیہ تھے۔ نارنول میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ قرآن مجید اور فارسی کے چند مختصر رسائل پڑھنے کے بعد بچوں کو پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد جون پور چلے گئے اور وہاں کے بعض علما سے چند روز تک عربی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان ہی دنوں جون پور کے ایک عالم بنارس کے سفر پر روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ چلے گئے۔ پھر اس عالم نے بنارس سے الٰہ آباد کا قصد کیا تو سید حسن نے موضع بہلول کی راہ لی، جو ان دنوں لکھنؤ سے بیس میل کے فاصلے پر ایک قریہ تھا۔ بہلول کے رئیس کا نام چودھری جلال الدین تھا، وہ ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ بڑے اعزاز سے پیش آیا اور اپنے گاؤں میں ان کی آمد کو مغتنم جانا۔ کچھ عرصے بعد

---

[۵] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۶۲ —— تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۶ —— حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۷، ۴۳۸ —— عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، ص ۳۰۶ و ۳۶۳

بہلول سے لکھنؤ چلے گئے۔ لکھنؤ میں ایک عالمِ دین مولانا عبدالقادر عمری لکھنوی اقامت پذیر تھے، ان سے تحصیلِ علم کی۔ جون پور، بنارس، بہلول اور لکھنؤ میں ان کی کل مدتِ قیام و سفر چودہ سال بنتی ہے۔

لکھنؤ سے اپنے وطن نارنول کا عزم کیا اور طریقہ ملامتیہ کے فقرا میں شمولیت اختیار کرلی۔ بارہ سال نارنول میں مقیم رہے۔ پھر دہلی چلے گئے اور تادمِ زندگی دہلی ہی کو مسکن قرار دیے رکھا۔

سید حسن ممدوح علمِ تفسیر، حدیث، اصولِ فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ اس دور کے علما و مشائخ میں، علم و حلم، انکسار و تواضع، وقار و اکرام اور ہیبت و جلال میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ ہمیشہ ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہتے، نہ خود اہلِ دنیا سے اختلاط رکھتے اور نہ اہلِ دنیا کو اپنے قریب آنے کا موقع دیتے۔ لوگوں سے طریقۂ ملامتیہ کے انداز کی باتیں کرتے تاکہ وہ ان سے متنفر ہوں اور دور رہیں۔ کسی کو مروجہ طریقے کے مطابق بیعت کی دعوت نہ دیتے، صرف اپنے مخلصین کو فیض پہنچاتے۔

مشہور تھا کہ خواب میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت و رؤیت کا شرف حاصل ہوتا تھا، لہٰذا لوگوں نے ان کو "رسول نما" کا لقب دے رکھا تھا۔

اس عالم و فقیہ نے ہفتے کے روز ۲۲ شعبان ۱۱۰۳ھ کو وفات پائی۔[۶۵]

۶۷- قاضی حسن سعید جون پوری

قاضی حسن سعید بن محمد سعید بن محمد مبارک حسینی جون پوری، شیخ وقت، عالم اور متقی تھے، فقہ اور اصولِ فقہ کے ماہرین میں سے تھے، ان کا مولد و منشا جون پور تھا۔ طویل مدت تک حصولِ علم میں مشغول رہے، یہاں تک کہ فتویٰ اور تدریس کے منصب بلند پر فائز ہوئے۔

---

۶۵ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مناقب الحسن رسول نما ــــ منتخب اللباب۔ ج ۲، ص ۵۵۲، ۵۵۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۳، ۶۴ ــــ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۵۳ ــــ سمات الاخیار، ص ۷۶

پہلے جون پور کی مسند افتا سنبھالی، پھر وہیں کے قاضی مقرر کیے گئے۔ ان کے والد شیخ محمد سعید جون پوری دہلی میں ملوک و امرا کے نزدیک بڑی عزت و احترام کے مالک تھے۔ قاضی حسن سعید نے بھی حکامِ وقت سے تقرب پیدا کر لیا تھا، جس کے نتیجے میں دہلی کے قاضی اکبر کے منصب کو پہنچے۔ پھر ہندوستان کی مسندِ قضا سے سرفراز ہوئے ـــــ بارھویں صدی ہجری کے اس جید عالم و فقیہ نے ۱۱۵۷ھ کو وفات پائی۔[۵۷]

۶۸۔ قاضی حیدر کشمیری

قاضی حیدر بن ابو حیدر کشمیری، شیخ و فاضل اور دیارِ کشمیر کے اکابر فقہا میں سے تھے۔ مسلکاً حنفی تھے اور قاضی خاں کے عرف سے معروف تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ شیخ عبدالرشید زرگر کشمیری (متوفی ۱۱۵۵ھ) اور دیگر علما سے علم حاصل کیا۔ جب مختلف علوم و فنون کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تو تنگیٔ معاش کی وجہ سے ترکِ وطن کر کے دہلی کا عزم کیا اور اورنگ زیب عالم گیر کے لشکر میں آئے۔ وہاں سیادت خاں صدر الصدور سے تعلق پیدا کر کے بادشاہ (اورنگ زیب) کی خدمت میں حاضری دی۔ اورنگ زیب علمائے دین کا انتہائی قدردان تھا، اس کو ان کی وسعتِ علم کا پتا چلا تو اپنے پوتے شاہ زادہ محمد عظیم کا اتالیق مقرر کر دیا۔ کچھ عرصہ اس خدمت پر مامور رہے۔ پھر دہلی کے قاضی مقرر کیے گئے۔ ان کی معدلت گستری سے بادشاہ اتنا متاثر ہوا کہ ۱۱۱۷ھ کو قاضی القضاۃ کا منصب عطا کر دیا۔

اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے ان کو جودھ پور بھیج دیا تھا۔ وہاں جا کر مسجدیں تعمیر کیں اور گرجے ڈھا دیے، اس علاقے کے مختلف شہروں میں قاضی و والی مقرر کیے اور غیر مسلموں سے جزیہ وصول کیا۔ اس کشمیری عالم و فقیہ نے عارضۂ اسہال سے

---

[۵۷] تجلی نور۔ ج ۲، ص ۷۲ ـــــ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۳۷۵ ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۴، ۶۵

۱۲۱۱ھ کو دکن میں وفات پائی، ان کی میت دکن سے کشمیر لا کر دفن کی گئی۔[۵۸]

خ

۶۹۔ خواجہ میر درد دہلوی

خواجہ میر درد دہلوی نجیب الطرفین سید تھے، ان کا سلسلۂ نسب والد کی جانب سے گیارہ واسطوں سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے اور والدہ کی جانب سے پچیس واسطوں سے حضرت امام حسن عسکری سے ملتا ہے۔

خواجہ نقشبند

خواجہ میر درد کے اجدادِ کرام میں سے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ایک بزرگ خواجہ بہار الدین نقشبند تھے۔ یہ سلسلہ نقشبندیہ کے سرخیل تھے۔ ان کا نام محمد بن محمد بخاری تھا اور خواجہ بہار الدین کے عرف سے معروف تھے۔ "خواجہ" ان کا لقب تھا، جس کا اطلاق ان کی اولاد میں بھی جاری رہا۔ اس لفظ کی وضاحت میں خود خواجہ میر اپنی کتاب "علم الکتاب" میں لکھتے ہیں:

"خواجہ بمعنی مالک و سردار و صاحب و مولیٰ است، لہٰذا اطلاق آں بر ذرّیات مولی الموالی علیہ السلام کردہ اند، و اکابر سادات ملقب بہ لقب خواجگان شدہ اند، و حضرت بہار الدین نقشبند قدس سرہ العزیز کہ از ساداتِ صحیح النسب اند و با یازدہ واسطہ جد پدری بندہ اند، نیز خواجہ می گفتند۔"

یعنی لفظ خواجہ مالک، سردار، صاحب اور مولیٰ کے معنی میں مستعمل ہے، اس لیے اس کا اطلاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد پر ہونے لگا اور اکابر سادات خواجگان کے

[۵۸] مآثر عالم گیری، ص ۵۱۴، ۵۲۱، ۵۲۴ — منتخب اللباب، ج ۲، ص ۶۰۶، ۶۰۷ — خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۶۲ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۳ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۷۷ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۴ — تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۱۶، ۲۱۷ — روضۃ الابرار، ص ۵۹

لقب سے ملقب ہوئے۔ حضرت بہاءالدین نقشبند قدس سرہ العزیز بھی جو کہ صحیح النسب سادات میں سے تھے اور گیارہ واسطوں سے والد کی جانب سے میرے جدّ امجد ہیں، خواجہ کہلائے۔

خواجہ بہاءالدین کو نقشبند اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کا پیشہ کمخواب بافی اور نقشبندی تھا۔ چنانچہ سفینۃ الاولیا میں داراشکوہ ان کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

حضرت می فرمودند کہ من و پدرم بہ صنعت کمخواب بافی و نقشبندی مشغول بودیم۔
کہ حضرت خواجہ بہاءالدین فرمایا کرتے تھے کہ میں اور میرے والد کمخواب بافی اور نقشبندی کا کام کرتے تھے۔

خواجہ بہاءالدین کی وفات کے بعد ان کی اولاد نے بھی اپنے لیے لفظِ خواجہ اور نسبتِ نقشبند کو اپنے اسما کے ساتھ برقرار رکھا —— خواجہ نقشبند ممدوح ۷۱۸ھ کو بخارا میں پیدا ہوئے۔ عمر بھر رشد و ہدایت میں مشغول رہے۔ ۱۳ ربیع الاوّل ۷۹۱ھ کو بخارا میں وفات پائی۔ "قصرِ عارفاں" میں دفن کیے گئے جو اس زمانے میں بخارا سے ایک کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔

برِصغیر میں آمد

خواجہ بہاءالدین نقشبند کے کم و بیش تین سو سال بعد ان کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ محمد طاہر نقشبند اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں واردِ ہند ہوئے، اور یہی وہ بزرگ ہیں جنھیں خواجہ میر درد کے مورثِ اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ اورنگ زیب بزرگانِ دین اور علمائے کرام کا بہت قدردان تھا، وہ ان سے انتہائی عقیدت سے پیش آیا، اپنے قریب بٹھایا اور حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کی درخواست کی، مگر خواجہ محمد طاہر نے اسے منظور نہ فرمایا۔ ان کے تین بیٹے تھے، خواجہ محمد صالح، خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ فتح اللہ۔ ! خواجہ صاحب نے اپنے ان بیٹوں کو تو دہلی میں عالم گیر کے دربار میں چھوڑا اور خود حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ (ایک روایت کے مطابق بخارا چلے گئے تھے)۔ خواجہ صاحب کے دہلی سے جانے کے بعد اورنگ زیب بادشاہ

نے ان کے تینوں بیٹوں کی بڑی توقیر کی اور ان کی شان کے مطابق مناصب عطا کیے۔
خواجہ محمد صالح اور خواجہ محمد یعقوب کی تو اپنے بھائی شاہ زادہ مراد کی دو بیٹیوں سے شادی بھی کردی تھی۔ تیسرے بھائی خواجہ فتح اللہ کا عقد بھی بادشاہ نے ایک مغل شاہ زادی سے کرنا چاہا مگر انھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ صحیح النسب سید ہیں، مغل خاندان میں شادی کر کے اپنے نسب میں اختلال نہیں پیدا کرنا چاہتے۔

خواجہ فتح اللہ کے بیٹے نواب ظفر اللہ خاں اور نواب ظفر اللہ خاں کے بیٹے خواجہ محمد ناصر عندلیب تھے۔ خواجہ محمد ناصر کے والد (نواب ظفر اللہ خاں) اور دادا (خواجہ فتح اللہ خاں) کا شمار عہدِ عالم گیری کے امرا میں ہوتا تھا، لیکن خواجہ محمد ناصر پر ترکِ دنیا اور درویشی کا غلبہ تھا اور مستغنی المزاج بزرگ تھے، اس لیے قبولِ امارت اور حصولِ منصب کو درخور اعتنا نہیں گردانا، انھوں نے فقر و غنا کی زندگی بسر کرنا شروع کردی۔
خواجہ محمد ناصر عندلیب کو تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی، مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصنیفات ہیں:

۱۔ نالۂ عندلیب: یہ کتاب فارسی نثر میں ہے۔ مصنفِ شہیر نے یہ کتاب ۱۱۵۳ھ کو مکمل کی۔ مشہور عالم و مصنّف نواب سید محمد صدیق خاں رحمۃ اللہ علیہ (بھوپال) کے فرزندِ گرامی جناب نواب سید نور الحسن خاں مرحوم کی سعیِ جمیلہ سے شائع ہو چکی ہے۔ اٹھارہ سو صفحات کو محیط ہے۔

۲۔ رسالہ ہوش افزا: یہ بھی نثر میں ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۳۔ دیوانِ عندلیب: خواجہ ممدوح شاعر بھی تھے۔ یہ ان کے فارسی کلام کا مختصر مجموعہ ہے۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب عالم و صوفی اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ انھوں نے چھیاسٹھ [۶۶] سال کی عمر پا کر ۱۱۷۲ھ کو انتقال کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لائق بیٹے خواجہ میر دردؔ مسند نشین ہوئے، جن کے ضروری حالات درج ذیل ہیں۔
باپ کی وفات کے وقت (۱۱۷۲ھ میں) خواجہ میر دردؔ کی عمر انتالیس [۳۹] سال

تھی، لہٰذا ان کا سالِ ولادت ۱۱۳۳ھ ہے۔ ان کا نام خواجہ میر ہے اور لفظ ”خواجہ“ نام کا جز ہے۔ یہ نام ان کے نانا میر سید محمد قادری بن میر احمد خاں شہید نے رکھا تھا۔ اس ضمن میں خواجہ میر درد خود لکھتے ہیں:

ایں اسم فقیر کہ خواجہ میر است وقت تولدِ بندہ والدِ بزرگ وارِ والدۂ ماجدۂ ام سید العارفین میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خاں شہید گزاشت اند۔[۵]

یعنی اس فقیر کا نام خواجہ میر ہے جو میری ولادت کے وقت میری والدۂ گرامی کے والد سید العارفین میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خاں شہید نے رکھا۔

تعلیم و تربیت

خواجہ میر نے علومِ رسمیہ کی کتابیں اپنے والدِ محترم خواجہ محمد ناصر عندلیب سے پڑھیں۔ البتہ مثنوی مولانا روم کے لیے مفتی دولت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فارسی کی تعلیم سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی سے حاصل کی۔ خواجہ میر تمام علومِ شرعیہ میں ماہرِ کامل تھے، اور قرآن، علومِ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور تصوف و طریقت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ فنِ موسیقی میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔

ابتدائے جوانی میں سپاہی پیشہ اور فوجِ شاہی میں ملازم تھے۔ بعد ازاں عین عالمِ شباب میں (انتیس ۲۹ سال کی عمر کو پہنچے تو) یہ سلسلہ ترک کر کے اور علائقِ دنیا سے الگ ہو کر فقر و درویشی کی زندگی اختیار کر لی اور سلوک و تصوف کی وادی میں قدم زن ہو گئے۔ پھر تمام عمر اسی راہِ حق کے مسافر رہے۔ وہ سلسلۂ نقشبندیہ کے چشم و چراغ تھے اور اپنے نام کے ساتھ ”محمدی“ کی نسبت رکھتے تھے۔ وہ نقشبندی مجددی محمدی“ کہلاتے تھے۔ حنفی المسلک تھے، اور بڑے متقی اور پرہیز گار تھے۔

سلسلۂ نقشبندیہ میں سماع ممنوع ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میر درد سماع کے قائل تھے اور فنِ موسیقی کے بھی استاد مانے جاتے تھے۔ دہلی کے تمام بڑے بڑے مغنی

۵۔ علم الکتاب، ص ۸۴

ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس فن کی باریکیوں کا علم حاصل کرتے تھے۔ سماع کے بارے میں درد کہا کرتے تھے کہ سماع اور غنا کے سلسلے میں لوگ خود ہی میرے پاس آتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے، چلے جاتے ہیں، میں نہ کسی کو بلاتا ہوں، نہ کسی کے پاس جاتا ہوں، نہ گانا سننے کو دوسروں کی طرح عبادت سمجھتا ہوں، نہ انکار کرتا ہوں، نہ اس کی اباحت کا فتوی دیتا ہوں۔ البتہ اس سلسلے میں میرا عقیدہ وہی ہے، جو میرے بزرگوں کا ہے ——— عقیدۂ من ہماں است کہ عقیدۂ بزرگانِ من است [۵۲]

بادشاہ کو سرزنش

خواجہ میر درد بے حد مستغنی المزاج تھے، آدابِ محفل کا بھی انتہائی خیال رکھتے تھے، جو اس کا خیال نہ رکھتا اگرچہ وہ کتنی بڑی شخصیت کا مالک ہوتا خواجہ اسے فوراً ڈانٹ دیتے اور سرزنش کرتے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے ——— ان کے ہاں ہر قمری مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو محفلِ سماع منعقد ہوتی تھی، جس میں اس دور کے بڑے بڑے علما و مشائخ اور وزرا و امرا شامل ہوتے تھے۔ حتّٰی کہ اس زمانے کا مغل حکمران شاہ عالم ثانی بھی اس محفل میں شریک ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ شاہ عالم کے پاؤں میں شدید درد تھا، وہ اسی حالت میں محفلِ سماع میں آگیا، لیکن تکلیف اتنی بڑھی کہ وہ برداشت نہ کرسکا اور شدتِ درد سے مجبور ہو کر تھوڑا سا پاؤں پھیلا دیا۔ خواجہ میر درد کے فقر اور بوریا نشینی نے شہنشاہ کی اس حرکت کو اپنے روایتی آدابِ محفل کے منافی سمجھا اور فرمایا "یہ چیز فقیر کے آدابِ محفل کے خلاف ہے"۔ بادشاہ نے عذر بیان کیا اور معافی مانگی۔ فرمایا "اگر طبیعت خراب تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی"۔

خواجہ میر کا تخلص

خواجہ میر کا تخلص درد تھا، لیکن تخلص کے لیے یہ لفظ کیوں پسند کیا؟۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ خود ہی لکھتے ہیں کہ میرے والد خواجہ محمد ناصر، عندلیب تخلص کرتے

---

۵۲ نالۂ درد، ص ۷۔ نالہ ۳۷

تھے، ان کے پیر شاہ سعد اللہ، گلشنؔ تخلص کرتے تھے اور ان کے پیر حضرت عبد الاحد، گلؔ تخلص کرتے تھے، لہٰذا اس رعایت سے میں نے اپنے لیے، دردؔ تخلص تجویز کر لیا۔[۵۳]

تخلص کے بارے میں وہ مزید لکھتے ہیں:

میرے ناموں کی طرح میرا تخلص بھی الہامی ہے۔ قرآنِ مجید میں پہلے پارے میں جو الف، لام، میم، حروف مقطعات آئے ہیں، ان کے متعلق بعض اہلِ معارف کا کہنا ہے کہ اگر انھیں ملا کر لکھا جائے تو "الم" بن جاتا ہے، اور "الم" عربی میں "درد" کو کہتے ہیں، اور یہی میرا تخلص ہے۔

عُسرت اور تنگ دستی

خواجہ میر دردؔ کے والدِ مکرم خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ کو اللہ نے تمام نعمتوں سے نوازا تھا۔ ان کے آبا و اجداد بھی امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، لیکن خود انھوں نے علائق دنیوی سے کنارہ کش ہو کر درویشانہ زندگی اختیار کر لی تھی اور گوشہ نشین ہو گئے تھے، یہی اثر سعادت مند بیٹے (خواجہ میر درد) پر بھی پڑا۔ انھوں نے بھی ملازمت و مناصب کو ترک کر دیا، جائیداد بھی چھوڑ دی، اور اپنے آپ کو یادِ الٰہی کے لیے وقف کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غربت و افلاس نے آگھیرا اور گھر میں عُسرت و تنگ دستی نے ڈیرے ڈال دیے۔ یہاں تک کہ فاقہ کشی تک نوبت آگئی۔ مگر اس مردِ خدا نے نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور نہ کسی سے کبھی کچھ طلب کیا۔ امرائے مملکت اور وزرائے حکومت ان کے گھر آتے اور فیض حاصل کرتے تھے، خود بادشاہ ان کی مجلسوں میں آتا اور استفادہ کرتا تھا، لیکن انھوں نے کسی کے حضور دامنِ طلب دراز نہیں کیا۔ اپنی بوریا نشینی اور فقر کے مقابلے میں متاعِ دنیا کو ہمیشہ حقیر گردانا۔ قدرتی طور پر گھر کے تمام افراد کو بھی یہی تربیت حاصل ہو گئی تھی، وہ تکلیف برداشت کر لیتے تھے، مگر عالمِ آخرت کے مقابلے میں اس جہانِ فانی کی کسی شے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کی عسرت و غربت کا لوگوں کو بھی علم تھا،

---

[۵۳] آہِ سرد، ص ۱۵۶

لیکن کسی کو کچھ پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور ان کے جذبہ استغنائے قلب اور عاطفہ توکل علی اللہ سے سب مرعوب تھے اور کچھ کہنے کی اپنے آپ میں ہمت نہ پاتے تھے۔

خواجہ میر درد کی یہی ادائے خاص تھی، جس کی وجہ سے ان کی ذاتی عظمت و رفعت، خودداری و بلند ہمتی، ان کے علم و فضل، فقر و استغنا، توکل و قناعت، زہد و تقویٰ اور عجز و انکساری کا سب معاصرین کھلے اور واضح الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔

ان کے زمانے میں سلطنتِ مغلیہ انتہائی ضعف و اضمحلال کا شکار ہوگئی تھی، ہر طرف انتشار اور اختلال پھیلا ہوا تھا، شہر دہلی ملک کا دار الخلافہ تھا، لیکن یہ شہر گوناگوں شورشوں اور سیاسی سازشوں کا شکار ہوگیا تھا، امن و امان مفقود ہو چکا تھا، اہلِ کمال معاشی بدحالی کا نشانہ بن چکے تھے اور علمائے دین کی قدر و منزلت میں بہت کمی واقع ہوگئی تھی جس کی وجہ سے بے شمار اصحابِ کمال اور اربابِ علم ترکِ شہر کر کے مختلف علاقوں کے نوابوں کے پاس چلے گئے تھے، مگر جن اصحابِ فضل و کمال اور شعرائے عالی مقام نے اس دورِ ابتلا میں بھی دہلی کو اپنا مسکن ٹھہرائے رکھا، ان میں خواجہ میر درد اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے اسمائے گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ کسی موقع پر بھی ان کے پائے استقلال میں جنبش نہیں پیدا ہوئی اور دنیوی عز و جاہ کے عارضی اسباب ان کے فقر و درویشی کی وسیع اور دائمی دولت پر غلبہ نہیں حاصل کر سکے۔ یہ تا دمِ آخر یں دہلی میں مقیم رہے اور ان کی ذات ہمیشہ مرجعِ خلائق رہی۔

تصانیف

خواجہ میر درد جہاں تصوف و طریقت کے مرتبۂ بلند پر فائز تھے اور شعر و شاعری میں انتہائی شہرت کے حامل تھے، وہاں وہ صاحبِ تصانیف بھی تھے۔ انھوں نے بارہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں، جن میں دیوانِ فارسی سمیت گیارہ کتابیں فارسی زبان میں ہیں، اور ایک اردو دیوان ہے۔ ان کتابوں کا مختلف الفاظ میں تعارف درجِ ذیل ہے۔

۱۔ اسرار الصلوٰۃ: یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، خواجہ ممدوح نے یہ اس وقت

تصنیف کیا تھا، جب ان کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ اس کا سنِ تصنیف ۱۱۴۸ھ ہے۔ یہ ان کی اوّلین تصنیف ہے۔ اس میں نماز کے ارکان ہفت گانہ، "سِرّ" کے عنوان سے علیحدہ علیحدہ تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ رسالہ حضرت نواب سیّد محمد صدیق حسن خاں مرحوم کے لائق فرزند نواب سیّد نور الحسن خاں مرحوم کی سعیِ جمیلہ سے اشاعت پذیر ہوا۔

۲۔ واردات : یہ کتاب ایک سو گیارہ "واردات" پر مشتمل ہے، ہر "وارد" کا الگ عنوان قائم کیا گیا ہے، مثلاً واردِ اوّل کا عنوان ہے، "فاتح الواردات" اور واردِ ثانی کا عنوان ہے، "نورٌ من اللہ" وغیرہ۔ اس کی وجہِ تالیف خود خواجہ میر درد نے یہ بیان کی ہے کہ بسا اوقات غلبۂ حالات میں یعنی شدتِ مشاہدہ اور استیلار تالّہ سے جو معانی قلب پر منکشف ہوتے تھے، وہ رباعیات کی شکل میں ڈھل کر زبان سے نکل پڑتے تھے، انہی رباعیات کے مجموعے کو "واردات" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مقاماتِ معرفت و حقیقت کے بیان پر مشتمل ہے۔ ہر وارد کا ایک دیباچہ مرقوم ہے۔ آغاز اور اختتام پر ایک رباعی ہے، اور دونوں رباعیوں کے درمیان، نثر میں تشریحات اور تعلیقات بیان کی گئی ہیں۔ واردات کا سنِ تکمیل ۱۱۷۲ھ ہے۔ اسی سال خواجہ کے والد بزرگوار خواجہ محمد ناصر عندلیب نے وفات پائی اور اسی سال وہ انتالیس ۳۹ سال کی عمر میں باپ کی جگہ مسندِ رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔

یہ کتاب بھی خواجہ صاحب کی دیگر تصانیف کی طرح نواب سیّد نور الحسن خاں مرحوم کی مہربانی سے شائع ہوئی۔

۳۔ علم الکتاب : یہ کتاب بھی نواب سیّد نور الحسن خاں مرحوم کی کوشش سے معرضِ طباعت میں آچکی ہے اور خواجہ میر درد کی سب سے ضخیم کتاب ہے جو ۶۴۸ صفحات کو محیط ہے۔ یہ کتاب درحقیقت رسالہ واردات کی شرح ہے۔ رسالہ واردات ایک سو گیارہ واردات پر مشتمل ہے، خواجہ صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی اور شاگرد خواجہ محمد میر اثر کی فرمائش پر اس کی شرح سپردِ قلم کی اور ایک سو گیارہ رسائل میں منتقل کر دیا، اور پھر اس مجموعے کو "علم الکتاب" کے نام سے موسوم کیا۔

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے "علم الکتاب" کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خواجہ میر درد کے علم الٰہی میں تبحر اور ان کے کمالاتِ معرفت کی حقیقت اس تصنیف سے واضح ہوتی ہے۔ جا بجا طویل عربی عبارتیں بے تکلف غایتِ بلاغت کے ساتھ مثل چشمۂ رواں ہیں، مطالبِ حقہ کا ہجوم ہے، آیات اور احادیث اس روانی اور آسانی سے ہر موقع پر درج ہوتی جاتی ہیں کہ پڑھنے والے کا قلب ان کے انوار سے پُر نور و معمور ہوتا جاتا ہے۔ سلوک کے مسائل کو آیات و احادیث سے مجتہدانہ اور عارفانہ قوت کے ساتھ ثابت کیا ہے، خود خواجہ میر درد "نالۂ درد" میں فرماتے ہیں کہ "نالۂ عندلیب" اور "علم الکتاب" طریقۂ محمدیہ کے سلوک کے لیے کافی ہیں۔ یہ کتاب متانت اور قوتِ تحریر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بہترین تصانیف کے ہم پلّہ ہے۔

۴۔ نالۂ درد : یہ کتاب خواجہ ممدوح نے ۱۱۹۰ھ میں مکمل کی۔ اس کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں کہ علم الکتاب ختم ہونے کے بعد جو نئے مطالب ان کے قلب و ذہن پر وارد ہوئے، ان کو اُن کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثر جمع کرنے لگے۔ جب یہ مجموعہ مکمل ہو گیا تو "نالۂ درد" اس کا نام رکھا۔ یہ رسالہ ۱۲۱ صفحات کو محتوی ہے، اس کی طباعت کا سہرا بھی نواب سید نور الحسن خاں صاحب کی توجہِ خاص کی مرہونِ منّت ہے۔

۵۔ آہِ سرد : اس کا سنِ تکمیل ۱۱۹۳ھ ہے۔ ۶۴ صفحات کا مختصر رسالہ ہے۔ اس کی طباعت بھی نواب سید نور الحسن خاں صاحب کی توجہِ خاص کی مرہونِ منت ہے۔

۶۔ شمعِ محفل : اس رسالے کی تصنیف کا آغاز انھوں نے اپنی عمر کے باسٹھویں سال یعنی ۱۱۹۵ھ میں کیا تھا، اس کی تصنیف سے وہ ۱۱۹۹ھ میں فارغ ہوئے، جب کہ ان کی عمر چھیاسٹھ (۶۶) برس کو پہنچ گئی تھی۔ یہ رسالہ اگرچہ ۱۲۶۷ھ میں مطبع کریمی سہسرام سے چھپ چکا تھا، تاہم نواب سید نور الحسن خاں صاحب نے دوبارہ شائع کرایا۔

۷۔ دردِ دل : اس کی اور شمعِ محفل کی تالیف کا آغاز ایک ہی سال (۱۱۹۵ھ) میں کیا گیا تھا اور اختتام بھی ایک ہی سال (۱۱۹۹ھ) میں ہوا۔ دونوں رسالوں کی دوبارہ طباعت نواب سید نور الحسن خاں مرحوم کی کوشش اور توجہ سے ہوئی۔

۸- حرمتِ غنا : غنا کی حلت اور حرمت کی بحث میں ہے۔

۹- واقعاتِ درد : مسائل تصوف پر مشتمل ہے۔

۱۰- سوزِ دل : یہ بھی تصوف وطریقت کے مسائل کو محیط ہے۔

۱۱- دیوان فارسی : خواجہ میر درد کا فارسی دیوان اگرچہ مختصر ہے، لیکن لطافت و حلاوت، پختگی اور زورِ بیان میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ دیوان بھی خواجہ ممدوح کی دیگر تصنیفات کی طرح نواب سید نورالحسن خاں کی توجہِ خاص سے ۱۳۰۹ھ میں مطبع انصاری دہلی سے طبع ہوکر شائع ہوا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شد منشار ظہور دو عالم وجودِ ما ۔۔۔ جو شید نشائتین ز جوشِ شرابِ ما
جوش زد بادۂ توحید بہ میخانۂ ما ۔۔۔ بحر دارد بہ گرہ قطرۂ پیمانۂ ما
بے خودی پردہ کشائے حرم دل باشد ۔۔۔ بستہ احرامِ رہش لغزشِ مستانۂ ما
زینت وزیبِ زنان باد مبارک بزناں ۔۔۔ سازِ دنیا نکند ہمتِ مردانۂ ما

او دلبر و دل آزار، ما دل ز دست داوہ ۔۔۔ یارب چہ پیش آمد آمادۂ بلائیم
ما از وفا نہ پرسیم تو از جفا نگوئی ۔۔۔ تا چند آزمائی تا چند آزمائیم

بر سرِ کوئے توام یکبار می باید گریست ۔۔۔ ابر تا داند کہ ایں مقدور می باید گریست
نے دوائے راست می آید، نہ جاں ہم میرود ۔۔۔ درد بر حالِ من بیمار می باید گریست

ایک رباعی ملاحظہ کیجیے، کتنی عمدہ ہے:

بر ہستئ، خود اعتمادے می کن ۔۔۔ نے بہر کسے قصد فسادے می کن
چندے اگرت زمانہ ایں جا دارد ۔۔۔ خاکے شو و انتظار بادے می کن

۱۲- دیوانِ اُردو : خواجہ میر درد کا اردو دیوان کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ آخری اشاعت (۱۹۶۲ء) مجلس ترقی ادب لاہور کی ہے، جو جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کے پُر از معلومات مقدمے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ دیوان اردو سے چند شعر ملاحظہ ہوں:

دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں درد کہتے ہیں:

گزروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں واں کے لوگ ۔۔۔ ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا، یہ باغ تھا

مت جا تہ و تازگی پہ اس کی — عالم تو خیال کا چمن ہے
اس زیست کا اعتبار کیا ہے — کوئی دم میں یہ زندگی ہوا ہے

قلبی واردات کے بارے میں درد کے یہ اشعار پڑھیے:

کچھ ہے خبر تجھے بھی کہ اٹھ اٹھ کے رات کو — عاشق تری گلی میں کئی بار ہو گیا
ہم جانتے ہیں درد اندھیرے میں رات کو — تو لگ رہا ہے کوچے میں جس گھات کے لیے
تم آکر جو پہلے ہی مجھ سے ملے تھے — نگاہوں میں جادو سا کچھ کر دیا تھا
یک بیک نام لے اٹھا میرا — جی میں کیا اس کے آ گیا ہو گا

دو رباعیاں پڑھنے کے قابل ہیں:

کیا جانیے کیا دل پہ مصیبت یہ پڑی ہے — اک آگ سی کچھ ہے کہ وہ سینے میں گڑی ہے
اس طرح سے اک لخت جو آنسو نہیں تھمتے — معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

دو نگاہیں جو چار ہوتی ہیں — برچھیاں دل کے پار ہوتی ہیں
بے وفائی پہ اس کی مت جا تو — ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

غزلیات کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

دل مرا پھر دکھایا کس نے — سو گیا تھا، جگا دیا کس نے
وہ مرے چاہنے کو کیا جانے — یہ سندِ لیسا سنا دیا کس نے
وہ بلائے سے بھاگتا تھا اور — درد تجھ تک بُلا دیا کس نے

گل و گلزار خوش نہیں آتا — باغ بے یار خوش نہیں آتا
کیا جفا کے سوا تجھے کچھ اور — اے ستم گار! خوش نہیں آتا
درد ہم کو یہ رات دن تیرا — نالۂ زار خوش نہیں آتا

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما — اس طرف کو کبھو گزر نہ کیا
کیوں بھوئیں تانتے ہو بندہ نواز — سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے سامنے آیا — جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

جتنی بڑھتی ہے اتنی گھٹتی ہے — زندگی آپ ہی آپ کٹتی ہے
زلف کی کج ادائیاں دیکھو — ہر گھڑی منہ سے جا لپٹتی ہے
آج ہے آہ کی ہوا کچھ اور — دیکھیے کس طرف پلٹتی ہے

کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجیے:

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس، ہجومِ یاس، جی گھبرا گیا

حال مجھ غم زدے کا جس تس نے — جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا

دردؔ کا حال کچھ نہ پوچھو تم — وہ ہی رونا ہے، نت وہی غم ہے

مدرسہ یا دَیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا — ہم سبھی مہمان تھے یاں، اک تو ہی صاحبِ خانہ تھا
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
حیف! کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں — آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ — وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
بھول جا، خوش رہ، عبث وے سابقے مت یاد کر — دردؔ یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

کس کی یہ چشمِ مست نے، بزم کو یوں جھکا دیا — مثلِ حباب سرنگوں شرم سے ہر ایاغ ہے
جلتے ہی جلتے صبح تک، گزری اسے تمام شب — دل ہے کہ شعلہ ہے کوئی، شمع ہے یا چراغ ہے
پائیے کس جگہ بتا، اے بتِ بے وفا تجھے — عمرِ گزشتہ کی طرح گم ہی سدا سراغ ہے
سیرِ بہار و باغ سے، ہم کو معاف کیجیے — اس کے خیالِ زلف سے، دردؔ کسے فراغ ہے

وفات

خواجہ میر دردؔ نے چھیاسٹھ [۶۶] سال عمر پاکر بروز جمعہ، ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ کو دہلی میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنی موت کی خود پیش گوئی کی تھی جو بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ ۱۱۹۵ھ میں خواجہ صاحب نے دو رسالے ——— شمعِ محفل اور دردِ دل ——— بہ یک وقت ضبطِ تحریر میں لانا شروع کیے تھے۔ ان دونوں کی تکمیل ۱۱۹۹ھ میں ہوئی۔ "دردِ دل" کے آخر

ہیں خود خواجہ صاحب رقم فرماتے ہیں کہ اب میری عمر کا چھیاسٹھواں[۶۶] سال ہے، اور سن ۱۱۹۹ھ ہے، جو سال اس رسالے کی تکمیل کا ہے، وہی سال میری وفات کا ہے۔ اسے قدرتِ خداوندی کہیے کہ خواجہ صاحب نے اسی سال رحلت فرمائی۔ ان کی قبر پر یہ الفاظ کندہ ہیں ــــ "رحلت ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ یوم جمعہ قبل صبح صادق ــــ"

خواجہ صاحب مرحوم، دہلی میں ترکمان دروازے کے باہر اپنے والدِ بزرگ وار خواجہ محمد ناصر عندلیب کے قریب مدفون ہیں۔ آج کل اس مقام کو "باغیچہ میر درد" کہتے ہیں۔ یہ جگہ شہر پناہ کے باہر شاہ جی کے تالاب سے ملی ہوئی ہے[۵۴]

اولاد

خواجہ میر درد کے ایک ہی بیٹے تھے، جن کا نام خواجہ ضیاء الناصر تھا اور وہ الم تخلص کرتے تھے۔ ان کے علاوہ دو لڑکیاں تھیں۔

خواجہ درد کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی اور شاگرد خواجہ محمد میر آثر مسند نشین ہوئے۔ میر اثر کی وفات کے بعد درد کے صاحب زادے خواجہ ضیاء الناصر الم نے مسندِ رشد و ہدایت کو زینت بخشی۔ ان کے بعد خواجہ محمد نصیر رنج نے یہ خدمت قبول کی، اس طرح یہ سلسلہ خواجہ میر درد کے خاندان میں جاری رہا۔[۵۵]

شاگرد

خواجہ میر درد کے شاگردوں اور ان سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں مسلمان بھی شامل تھے اور ہندو بھی۔ ! مسلمانوں میں ان کے شاگرد مندرجہ ذیل حضرات تھے۔

۱۔ شیخ محمد قیام الدین قائم چاندپوری (متوفی ۱۲۱۰ھ)

۲۔ ہدایت اللہ خاں ہدایت دہلوی (متوفی ۱۲۱۵ھ)

۳۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراق دہلوی (متوفی قبل از ۱۲۴۸ھ)

---

۵۴ مقدمہ دیوان اردو، ص ۴۸

۵۵ ایضاً

۔ خواجہ محمد میر اثر، یہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے مرید اور شاگرد بھی تھے۔ نیک اور متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ خواجہ صاحب کی وفات کے بعد مسند نشین ہوئے۔

لالہ سری رام دہلوی اپنی تصنیف خمخانۂ جاوید میں لکھتے ہیں:

"خواجہ میر درد کے عالمِ ضعیفی میں ان کے ایک مرید نے عرض کی کہ دنیا دارِ فانی ہے اور حضرت کا وقتِ آخر، حضور فرمائیں کہ آپ کے بعد کس کو آپ کا جانشین اور صاحبِ سجادہ مانا جائے۔ آپ یہ سن کر آنسو بھر لائے اور جواباً یہ قطعہ پڑھا:

موت کیا ہم سے فقیروں سے تجھے لینا ہے مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں
تا قیامت نہیں مٹنے کے دلِ عالم سے درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں[۵۶]

چنانچہ میر اثر ہی کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا۔

۵۔ میر محمد علی بیدار۔ عرف میر محمدی (متوفی ۱۲۰۹ھ)

۶۔ مرزا محمد اسماعیل طپش عرف مرزا حاجی۔ دہلی کے باشندے تھے، لیکن بعد میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔

۷۔ محمد پناہ خاں، جو پہلے نثار تخلص کرتے تھے، بعد میں حکیم تخلص کرنے لگے تھے۔

۸۔ خواجہ ضیاء الناصر الم۔ یہ خواجہ میر درد کے فرزند بھی تھے اور شاگرد بھی۔!

ہندوؤں میں ان کے شاگرد مندرجہ تحت حضرات تھے۔

۱۔ نرائن داس بیخود دہلوی۔ دہلی کے مشہور مہاجن تھے۔

۲۔ جھمن ناتھ جھمن۔ دہلی کے باشندے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

۳۔ لالہ بال مکند حضور۔ دہلی کے کھتری تھے۔ فارسی کے ماہر اور عربی سے آشنا تھے۔

۴۔ بھکاری لال عزیز دہلوی۔ بڑے خوش گو شاعر تھے۔

---

۵۶ خمخانۂ جاوید۔ ج ۱، ص ۱۲۶ (مطبوعہ ۱۹۰۸ء)

۷۰- قاضی خلیل اللہ حیدر آبادی

قاضی خلیل اللہ بن قاضی بابا بن آقا رضی حسینی رضوی بخاری ثم حیدر آبادی۔ حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ ان کے والد قاضی بابا عالم دین بزرگ تھے، لائق بیٹے نے ان سے اور دیگر علمائے عصر سے اخذِ علم کیا، اور اپنے دَور کے نامور فقہا میں سے گردانے گئے۔ قاضی بابا، حیدر آباد کی مسند قضا پر متمکن تھے، ان کی وفات کے بعد یہ منصب ان کے بیٹے قاضی خلیل اللہ کے سپرد ہوا۔ قاضی خلیل اللہ، معاملاتِ قضا میں نہایت عمدہ کردار اور اچھی شہرت کے مالک تھے۔ اللہ سے ڈرنے والے، متواضع اور عبادت گزار تھے۔ ہمیشہ ذکرِ الٰہی اور اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مشغول رہتے۔

بارھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ نے ۲۱ رجب ۱۱۵۶ھ کو حیدر آباد میں وفات پائی [۵۷]

۷۱- شیخ خوب محمد گجراتی

شیخ خوب محمد چشتی احمد آبادی گجراتی، اپنے زمانے کے عالم اور فقیہ تھے، معرفت و طریقت میں بھی کامل تھے اور علاقہ گجرات کے مشاہیر مشائخ میں سے تھے۔ انھوں نے بام جہاں نما کی شرح لکھی اور تصوف کے موضوع پر کئی رسالے تصنیف کیے۔ ۲۴ شوال ۱۱۰۳ھ کو احمد آباد میں فوت ہوئے [۵۸]

۷۲- قاضی خیر اللہ جون پوری

قاضی خیر اللہ بن مبارک بن ابو البقا حسینی واسطی جون پوری، بارھویں صدی ہجری

---

[۵۷] نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۸۱ — محبوب ذی المنن حصہ دوم، ص ۶۲۸، ۶۲۹
[۵۸] مرآۃِ احمدی، ج ۲، ص ۱۰۳ —— نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۸۱

کے یہ عالم و فقیہ شہر جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والد گرامی سید مبارک سے جو اس نواح کے جلیل القدر عالم تھے، اخذِ علم کیا۔ بہت ذہین اور طباع تھے۔ علومِ متداولہ میں اس قدر دست رس حاصل کی کہ ان کا شمار کبارِ علما و فقہا کے زمرے میں ہونے لگا۔ وسعتِ معلومات کی بنا پر جون پور کے قاضی مقرر کیے گئے۔ علم و مطالعہ کا شوق اس درجہ غالب تھا کہ زیادہ تر وقت درس و افادہ میں صرف کرتے ۔[۱]

د

۷۳۔ سیّد درگاہی بلگرامی

سرزمینِ بلگرام علم و فضل اور معرفت و طریقت کے لحاظ سے نہایت شہرت کی حامل ہے۔ اس مردم آفرین خطے میں بے شمار علمائے عظام اور فقہائے عالی مقام پیدا ہوئے اور بڑی علمی خدمات انجام دیں۔ ان میں بارھویں صدی ہجری میں جن حضرات نے جنم لیا، ان میں سید درگاہی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے:

سید درگاہی بن سید عبدالخیر بن سید درویش بن سید حاتم بن سید بدرالدین حسینی واسطی بلگرامی۔ سید درگاہی کا مولد و منشا بلگرام ہے۔ ابتدائے عمر ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہو گئے تھے، اس کے لیے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور قاضی علیم اللہ کھندوی (متوفی ۱۱۱۵ھ) اور دیگر علما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تحصیل کی۔ یہاں تک کہ فقہائے حنفیہ کی نامور جماعت میں ان کا شمار ہونے لگا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قاضی علیم اللہ کھندوی کے عمّ محترم شیخ عبدالرسول سے کسب طریقت کیا اور علم و معرفت میں درجہ کمال کو پہنچے۔ بعد ازاں مراجعت فرمائے بلگرام ہوئے اور ہمہ تن درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ اسی کارِ خیر میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں ـــــ ۱۱۱۰ھ کے بعد

---

[۱] تجلی نور۔ ج ۲، ص ۱۷ ـــــ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۴۳۷ ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۸۲

بلگرام میں رحلت فرمائی[1]

۷۴۔ مفتی درویش محمد بدایونی

مفتی درویش محمد عثمانی بدایونی، اجلّ فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ حافظ رحمت خاں کے عہد میں بریلی کے منصبِ افتا پر مامور تھے۔

حافظ رحمت خاں ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں پیدا ہوا، اور حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ وہ روہیل کھنڈ (یعنی بریلی، شاہ جہان آباد اور پیلی بھیت) کا حکمران بن گیا، واقعات کی رفتار بدلتی رہی تاآنکہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) میں حافظ رحمت خاں اور نواب شجاع الدولہ کے درمیان کڑہ میراں پور کے مقام پر جنگ ہوئی۔ نواب شجاع الدولہ کی اعانت کے لیے وارن ہیسٹنگز نے کرنل چمپئن کی سپہ سالاری میں انگریزی فوج روانہ کی، مقابلہ ہوا اور حافظ رحمت خاں مارا گیا۔

حافظ رحمت خاں نہایت عادل، نیک اور رحم دل حکمران تھا۔ غریبوں کا حامی، مظلوموں کا مددگار اور علما و فضلا کا قدردان تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں ہر طرف امن وامان تھا۔ اس نے علما کی بڑی سرپرستی کی، وہ پانچ ہزار علما کو اپنے خزانے سے وظائف ادا کرتا تھا۔ حافظِ قرآن تھا اور اصحابِ فضل وکمال سے عمدہ سلوک روا رکھتا تھا[2]

۷۵۔ شیخ رحمت اللہ لکھنوی

شیخ رحمت اللہ بن غلام محمد بکری بجنوری لکھنوی، مسلکاً حنفی تھے، اپنے زمانے کے

---

[1] مآثر الکرام دفتر اول، ص ۸۵، ۸۶ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۸۳
تقصار جنود الاحرار، ص ۲۰۷

[2] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۸۳ ــــ تاریخ فرخ آباد ــــ حیات حافظ رحمت خاں

نامور عالم، فقیہ اور صوفی تھے۔ انھوں نے مشائخ کے حالات میں "تذکرۃ الاصفیا" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے، سالِ تصنیف ۱۱۱۶ھ اور مقامِ تصنیف لکھنؤ ہے۔[۱]

۷۶۔ شیخ رحمت اللہ کشمیری

شیخ رحمت اللہ بن محمد مقیم بن مومن کشمیری، کشمیر میں پیدا ہوئے اور اسی سرزمین میں تربیت پائی۔ مولانا محمد محسن کشمیری (متوفی ۱۰۸۱ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ پھر خود مسندِ درس آراستہ کی اور سرگرمِ تدریس ہوئے۔ دیارِ کشمیر کے معروف عالم اور یگانہ فقیہ تھے، مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔ بڑے ذکی فطین، عابد وزاہد اور متقی عالم تھے — ۱۱۶۳ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۲]

۷۷۔ مولانا رستم علی قنوجی

مولانا رستم علی بن علی اصغر صدیقی قنوجی، عالمِ کبیر اور شیخِ وقت تھے۔ حنفی المسلک تھے، اور مشہور علمائے وقت میں سے تھے۔

۱۱۱۵ھ کو قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد مولانا علی اصغر صدیقی قنوجی سے، جو نامور عالمِ دین تھے اور جن کا سلسلۂ درس جاری تھا، حصولِ علم کا آغاز کیا، زیادہ تر کتبِ درسیہ انہی سے پڑھیں۔ جب (۱۵ شعبان ۱۱۴۰ھ کو) والد وفات پا گئے تو عازمِ لکھنؤ ہوئے، وہاں استاذ الاساتذہ شیخ نظام الدین بن قطب الدین انصاری سہالوی کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے، اور باقی کتابیں انہی سے پڑھیں۔ ۱۱۴۲ھ میں فارغ التحصیل ہو کر قنوج واپس

---

[۱] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۸۴

[۲] تاریخِ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۶ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۸۴، ۸۵

گئے اور اپنے والد کے مدرسے میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اپنے بھائی مولانا محمد کامل قنوجی (متوفی ۱۱۴۶ھ) سے جو کبار علمائے عصر میں سے تھے، طریقہ نقشبندیہ میں فیض حاصل کیا۔

مولانا رستم علی قنوجی جلیل القدر عالم دین تھے، درس و تدریس اور علم و فضل میں مرتبۂ امامت پر فائز تھے۔ درس و افادہ اور تصنیف و تالیف کے علاوہ ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ بہترین مدرس اور بہترین مصنف تھے۔ عمر کے آخری دور میں جب کہ مرہٹوں نے قنوج پر تسلط حاصل کر لیا تھا، مولانا ممدوح قنوج سے فرخ آباد چلے گئے تھے، وہاں سے بریلی منتقل ہو گئے۔ اس نواح کا حکمران حافظ رحمت خاں تھا، یہ حکمران علما کا بہت قدر دان تھا، اس نے ان کی بہت تکریم کی اور نہایت احترام سے پیش آیا۔ پھر انھوں نے بریلی ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں وفات پائی۔

مولانا رستم علی قنوجی، بہت اچھے مصنف اور مفسّر قرآن بھی تھے۔ ایک طویل مضمون کو مختصر الفاظ میں بیان کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے تفسیر "جلالین"، کے انداز پر قرآن مجید کی مختصر تفسیر لکھی، نیز "نور الانوار شرح منار الاصول" کا اختصار سپردِ قلم کیا۔

اس عالم دین نے ۱۱۷۸ھ کو بریلی میں انتقال کیا اور تدفین بھی وہیں ہوئی، لیکن چھ ماہ بعد ان کی میت کو بریلی سے قنوج لایا گیا اور اپنے والد مولانا علی اصغر علی صدیقی کے قریب دفن کیا گیا۔[۵۳]

ز

۷۸۔ شیخ زین العابدین سرہندی

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے خاندان کا ہر فرد علم و فضل میں یگانۂ

---

۵۳ تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۳ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۸۶، ۸۷ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۹ — ابجد العلوم، ص ۹۳۲ — خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۷۲، ۳۷۴۔

روزگار تھا۔ اللہ نے اپنی رحمتِ بے پایاں سے اس خاندان کو جس نعمتِ عظمیٰ سے نوازا، وہ دیارِ ہند کے چند ہی خاندانوں کے حصے میں آئی ہے۔ اس دودمانِ بلند مرتبت کے ایک بزرگ شیخ زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ سرہندی تھے، جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور شیخ محمد یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ کے فرزندِ گرامی قدر تھے۔

شیخ زین العابدین سرہندی، ۱۰۷۴ھ کو سرہند میں پیدا ہوئے اور علم و ارشاد کی گود میں تربیت پائی۔ شیخ حجت اللہ نقشبندی سرہندی سے کسبِ علم اور اخذِ طریقت کیا۔ طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے، یہاں تک کہ فقہ و اصول اور تصوف میں ماہرِ کامل ہوئے، بہت سے فضائلِ باطنی اور کمالاتِ ظاہری سے دامن بھرا، اور پھر تدریس و ارشاد میں سرگرمِ عمل ہوئے۔ اس اثنا میں متعدد علما و فضلا نے ان سے استفادہ کیا۔

اس جلیل القدر عالمِ دین اور ماہرِ معقولات و منقولات نے ماہِ رمضان المبارک کے آخری دن ۱۱۲۸ھ کو سرہند میں رحلت فرمائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر چوّن (۵۴) برس تھی۔[1]

س

۷۹۔ سیّد سعد الدین بلگرامی

سید سعد الدین بن سید جمال الدین بن سید مربی بن سید عبد النبی حسینی واسطی بلگرامی بارھویں صدی ہجری کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ مرکزِ علم و عرفان بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ سید نعمت اللہ بلگرامی (متوفی ۵ رمضان المبارک ۱۱۰۴ھ) سے علم حاصل کیا۔ پھر تلاشِ معاش کی غرض سے امرا و ملوک کی ملازمت کے لیے بلگرام

---

[1] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۹۲

سے نکلے اور عرصے تک اپنے مولد و مسکن سے باہر رہے۔ بعد ازاں وطن واپس لوٹے اور لوگوں سے منقطع ہو کر افادۂ طلبا اور مطالعۂ کتب میں مصروف ہو گئے۔[۱]

۸۰۔ مولانا سعد الدین کشمیری

مولانا سعد الدین بن مولانا امان اللہ شہید بن خیر الدین کشمیری، ۱۱۲۷ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد مکرم مولانا امان اللہ شہید (۱۱۵۱ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس کو اپنا مشغلہ ٹھہرایا اور ارض کشمیر کے کبار فقہائے حنفیہ میں گردانے گئے۔ عالم شباب ہی میں علمی دنیا میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی، اور لوگ دُور دُور سے سفر کر کے ان کی خدمت میں آنے لگے تھے۔ بہترین مناظر بھی تھے، اکثر مباحث میں حریف پر بازی لے جاتے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا اور بے شمار لوگ فیض یاب ہوئے۔

مولانا سعد الدین کشمیری نے اپنے والد گرامی قدر مولانا امان اللہ کی شہادت کے اڑتیس ۳۸ دن بعد عین عالم جوانی میں صرف چوبیس برس عمر پا کر ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ کو سفر آخرت اختیار کیا۔[۲]

۸۱۔ سید سعد اللہ سلونی

مولانا سعد اللہ بن سید عبد الشکور حسینی سلونی، مضافات الٰہ آباد کے ایک قصبے "سلون" کے باشندے تھے۔ صغر سنی ہی میں اکتساب علم میں مشغول ہو گئے تھے، اور بہت جلد طلب علم کی منازل طے کر لی تھیں، یہاں تک کہ معقولات و منقولات کے ماہرین اور فحول علمائے ہند میں شمار کیے گئے۔ دور شباب ہی میں مسند تدریس آراستہ

---

[۱] مآثر الکرام، دفتر اول ص ۲۸۵ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۹۵

[۲] حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲، ۴۴۳ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۶ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۹۵، ۹۶

کر لی تھی اور درس وافادہ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ تصوف و طریقت میں بھی کامل تھے اور اس ضمن میں اپنے والدِ بزرگ وار سید عبدالشکور سلونی سے اخذِ فیض کیا تھا۔

کچھ عرصہ تو دیارِ ہند ہی میں ہنگامۂ درس وافادہ بپا کیے رکھا، بعد ازاں حجاز مقدس میں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں بارہ سال اقامت گزیں رہے، حجاز کے علما سے علمِ حدیث حاصل کیا اور پھر ایک مدت تک وہاں پڑھاتے رہے۔ حجاز سے واپس آکر شہر "سورت" کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔

اورنگ زیب عالم گیر سید سعد اللہ ممدوح کی نہایت تکریم کرتا تھا، اس نے ان کو دو گاؤں بطور جاگیر عطا کیے، جن سے انھیں آٹھ لاکھ روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ سلطان اورنگ زیب کے دل میں ان کا اس درجہ احترام تھا کہ وہ ان کو خط لکھتا تو "سیدی وسندی" کے الفاظ سے خطاب کرتا۔

سید سعد اللہ سلونی کی عادت تھی کہ وہ بادشاہ سے حاجت مند لوگوں کی سفارشیں کرتے اور کوشش فرماتے کہ ان کے کام مکمل ہو جائیں۔ بادشاہ ان کی بات مانتا اور اپنے ہاتھ سے خط کا جواب لکھتا۔ ایک مرتبہ انھوں نے بادشاہ سے ایک عامل کی سفارش کی، بادشاہ نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ شیخ کو یہ خط لکھا جائے کہ وہ ظالموں کی سفارش نہ کیا کریں۔ اس کے بعد بادشاہ نے ان کو اپنے ہاتھ سے خط لکھنا بند کر دیا تھا، لیکن وہ برابر بادشاہ کو خط لکھتے رہے۔

سید سعد اللہ اپنے مکتوبات میں سلطان اورنگ زیب کو اہلِ بیت کے ائمہ اثنا عشرہ سے محبت رکھنے کی بھی تاکید فرماتے۔ جب اس سلسلے میں انھوں نے بار بار خط لکھے تو بادشاہ نے حاضرینِ دربار سے کہا کہ سید سعد اللہ سلونی مجھے جو محبت اہلِ بیت کی تلقین فرماتے ہیں، یہ تو بالکل صحیح ہے، لیکن اہلِ سنت کے نزدیک تو امامت بارہ اماموں میں منحصر نہیں ہے۔

سید سعد اللہ متعدد کتابوں کے مصنف اور شارح بھی تھے اور معقولات و منقولات

پر گہری نظر رکھتے تھے - ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں ۔ تعلیقات "حاشیہ قدیمہ و جدیدہ"، منطق میں رسالہ آداب البحث، فقہ میں "یمین الوصول" پر حاشیہ، رسالہ در ثبوتِ مذہب شیعہ، مثنوی معنوی کے چالیس اشعار کی شرح، حاشیہ بر ہدایۃ الحکمۃ، کشف الحق اور تحفۃ الرسول وغیرہ متعدد کتب و رسائل۔ بہرحال یہ اچھے مصنف اور محشی تھے۔

دیارِ ہند کے اس نامور عالم نے ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۸ھ کو شہر سورت میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے[۳]

مولوی فقیر محمد جہلمی نے حدائق الحنفیہ میں سید سعد اللہ کا سنِ وفات ۱۰۳۸ھ لکھا ہے اور انھیں گیارھویں صدی ہجری کے علمائے کرام میں شامل کیا ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ بارھویں صدی ہجری کے علما میں سے تھے اور ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۸ھ کو فوت ہوئے تھے۔

۸۲- شیخ سلطان محمد کرمانی

شیخ سلطان محمد کرمانی دہلوی کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ سید حسن نارنولی دہلوی مشہور بہ "رسول نما" کے شاگرد تھے۔ طویل عرصے تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے اور درس و افادۂ طلبا کو اپنا مشغلہ قرار دیے رکھا[۴] بارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم و فقیہ کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۸۳- سید سلطان مقصود کالپوی

سید سلطان مقصود بن احمد بن محمد حسینی ترمذی شہر کالپی میں پیدا ہوئے اور وہیں

---

[۳] مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۰۷، ۲۰۸ —— تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۳ —— حدائق الحنفیہ ص ۴۰۷ —— نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۹۶، ۹۷

[۴] نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۹۹ بحوالہ بحرِ زخار

پرورش پائی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کے لیے بلگرام کا عزم کیا اور شیخ سعد اللہ بن مرتضیٰ بلگرامی سے کتبِ درسیہ کی تحصیل کی۔ یہاں تک کہ اپنے دور کے عالم و فقیہ اور علمِ نحو اور علومِ عربیہ کے ماہر مانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و افادہ میں سرگرم ہو گئے تھے۔ بعض درسی کتابوں پر مفید تعلیقات و حواشی بھی قلم بند کیے، مثلاً میبذی کی شرح ہدایۃ الحکمۃ پر حاشیہ، دولت آبادی کی شرح قصیدہ بردہ پر حاشیہ۔!

سید سلطان مقصود کالپوی نے ماہِ صفر ۱۱۲۳ھ کو وفات پائی[۵]

۸۴۔ شیخ سیف اللہ بخاری دہلوی

شیخ سیف اللہ ارض ہند کے جلیل القدر محدث اور فقیہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پڑپوتے تھے۔ شیخ ممدوح تک ان کا سلسلۂ نسب اس طرح پہنچتا ہے: سیف اللہ بن نور اللہ بن نور الحق بن عبدالحق محدث بخاری دہلوی۔ حدیث و فقہ کے اجل علما میں سے تھے۔ فارسی میں شمائل ترمذی کی شرح لکھی اور اسے "اشرف الوسائل فی شرح الشمائل" کے نام سے موسوم کیا۔ یہ شرح انھوں نے ۱۰۹۱ھ میں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں لکھی[۶]

ش

۸۵۔ مفتی شرف الدین لکھنوی

مفتی شرف الدین بن محی الدین لکھنوی اعظمی کا مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ کافی عرصے تک اپنے والدِ مکرم مولانا محی الدین لکھنوی سے علم حاصل کرتے رہے، جو اس دور کے

---

۵ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۹۹، ۱۰۰

۶ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۰۲ ——— مرآۃ الحقائق، ص

معروف علما میں سے تھے۔ پھر کورہ تشریف لے گئے، وہاں شیخ لطف اللہ کوروی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے درسی کتابوں کی تحصیل کی۔ بعد ازاں شیخ غلام نقشبند بن عطاء اللہ لکھنوی سے تفسیر بیضاوی پڑھی، اخذِ طریقت بھی انہی سے کیا، یہاں تک کہ علمِ فقہ اور دیگر علوم میں مہارت پیدا کرلی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد، اس دور کے مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر سے قرب حاصل کیا، اس نے ان کے علم وفضل اور تحقیق وکاوش سے متاثر ہو کر چار صدی کے منصب سے نوازا اور بعض خدماتِ شرعیہ سے سرفراز کیا۔ سلطان محمد شاہ کے عہد تک اس منصب پر مامور رہے۔ پھر ان کو تین ہزاری کا منصب عطا کیا گیا۔ سالہا سال تک اس منصب سے مفتخر رہے۔

مفتی شرف الدین لکھنوی متعدد کتابوں کے مصنّف وشارح بھی تھے، جن میں حاشیہ شرح المواقف اور حاشیہ تفسیر بیضاوی شامل ہیں۔

بارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم وفقیہ نے ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۳۳ھ کو منیر میں وفات پائی [1]

۸۶- شیخ شکر اللہ جون پوری

شیخ شکر اللہ بن نور اللہ جنیدی جون پوری، شیخ معروف اشرف کی اولاد سے تھے، جن کا سلسلۂ نسب شیخ جنید ابوالقاسم بغدادی کی طرف منتہی ہوتا ہے۔ شیخ شکر اللہ کے پردادے کا نام اللہ داد تھا، وہ جس گاؤں میں سکونت پذیر تھے، اس کا نام مخدوم پور تھا، شیخ اللہ داد، مخدوم پور سے نقل مکانی کرکے ایک اور گاؤں اللہ داد پور چلے گئے تھے۔ پھر ان کے والدِ گرامی، اللہ داد پور کی سکونت ترک کرکے، ایک دوسرے گاؤں ہمزہ پور میں منتقل ہوگئے تھے، جو صوبہ یوپی میں اعمالِ دیمئو میں واقع تھا۔ ہمزہ پور میں شکر اللہ کی ولادت ہوئی اور وہیں نشوونما پائی۔ بعد ازاں جون پور گئے اور

---

[1] نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۱۰۴، ۱۰۵ بحوالہ باغ وبہار

وہاں رشیدیہ کے مصنّف شیخ محمد رشید عثمانی کے مدرسے میں داخل ہوئے اور کتبِ درسیہ کی تکمیل کی — پھر اپنے والدِ گرامی شیخ نور اللہ کے حکم کے مطابق سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی فوجی چھاؤنی میں چلے گئے جو اس زمانے میں بیجاپور میں واقع تھی۔ بیجاپور سے اورنگ آباد کا قصد کیا، وہاں ان کے چچا محمد زاہد مقیم تھے، ان کے پاس رہنے لگے، محمد زاہد، عالم آدمی تھے، ان سے مشکوٰۃ المصابیح کا درس لیا۔ اورنگ آباد سے پھر جون پور کا عزم فرمایا، جون پور میں شیخ محمد رشید عثمانی کے صاحب زادۂ گرامی شیخ محمد ارشد سے اخذِ طریقت کیا اور پھر تمام عمر انہی کی خدمت میں رہے۔

شیخ شکر اللہ جون پوری، عالم وفقیہ، زاہد و عابد اور صاحبِ حسن اخلاق تھے۔ انھوں نے اپنے شیخ و مرشد محمد ارشد جون پوری کے ملفوظات بھی جمع کیے، جو کافی ضخیم ہیں۔ بعدازاں ان ملفوظات کو ۱۱۳۵ھ میں شیخ محمد ارشد کے پوتے شیخ غلام رشید بن محب اللہ بن محمد ارشد عثمانی (متوفی ۵ صفر ۱۱۶۷ھ) نے مرتب کیا۔ گنج ارشدی کی ترتیب کے وقت اس کے جامع شیخ شکر اللہ جون پوری زندہ تھے۔[۲]

۸۷۔ شیخ شمس الدین جون پوری

شیخ شمس الدین بن ملّا انگنون صدر جہاں جون پوری، عالم وفقیہ تھے، مسلکاً حنفی تھے اور اپنے شہر جون پور کے نامور فقہا میں سے تھے۔

شمس الدین جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی اور اپنے والدِ گرامی ملّا انگنون صدر جہاں جون پوری اور ملا محمد عسکری جون پوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کے والد منصبِ صدر جہانی پر فائز تھے، ان کی وفات کے بعد خود اس منصب پر متمکن ہوئے

صالح، متدین، پاک باز اور عمدہ سیرت کے حامل عالمِ دین تھے۔ کتبۂ الدرس

---

[۲] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۰۶، ۱۰۷، بحوالہ گنجِ ارشدی

والافادہ تھے[۵۳]

۸۸- قاضی شہاب الدین گوپاموی

قاضی شہاب الدین بن محمد حسین بن عبدالسلام بن احمد بن شہاب الدین عمری گوپاموی، علامہ شیخ محب اللہ عمری الہ آبادی کے بھانجے تھے۔ صوبہ یوپی کے شہر گوپامئو میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ شیخ قطب الدین انصاری سہالوی (متوفی ۱۱۰۳ھ) سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ اپنے دور کے عالم وفقیہ اور نامور شیخ قرار پائے۔ مآثر الکرام کی روایت کے مطابق انھوں نے قاضی عبدالرحیم مرادآبادی سے تحصیل کی۔

قاضی شہاب الدین گوپاموی، ہمیشہ سرگرم درس وافادہ رہے۔ منقول ہے کہ ان سے چارسو اصحاب نے استفادہ کیا، جن میں خود ان کے بیٹے قاضی قطب الدین گوپاموی (متوفی ۲۵ رمضان ۱۱۶۰ھ)، مولانا محمد صالح بنگالی، مولانا محمد اشرف شارح سلم العلوم، قاضی محمد مبارک بن محمد دائم عمری گوپاموی وغیرہ حضرات شامل ہیں۔ ان بزرگوں نے دیارِ ہند کے مختلف علاقوں میں درس وتدریس کی مسندیں بچھائیں اور بے شمار علما وطلبا نے ان سے اخذِ علم کیا۔

قاضی ممدوح نے ۱۱۲۰ھ کے بعد وفات پائی[۵۴]

۸۹- قاضی شیخ الاسلام گجراتی

قاضی شیخ الاسلام، عالمِ کبیر، علامہ وقت اور شیخ زماں تھے۔ مشہور فقہائے حنفیہ میں

---

[۵۳] تذکرۃ العلماء۔ ج ۲، ص ۹۷ —— تاریخ شیرازِ ہند جون پور، ص ۴۴۸ —— نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۱۰۷، ۱۰۸ —— تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۷

[۵۴] مآثر الکرام دفتر اوّل، ص ۲۷۸ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۱۰

سے تھے۔ علم وعمل، زہد وتقویٰ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اپنی مثال آپ تھے۔ صدق وامانت اور عفت وصیانت میں ان کا درجہ بہت بلند تھا، معاملہ فہمی، حسنِ اخلاق، اخلاص ومروت اور خوفِ خدا میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ عجز وانکساری اور رجوع الی اللہ میں یگانہ حیثیت کے حامل تھے۔ معقولات ومنقولات کے ماہر تھے، وسعتِ معلومات اور فقاہت میں درجۂ امامت پر فائز تھے، عہدِ عالم گیری کے بلند مرتبت اصحابِ علم وفضل میں شمار کیے جاتے تھے۔ قاضی القضاۃ عبدالوہاب حنفی احمد آبادی گجراتی کے لائق فرزند تھے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ والد کی وفات کے بعد ان کی جائیداد میں سے کوئی شی اپنے پاس نہیں رکھی، بعض چیزیں تو فقرا ومساکین میں بانٹ دیں اور باقی اعزہ واقارب کو دے دیں کہ ممکن ہے اس سے عنداللہ والد کے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

بات یہ ہے کہ ان کے والد قاضی عبدالوہاب احمد آبادی گجراتی، اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں قاضی القضاۃ کے منصبِ علیا پر مامور تھے۔ لیکن مال ودولت جمع کرنے میں محتاط نہ تھے، اس ضمن میں ان کی شہرت بہت خراب تھی اور مشکوک طرزِ عمل کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وفات کے وقت انھوں نے بہت دولت چھوڑی۔ دو لاکھ اشرفیاں اور پانچ لاکھ روپے تو نقد تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے جواہرات اور بہت بڑی جائیداد تھی۔ لیکن یہ سارا مال چوں کہ مشکوک اور مشتبہ تھا، لہٰذا قاضی شیخ الاسلام نے اس میں سے کوئی چیز بھی اپنے پاس نہیں رکھی، سب مال مختلف لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

قاضی القضاۃ عبدالوہاب احمد آبادی کی وفات کے بعد سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ۱۰۸۴ھ میں ان کی جگہ ان کے صاحب زادے قاضی شیخ الاسلام کو قاضی لشکر کے عہدے پر مامور ہونے کا حکم جاری کیا، مگر انھوں نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عالم گیر کو انکار کی اطلاع پہنچی تو اس نے ذاتی طور پر انھیں مجبور کیا کہ وہ ہر صورت میں اس منصب پر فائز ہونے کی منظوری دیں۔ بادشاہ کے اصرار پر شیخ الاسلام نے یہ منصب بڑی بے دلی اور کراہت کے ساتھ قبول کیا۔ پھر جب اس منصب پر

فائز ہوگئے تو عدل و قسط اور انصاف و عدالت میں اپنی تمام مساعی وقف کر دیں۔ اظہارِ حق، شہادتوں کی چھان بین اور تفتیشِ مقدمات میں کوئی کسر کبھی اٹھا نہ رکھی، جو مقدمہ بھی ان کے سامنے پیش ہوا، پوری دیانت داری سے اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی اور اصل معاملے کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کیا۔ اس کے ہر گوشے کی تحقیق کی اور گواہوں کے صدق و کذب کے بارے میں پورا اطمینان حاصل کیا۔ کہیں کوئی جھول باقی نہیں رہنے دیا اور اس نتیجے تک پہنچنے کی امکان بھر سعی کی کہ کسی گواہ یا کسی ادنیٰ یا اعلیٰ اہل کار کو مدعی یا مدعیٰ علیہ نے کسی قسم کی رشوت تو نہیں دی، کوئی کسی نوع کے لالچ یا حرص و طمع میں تو نہیں آیا۔ اظہارِ حق اور قولِ صدق میں بادشاہ کی بھی کبھی پروا نہیں کی، اگرچہ بادشاہ کی مخالفت ہی ہوتی ہو اور اس کی طبع نازک پر ان کا اندازِ کلام گراں گزرتا ہو۔

شاہ نواز قاضی شیخ الاسلام کی بادشاہ کے سامنے حق گوئی کی وضاحت کرتے ہوئے مآثر الامرا میں لکھتا ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے جب دکن پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور وہاں کے حکمرانوں کو زیر کرنے کی ٹھانی تو قاضی شیخ الاسلام سے فتویٰ پوچھا، چوں کہ دکن کے حکمران بھی مسلمان تھے، لہٰذا شیخ الاسلام نے بادشاہ کی مخالفت کی اور فتویٰ دیا کہ اسے دکن پر فوج کشی نہیں کرنی چاہیے۔

شاہ نواز یہ بھی لکھتا ہے کہ قاضی شیخ الاسلام نے کافی مدت تک خدمتِ قضا پر متمکن رہنے کے بعد اس سے علیٰحدگی اختیار کر لی تھی، حالاں کہ بادشاہ عالم گیر مُصر تھا کہ وہ ہر حال میں اس منصب پر فائز رہیں۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ منصبِ قضا چھوڑ دینے کے بعد وہ حجاز تشریف لے گئے تھے، وہاں حج و زیارت کی سعادت حاصل کی، پھر ہندوستان واپس لوٹے تو احمد آباد میں اقامت گزین ہوگئے۔ جب عالم گیر کو اُن کی معاودتِ ہند اور سکونتِ احمد آباد کا پتا چلا تو ان پر بڑی عنایات کیں اور ہدایا و عطایا سے نوازا۔ بادشاہ نے ان کو پہلے قضا اور پھر صدارت کی پیش کش کی، لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے معذرت کر دی۔ جب بادشاہ نے بہت زیادہ اصرار کیا تو بادلِ

نخواستہ قبولِ منصب کی غرض سے اپنے شہر (احمد آباد) سے روانہ ہوئے، لیکن دورانِ سفر ہی میں انتقال کر گئے۔ بادشاہ کو ان کی وفات کا علم ہوا تو نہایت حزن و ملال کا اظہار کیا۔

درباری وقائع نگار محمد ساقی مستعد خاں نے اپنی تصنیف مآثر عالم گیری میں قاضی شیخ الاسلام کا کئی مقام پر ذکر کیا ہے اور ہر جگہ نہایت احترام سے ان کا نام لیا ہے۔ مثلاً ۱۰۸۶ھ کے واقعات کے ضمن میں جو اورنگ زیب عالم گیر کا انیسواں سالِ جلوس اور قاضی عبدالوہاب کا سنِ وفات ہے، مستعد خاں لکھتا ہے:

قاضی عدالت ملا عبدالوہاب نے ۱۵ رمضان (۱۰۸۶ھ) کو دارالسلطنت میں وفات پائی۔ جہاں پناہ (بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر) نے قاضی مذکور کے بیٹے شیخ الاسلام کو جو دارالسلطنت کے قاضی تھے، اپنے حضور میں طلب فرما کر ان کے باپ کی جگہ قاضیِ لشکر مقرر فرمایا۔[۵۵]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والد کی وفات کے وقت قاضی شیخ الاسلام، دارالسلطنت دہلی کے منصبِ قضا پر متعین تھے۔

دوسری جگہ جلوسِ عالم گیری کے ستائیسویں[۲۷] سال (ماہ ذی الحجہ ۱۰۹۴ھ) کے واقعات میں یہی وقائع نگار رقم طراز ہے:

قاضی عبدالوہاب کے بیٹے شیخ الاسلام، اپنی ذاتی استعداد اور فطرتِ سلیم کے تقاضے کے تحت جذبہ محبتِ الٰہی سے بے قرار ہوئے اور دنیا سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ہر چند بادشاہ جہاں پناہ نے ان پر عنایت فرمائیں اور ترکِ خدمت سے منع کیا، اور عہدۂ قضا کو جو انہی جیسے پاک باز نفوس کو زیب دیتا ہے، انہی کی ذات سے وابستہ رکھنا چاہا، لیکن قاضی شیخ الاسلام نے اپنے ارادوں میں کسی طرح تبدیلی نہ کی۔ بادشاہ نے مجبور ہو کر خود قاضی ممدوح کی رائے سے سید ابوسعید کو جو عالی نسب سید اور قاضی عبدالوہاب کے داماد (اور قاضی شیخ الاسلام کے بہنوئی) تھے، عہدۂ قضا مرحمت فرمایا۔[۵۶]

---

۵۵ مآثر عالم گیری، ص ۱۶۴

۵۶ ایضاً، ص ۲۵۵

ایک اور مقام پر عالم گیر کے بیالیسویں[۴۲] سالِ جلوس اور ۱۱۰۹ھ کے واقعات کے سلسلے میں محمد ساقی مستعد خاں، حسبِ ذیل الفاظ میں قاضی شیخ الاسلام کا ذکر کرتا ہے:

محبت، خدا دوستی اور شفقتِ بندہ نوازی کی وجہ سے بادشاہ نے شیخ الاسلام کے نام ایک اشتیاق آمیز فرمان ان کے برادر نور الحق کے ہاتھ ارسال فرمایا۔ فرمان کا مضمون یہ تھا کہ آپ شغلِ قضا سے مستعفی اور سفرِ حجاز سے مراجعت کے بعد ایک مرتبہ بھی حضور میں نہیں آئے۔ اگر اس طرف توجہ مبذول کریں تو مناسب ہوگا۔ شیخ الاسلام، اس وقت احمد آباد میں مقیم تھے۔ بادشاہ کا منشا یہ تھا کہ اگر شیخ مذکور حضور میں آجائیں اور صدارت کی خدمت قبول کر لیں تو یہ عہدۂ جلیلہ ان کو تفویض فرمایا جائے۔ لیکن اس کے برعکس شیخ الاسلام کا ارادہ دوبارہ طوافِ کعبہ کا احرام باندھنے کا تھا۔ اتنے میں دفعتاً مرض نے شدت اختیار کی اور مرحوم کو سفرِ آخرت طے کرنا پڑا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے[۵۷]

بہرحال قاضی شیخ الاسلام عہدِ عالم گیری کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ انھوں نے ۱۱۰۹ھ کو وفات پائی اور دیگر لوگوں کے علاوہ بادشاہ نے بھی ان کی وفات پر انتہائی حزن و تاسف کا اظہار کیا[۵۸]

ص

۹۰- شیخ صبغت اللہ سرہندی

شیخ صبغت اللہ سرہندی، حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور حضرت شیخ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے تھے۔ ۱۰۳۲ھ کو پیدا

---

۵۷ ایضاً، ص ۳۶۹

۵۸ منتخب اللباب، ج ۲، ص ۱۴۸، ۱۵۴ ــــ مآثر عالم گیری، ص ۱۴۸، ۲۱۰، ۲۲۵، ۲۳۹، ۲۵۱، ۳۳۹، ۳۹۳ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۱۱، ۱۱۲

ہوئے اور علم و معرفت کی گود میں پرورش پائی۔ شیخ محمد معصوم نے اپنے اس نیک بخت بیٹے کے چہرے پر تقویٰ و صالحیت کے آثار دیکھ کر اور ان کے ورع و عبادت سے متاثر ہو کر، انھیں مرتبۂ قطب پر فائز ہونے کی بشارت دی تھی۔

شیخ صبغت اللہ سرہندی اپنے دور کے نامور عالم و فقیہ تھے۔ ان کے شب و روز لوگوں کو رشد و ہدایت اور طریقِ حق کی دعوت دینے میں صرف ہوتے تھے۔ ہر وقت ترویج شریعت اور ترغیب سنت میں سرگرمِ عمل رہتے، اسی بنا پر لوگوں نے ان کو مروّج الشریعت کا لقب دے رکھا تھا، جس کا مطلب ہے، شریعتِ حقہ کے احکام کو رواج دینے والا۔

برصغیر پاک و ہند میں حضرت مجدد الف ثانی کا خاندان علم و فضل، زہد و تقویٰ اور تصوف و طریقت میں خاص شہرت کا حامل ہے۔ جو خدماتِ دینیہ اس خاندان کے بزرگوں نے انجام دیں، وہ ارضِ ہند کے کسی اور خاندان کے حصے میں نہیں آئیں۔ شیخ صبغت اللہ سرہندی کا مرتبہ بھی اس سلسلے میں بڑا بلند ہے۔

خطۂ سرہند کے اس رفیع المنزلت عالم و فقیہ اور خانوادۂ مجددیہ کے بلند مرتبت مردِ صالح نے ۹ ربیع الاول ۱۱۲۱ھ کو وفات پائی[1]

ض

۹۱۔ سید ضیاء اللہ بلگرامی

سید ضیاء اللہ بن خان محمد بن عبدالغفار بن تاج الدین حسینی واسطی بلگرامی، علمائے مشاہیر میں سے تھے، اپنے عہد کے شیخ، عالم اور نامور فقیہ تھے۔ مولد و منشا بلگرام ہے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کا جذبہ بیدار ہوا۔ سب سے پہلے تجوید کے ساتھ قرآنِ مجید حفظ کیا۔ اس زمانے میں بلگرام کو علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔

---

[1] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۱۳۔ بحوالہ تذکرۃ الانساب از قاضی ثناء اللہ

اور مشہور علمائے کرام کا سلسلۂ درس جاری تھا، سید ضیاء اللہ نے حفظِ قرآن کے بعد ان علما سے مختلف درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر مزید تحصیل کی غرض سے دیگر مقامات کا قصد کیا اور مروجہ علوم کی بعض کتابوں کا درس لیا۔ کچھ عرصے بعد کالپی گئے۔ وہاں شیخ احمد بن محمد حسینی ترمذی کالپوی کی مسندِ طریقت و تصوف آراستہ تھی، ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تصوف کی بعض کتابیں باقاعدہ درساً درساً پڑھیں۔ بعد ازاں علومِ ظاہری و باطنی پر عبور حاصل کر کے اپنے شہر بلگرام واپس آئے

سید ضیا اللہ بلگرامی گوناگوں اوصاف کے مالک تھے۔ معقولات و منقولات میں مہارت کے ساتھ ساتھ انشاء و مراسلہ نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، عربی اور فارسی کی نظم و نثر میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔

بلگرام کے اس ہمہ اوصاف عالم و فقیہ نے منگل کے روز ۲۵ شعبان ۱۱۰۴ھ کو اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کا سفر اختیار کیا۔[۱]

ط

۹۲- سیّد طفیل محمد اترولوی بلگرامی

سید طفیل محمد بن سید شکر اللہ حسینی اترولوی ثم بلگرامی، معقول و منقول کے مجمع البحرین، فقہ و اصول کے ماہر اور تفسیر و حدیث کے عالم تھے۔ ۷ ذی الحجہ ۱۰۷۳ھ کو اترولی کے ایک سید خاندان میں پیدا ہوئے۔ اترولی ایک گاؤں کا نام ہے جو اس زمانے میں عمالِ آگرہ میں واقع تھا۔ ان کے والد سید شکر اللہ حسینی بڑے نیک بزرگ تھے، انھوں نے سعادت مند بیٹے کو اوائلِ عمر ہی میں ایک معروف فاضل سید سعد اللہ حسینی بلگرامی

---

[۱] مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۳۰ تا ۲۳۳ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۱۸ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۸ — سرو آزاد، ص ۲۵۰، ۲۵۱ — تذکرہ بے نظیر، ص ۸۴۔ مفتاح التواریخ، ص ۲۸۷، ۲۸۸

(متوفی ۱۷ شوال ۱۱۱۹ھ) کے حلقۂ ارادت میں داخل کر دیا تھا۔ ابھی صغر سن ہی تھے کہ ان کے عم محترم سید احسن اللہ انھیں اترولی سے دار السلطنت دہلی لے گئے تھے۔ علم صرف کی ابتدائی کتاب میزان الصرف کا ایک سبق تبرکاً سید حسن رسول نما نارنولی (متوفی ۲۲ شعبان ۱۱۰۳ھ) سے پڑھا اور شرح جامی تک کتابیں اپنے عم مکرم سید احسن اللہ حسینی بلگرامی سے پڑھیں۔ پندرہ سال کی عمر میں ۱۱۰۸ھ کے لگ بھگ کسبِ علم کی غرض سے اترولی سے بلگرام گئے۔ وہاں بعض کتبِ درسیہ کا درس سید مربی بلگرامی (متوفی ۶ شعبان ۱۱۱۷ھ) اور سید سعد اللہ بلگرامی (متوفی ۱۷ شوال ۱۱۱۹ھ) سے لیا اور بعض کے لیے قاضی علیم اللہ لکھنوی (متوفی ۱۱۱۵ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مطولات سید قطب الدین شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ) سے پڑھیں۔ حدیث کی تحصیل سید مبارک بن فخر الدین حسینی واسطی بلگرامی (متوفی ۲۰ ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ) سے کی۔ بعد ازاں مستقل طور پر بلگرام ہی میں سکونت اختیار کر لی اور اپنے آپ کو درس و افادۂ طلبا کے لیے وقف کر دیا۔

سید طفیل محمد چوں کہ اترولی میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے اترولوی کہلائے اور پھر وہاں سے بلگرام میں نقل مکانی کر گئے تھے، لہٰذا بلگرامی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ بڑے نیک اور متقی عالمِ دین تھے۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی دل میں مال و دولت جمع کرنے کی حرص پیدا نہیں ہوئی، نہ مکان بنایا اور نہ شادی کی۔ ہمیشہ دنیا سے دور اور اس کے ساز و سامان سے نفور رہے۔ خلقِ کثیر نے ان سے اخذِ علم کیا۔ ان کے تلامذہ کی بہت بڑی جماعت میں سید غلام علی آزاد بلگرامی بھی شامل ہیں۔

سید طفیل محمد بلگرامی کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ یہ دو شعر انہی کے ہیں:

قلنا له عينك النجلاء باخلة ... فيها الرنو الى العشاق مفقود

فقال العين قد جاءت مؤنثة ... وفي الاناث طريق البخل محمود

سید ممدوح نے ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ کو بلگرام میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے۔[۱]

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے: مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۱۳۳ تا ۱۴۰ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۸، ۹۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۸، ۱۱۹ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲ — سبحۃ المرجان، ص ۹۰ تا ۹۳ — ابجد العلوم، ص ۹۱۰ — سرو آزاد، ص ۲۵۱، ۲۵۲ — تقصار، ص ۲۲۲ — مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، ص ۱۴ تا ۱۸

۹۳۔ سید طیّب بلگرامی

سید طیّب بن نعمت اللہ بن طیّب بن عبد الواحد حسینی واسطی بلگرامی، بارھویں صدی ہجری میں بلگرام کے شیخ وفاضل تھے اور ان کا شمار اس دور کے بہترین علما اور اللہ کے متدین بندوں میں ہوتا تھا۔

سید طیّب حسینی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ سید عبد الہادی حسینی بلگرامی (۲۰ ربیع الاوّل ۱۱۳۳ھ) سے اخذِ علم کیا۔ حدیث کے لیے سید مبارک بن فخر الدین حسینی واسطی (متوفی ۲۰ ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ سید طیب بلگرامی کے والدِ مکرم سید نعمت اللہ حسینی بلگرامی (متوفی ۵ رمضان ۱۱۴۰ھ) بہت بڑے صاحبِ فضل اور عالمِ دین تھے، کتبِ درسیہ میں ماہرِ کامل اور علومِ حکمیہ میں اپنے تمام اقران ومعاصرین سے فائق تھے۔ بحث ومناظرہ میں نہایت تیز تھے، مولانا قطب الدین شہید سہالوی (شہادت ۱۱۰۳ھ) کے شاگرد تھے، اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد بلگرام میں درس وافادۂ طلبا میں مشغول ہوگئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد اس لائق بیٹے (سید طیب حسینی بلگرامی) نے ان کی مسند سنبھالی اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

سید طیّب متعدد خصوصیات کے مالک تھے، وہ صحیح معنوں میں اپنے آبا واجداد کے علوم ومعارف کے وارث تھے اور اپنے دور کے قابلِ ذکر عالمِ دین تھے، ان کا خط بڑا عمدہ تھا اور نہایت زود نویس تھے۔ انھوں نے کئی ضخیم درسی اور غیر درسی کتابوں کی کتابت کی۔ مثلاً شرح جامی کی شروع سے آخر تک صرف ایک ہفتے میں کتابت کردی تھی۔ اسی طرح محدث یمن اور دیارِ عرب کے مشہور بزرگ شیخ یحییٰ بن ابوبکر العامری الیمنی الشافعی (۸۱۶ — ۸۹۳ھ) کی کتاب "بہجۃ المحافل" جو سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر ہے اور بڑی ضخیم کتاب ہے، تیئیس روز میں لکھ ڈالی تھی۔ ان کا کتب خانہ بہت بڑا اور شاندار تھا جو نایاب اور عمدہ کتابوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے بیشتر کتابیں ان کی خود اپنی کتابت کردہ

تھیں - وفات کے بعد یہ کتب خانہ ان کی ایک عظیم یادگار تھی - عالم جوانی میں کچھ دن ملازمت بھی کی مگر وظائف و اوراد اور مطالعہ کتب میں بدستور مشغول رہے - والد کی وفات کے وقت احمد آباد (گجرات) میں ملازم تھے، ان کی وفات کی خبر سنتے ہی سلسلہ ملازمت ترک کر کے فوراً بلگرام پہنچ گئے اور سجادۂ اسلاف پر متمکن ہو گئے -

سید طیّب بلگرامی کچھ کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں ایک کتاب سیرت میں ہے، جسے "الجامع الطیبی" کے نام سے موسوم کیا - ایک کتاب، مسائل فقہ کے بارے میں تصنیف کی -

بلگرام کے اس متعدد اوصاف کے حامل، صاحبِ علم و فضل نے چہار شنبہ کے روز ۷ رجب ۱۱۵۲ھ کو بلگرام میں وفات پائی اور اپنے جدّ امجد سید عبدالواحد حسینی بلگرامی کے قریب دفن کیے گئے[۵]

ظ

۹۴ - سیّد ظریف حسینی عظیم آبادی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں ایک شہر برصغیر کی قدیم تاریخ میں "عظیم آباد" کے نام سے معروف تھا - یہ شہر اس وقت "پٹنہ" کے نام سے موسوم ہے اور صوبہ بہار کا دارالخلافہ ہے - یہ شہر کسی زمانے میں علم و فضل کا منبع، تصوف و طریقت کا مرکز اور تحقیق و تدقیق کا گہوارہ تھا - اس میں بے شمار علما پیدا ہوئے اور لاتعداد اصحابِ فضل نے درس و تدریس کی شمع روشن کی - ان میں بارھویں صدی ہجری کے ایک عالی قدر عالم سید ظریف حسینی عظیم آبادی بھی تھے، جو شیخ وقت اور علامہ عصر تھے - فقہ، اصول اور کلام میں انھیں کامل دسترس حاصل تھی - شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۱۱۶۱ھ) کے ارشد تلامذہ میں سے تھے -

---

۵ مآثر الکرام، ص ۹۴ تا ۵۱ ——— تقصار، ص ۲۰۱ ——— نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۱۱۹، ۱۲۰

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سید ظریف عظیم آبادی، اپنے شہر عظیم آباد میں سرگرمِ تدریس وافادہ ہوئے اور مدرسہ سیف خاں میں مسندِ درس آراستہ کی۔ اپنے استاذِ گرامی شیخ نظام الدین انصاری سہالوی سے انھیں شدید محبت وعقیدت اور قلبی تعلق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کی موت کی خبر پہنچی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور شدتِ غم سے روتے روتے آنکھیں ضائع ہوگئیں، لیکن بعد میں پتا چلا کہ شیخ زندہ ہیں اور انتقال کی خبر غلط تھی، لیکن اس اثنا میں لائق شاگرد کی بصارت ختم ہوچکی تھی۔

منقول ہے کہ سیّد ظریف حسینی متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے، مگر ان کی تصنیفات کا علم نہیں ہوسکا۔ ان سے علما وطلبا کی بہت بڑی تعداد نے استفادہ کیا۔[1]

ع

۹۵۔ شیخ عبدالباسط سندھی

شیخ عبدالباسط سندھی کے والدِ بزرگوار کا اسمِ گرامی مخدوم علی احمد قُمری تھا۔ وہ بڑے خوش آواز اور خوش الحان تھے، اسی لیے "قُمری" کے عرف سے معروف تھے۔ صاحب کمال اور صاحبِ فضیلت شخص تھے۔ ان کے بیٹے شیخ عبدالباسط بھی اپنے زمانے اور علاقے کے جیّد عالم تھے اور فقہ واصول اور علومِ عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ عالم گیر کے دربار میں گئے اور تاریخ فتح قلعہ اس آیتِ کریمہ سے نکالی: هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ [2] قدرشناس بادشاہ نے اس کے انعام میں اور اُن کے کمالاتِ علمی کے پیشِ نظر انھیں ٹھٹھہ کے منصبِ قضا کے ساتھ "صدری" کا اعزاز

---

[1] نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۱۲۱ بحوالہ رسالہ قطبیہ

[2] یہ سورہ ص کی آیت نمبر ۳۹ ہے۔ ترجمہ یہ ہے: یہ ہماری عطا ہے، سو چاہے تو بخش دے اور چاہے تو اپنے پاس بغیر حساب کے رکھ لے۔

بھی عطا کیا، جس پر عرصے تک فائز رہے۔ آخری دنوں میں حجاز تشریف لے گئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کر کے واپس ٹھٹھہ آئے۔ ضعف پیری اور سن رسیدگی کے باوجود طلبا کو درس دینے میں مشغول رہتے ؎۲

۹۶- سیّد عبدالجلیل حسینی بلگرامی

سیّد عبدالجلیل بن سید امیر احمد حسینی واسطی بلگرامی، علامۂ وقت، شیخ دوراں، فاضلِ عصر، صاحبِ مفاخر بیضا اور حامل مآثر غرا تھے۔ مشہور مورخ اور تذکرہ نگار میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نانا تھے، حدیث، لغت اور سیرت میں ان کے استاذ بھی تھے۔ ۱۳ شوال ۱۰۷۱ھ کو بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ کچھ بڑے ہوئے تو سید سعد اللہ بلگرامی (متوفی ۱۷ شوال ۱۱۱۹ھ) سے مختصرات پڑھیں۔ بعد ازاں مزید حصولِ علم کے لیے علاقہ اودھ کے مختلف قصبات و بلاد کا سفر کیا اور مشاہیر اساتذۂ عصر سے فیض یاب ہوئے۔ پھر اس عہد کے معروف بزرگ شیخ غلام نقشبند لکھنوی (متوفی ۱۱۲۶ھ) کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے خوب استفاضہ کیا۔ حدیث کی سند سید مبارک بن فخر الدین حسینی بلگرامی (متوفی ۲۰ ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ) سے حاصل کی۔ اس کے بعد عازمِ دکن ہوئے۔ ان دنوں سلطان اورنگ زیب عالم گیر دکن ہی میں فروکش تھا، اس سے ملاقات کی تو اس نے ۱۱۱۲ھ میں بخشیگری کا منصب عطا کیا اور ساتھ ہی صوبہ پنجاب کے شہر گجرات کا سرکاری وقائع نگار مقرر فرمایا۔ پھر ان کی خدمات ۱۱۱۶ھ کو علاقہ سندھ میں بھکر اور سیوستان میں منتقل کر دیں۔ اس خدمت پر ۱۱۳۰ھ تک مامور رہے۔ پھر اس سے معزول ہو گئے اور فرخ سیر کے عہد میں ان کی جگہ ان کے بیٹے سید محمد (متوفی ۱۱۸۵ھ) کو اس منصب سے سرفراز کیا گیا۔

ترکِ منصب کے بعد سید عبدالجلیل بلگرامی، دہلی میں مقیم ہو گئے تھے۔ تفسیر، حدیث،

؎۲ تحفۃ الکرام، ص ۶۸۴ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۳۶

فقہ، اسمار الرجال اور تاریخ کے بہت بڑے عالم تھے۔ معانی، بیان، بدیع اور تاریخ وسیرت میں بھی کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی کے بہترین شاعر تھے۔ معقولات و منقولات کے جامع اور بہت سی زبانوں کے ماہر تھے۔ لغت میں اس درجہ عبور تھا کہ گویا اس کے معدن اور مصدر تھے۔ اس کے تمام گوشوں، اس کی تمام تر باریکیوں اور نزاکتوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ اس دور میں معرفتِ لغت میں غالباً ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ سب سے منفرد اور یگانہ تھے۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے ماہر تھے۔ ان زبانوں میں فصاحت سے بات کرتے اور عمدہ شعر کہتے۔ عربی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یا صاح لا تلم المتیّم فی الهوی ھو عاشق لا ینثنی عن خلّہ
یأبی الدواء سقامہ کعیونہ فخلی الطبیعۃ یا معالج خلّہ

اے صاحب! تو عاشق کو اس کی محبت میں ملامت نہ کر، وہ عاشق ہے اور اپنی عادت سے گریز نہیں کرے گا۔

اس کی بیمار آنکھیں دوا کو قبول نہیں کرتیں۔ سوائے معالج! تو اس کو فطرت کے فیصلے پر چھوڑ دے۔

دو شعر اور ملاحظہ ہوں:

حبیبی قوس حاجبہ کنون وصاد بدین مقلۃ شکل عینہ
لعمری انہ نص جلی علی ان الرمایۃ حق عینہ

جو میرا دوست ہے، اس کی بھوؤں کی کمان نون اور صاد کی طرح ہے۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے موٹے ہیں۔

میری زندگی کی قسم، یہ بات بالکل واضح ہے کہ تیراندازی اس کی آنکھوں کا حق ہے۔

ایک مرتبہ خواجہ عبدالباسط دہلوی سے زمخشری کی "ربیع الابرار"، طلب کی تو یہ شعر لکھ بھیجے:

یا باسط الایدی ایا غیث الندی حیرت مزرعۃ العطاء مریعا
لا غرو ان اطلب ربیعا منکم فالغیث یعطی العالمین ربیعا

اے کشادہ حال، اے مددگار، تو عطا و بخشش کی خوش گوار کھیتی بن گیا ہے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ میں تم سے ربیع طلب کر رہا ہوں، اور ابر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ایک دنیا کو ربیع یعنی موسمِ بہار سے نوازتا ہے۔

ایک شعر یہ بھی پڑھیے:

هو البدر الا انه البحر زاخرا سوی انه الفرض تمام لکنه الوبل

وہ چودھویں کا چاند ہے، مگر وہ ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بھی ہے، علاوہ ازیں وہ شیر بھی ہے، اور برسنے والا بادل بھی۔

ایک شعر اور دیکھیے:

هو القطب الا انه البدر طالعا سوی انه المریخ لکنه السعد

وہ قطب ہے، مگر وہ چودھویں کا چاند بھی ہے جو نمودار ہوا، اور ساتھ ہی وہ اگرچہ مریخ بھی ہے، تاہم سعد ہے۔

زبان پر قدرت کا یہ عالم تھا کہ ۱۱۱۱ھ کو اورنگ زیب عالم گیر نے قلعہ ستارہ فتح کیا تو ایک رات میں عربی اور فارسی میں گیارہ قطعے اس فتح کی تاریخ میں نظم کیے اور رسالے کی شکل میں مرتب کر کے اسے "گل زار فتح شاہ ہند" اور "طوطی نامہ فیروزی شاہ عالم گیر" کے نام سے موسوم کیا۔ یہ قطعے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے اور الطافِ خسروانہ سے سرفراز ہوئے۔ اس میں لطف کی بات یہ ہے کہ رسالے کے ان دونوں ناموں سے قلعہ ستارہ کے فتح کی تاریخ نکلتی ہے۔

اس عظیم المرتبت عالم نے ہفتے کی رات، ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ کو دہلی میں وفات پائی اور ان کی وصیت کے مطابق میت کو بلگرام لے جا کر جمعہ کے روز، نمازِ عصر کے اوّل وقت میں ۶ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۰ھ کو ان کے والدِ گرامی میر سید احمد بلگرامی کے قریب دفن کیا گیا۔[۵۳]

---

۵۳ حیاتِ جلیل (یعقوب احمد صمدانی) — سبحۃ المرجان، ص ۷۹ تا ۸۴ — مآثر الکرام۔ دفتر اوّل، ص ۲۴۵ تا ۲۶۶ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۳۹، ۱۴۰ — ابجد العلوم، ص ۹۰۷، ۹۰۸ — قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب، ص ۲۰۵، ۲۰۶ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۷ — خزانہ عامرہ، ص ۳۵۲ تا ۳۶۱ — مفتاح التواریخ، ص ۳۱۰، ۳۱۱ — تذکرۂ بے نظیر، ص ۹۰ تا ۹۵ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۸، ۱۰۹ — سروِ آزاد، ص ۲۵۳ تا ۲۸۶۔

۹۷-سید عبد الحکیم لاہوری

سید عبد الحکیم کا نسب نامہ یہ ہے: عبد الحکیم بن بایزید بن نظام الدین بن محمد بن مبارک حسنی قادری لاہوری، معروف رجالِ فضل وصلاح اور مشہور مشائخ میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک منتہی ہوتا ہے — ۱۰۳۱ھ کو لاہور میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں تربیت پائی۔ جیّد عالمِ دین، فقیہِ صالح، متقی ومتدین، متواضع، متحمل مزاج، حلیم الطبع اور بڑے منکسر تھے — ۱۱۰۸ھ کو لاہور میں وفات پائی[۵۴]

۹۸-شاہ عبد الرحیم دہلوی

حضرت شاہ عبد الرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، بارھویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے عالمِ کبیر، فقیہِ نامدار، شیخ جلیل اور عارف باللہ تھے۔ مشائخ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے، نسباً فاروقی تھے، شاہ وجیہ الدین عمری دہلوی کے لائق بیٹے اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے والدِ گرامی تھے۔

شاہ عبد الرحیم دہلوی کے حالات بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر ان کے خاندان اور آبا و اجداد میں سے بعض بزرگوں کے حالات و کوائف بھی درج کر دیے جائیں تاکہ یہ پتا چل سکے کہ خاندانِ ولی اللّٰہی علم وفضل اور تقویٰ وللّٰہیت میں ابتدا ہی سے کس اونچے درجے کا مالک تھا۔

مفتی شمس الدین

شاہ عبد الرحیم دہلوی کا خاندان، برصغیر پاک وہند کا مشہور ترین علمی خاندان ہے۔ فضل وصلاح، علم وعرفان، عمل وکردار، جہاد فی سبیل اللہ، تصنیف وتالیف، درس وتدریس اور تحریر وتقریر میں ارضِ ہند کا کوئی خاندان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے

---

[۵۴] خزینۃ الاصفیا، ص ۱۷۱، ۱۷۲ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۴۰، ۱۴۱

تمام افراد علمی جدوجہد، عمل و عزم، دعوت وارشاد، تبلیغ واشاعتِ دین، ہمت وحوصلہ، عبادت وریاضت، ورع وتقویٰ اور تدین وصالحیت کے ارفع اوصاف سے متصف تھے۔

بدعات و محدثات کی بیخ کنی اور توحید ورسالت کی نشر وترویج میں جو خدمات اس خاندان کے علمائے عالی مقام نے انجام دیں، اس میں کوئی اس کا حریف نہیں۔

اس خانوادۂ بلند مرتبت کے پہلے بزرگ جو ارضِ ہند میں وارد ہوئے، مفتی شمس الدین تھے، انھوں نے مشرقی پنجاب کے ایک شہر رہتک میں سکونت اختیار کی۔ اس نواح میں وہ اسلام کے بہت بڑے مبلغ اور داعی تھے۔ منقول ہے کہ وہ اصلاً عربی النسل تھے اور ہر طبقۂ فکر کے لوگوں میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علومِ مروجہ میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ نیکی اور اتقا میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

مفتی کمال الدین

مفتی شمس الدین کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مفتی کمال الدین مسندِ افتا پر متمکن ہوئے۔ وہ بھی باپ کی طرح نیک اور متقی تھے، عالم وفاضل، متبع کتاب وسنت اور حامی دینِ متین تھے، دقیق النظر، بلند فکر اور روشن خیال تھے، ریاضت ومجاہدہ کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت تحقیقِ مسائل اور مطالعۂ کتب میں صرف ہوتا۔ اس درجہ دینی کمالات کے مالک تھے کہ تھوڑے ہی عرصے میں اہلِ علم اور اصحابِ فضل کے حلقوں میں مقبول ومشہور ہو گئے۔ اپنے بلند مرتبت باپ کے صحیح جانشین تھے اور اللہ نے ان کو ہر قسم کی خوبیوں سے نوازا تھا۔

مفتی قطب الدین

مفتی کمال الدین کا انتقال ہوا تو ان کے بعد ان کے لائق اور ہونہار فرزند مفتی قطب الدین کو منصبِ افتا تفویض کیا گیا۔ ان کے حالاتِ زندگی کا پتا نہیں چل سکا، تاہم اتنا معلوم ہے کہ وہ بھی اس خاندانِ عالی قدر کی ایک ممتاز شخصیت تھے اور دعوت وارشاد اور تبلیغ واشاعتِ دین میں خاص شہرت کے حامل تھے۔

شیخ عبدالمالک

مفتی قطب الدین راہیِ ملکِ بقا ہوئے تو ان کے صاحب زادے شیخ عبدالمالک نے اس مسند کو زینت بخشی۔ شیخ عبدالمالک، عاقل و فہیم اور ذہین وطباع تھے۔ روحانیت وللّٰہیّت کے اعلیٰ جوہر سے آراستہ تھے، ان کا دل علم کی روشنی سے تاباں اور فراست و فطانت کی ضو سے درخشاں تھا۔ ان کی فراوانیٔ علم وادراک سے اس خاندان کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی اور اس کی نجابت و شرافت میں بہت اضافہ ہوا۔

شیخ عبدالمالک نے ابتدائی درسی کتابیں اپنے ہی خاندان کے علما سے پڑھی تھیں۔ اس کے بعد مزید حصولِ علم کا شوق دامن گیر ہوا تو فنونِ مروجہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ پھر تحصیل علمِ حدیث کی طرف عنان توجہ مرکوز فرمائی۔ قرآنِ مجید سے ان کو انتہائی لگاؤ تھا۔ زیادہ وقت تلاوتِ قرآن میں صرف کرتے اور لوگوں کو اس کے اسرار و نکات سے آگاہ فرماتے۔ بہترین واعظ اور مبلغ تھے اور ان کے پند و مواعظ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ توحید کی تبلیغ اور بدعات کی تردید احسن طریق سے کرتے۔ کتنے ہی لوگوں نے ان کے پیرایۂ وعظ سے متاثر ہو کر خلافِ شرع رسوم و عوائد کو ترک کیا اور شریعتِ حقہ کو مشعلِ راہ ٹھہرایا۔ افسوس ہے انھوں نے زیادہ عمر نہ پائی اور عین عالمِ جوانی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

قاضی بدھا

شیخ عبدالمالک کی رحلت کے بعد رہتک کے قضا و احتساب اور افتا کا معزز عہدہ ان کے عزیز القدر فرزند قاضی بدھا کے حصے میں آیا۔ قاضی بدھا زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے، البتہ بلندیٔ اخلاق اور تقویٰ و صالحیت میں اپنے دور اور گرد و نواح کی منفرد شخصیّت تھے۔ عقل و دانش اور فکر و فہم میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔

قاضی قاسم

قاضی بدھا کے دو بیٹے تھے۔ ایک قاضی قاسم، دوسرے قاضی منگن۔ بلا شبہ دونوں بھائی تقدس و پاک بازی میں ممتاز تھے اور علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ ور ــــ! باپ

کے منصبِ قضا کے وارث، قاضی قاسم قرار پائے۔

قاضی قادن

قاضی قاسم کے بھی دو صاحب زادے تھے۔ بڑے قاضی قادن اور چھوٹے شیخ کمال الدین۔ دونوں بھائی عالم و فاضل، عقیل و فہیم اور ذہین و فطین تھے۔ مگر باپ کی رحلت کے بعد منصبِ قضا و افتا کے وارث قاضی قادن ہوئے، کیوں کہ وہ شیخ کمال الدین سے عمر میں بڑے تھے۔

شیخ محمود

شیخ قادن نے بھی دو فرزند اپنی یادگار چھوڑے۔ بڑے شیخ محمود اور چھوٹے شیخ آدم۔! قاضی قادن کے ارتحال کے بعد شیخ محمود کو قضا و فتویٰ کا منصب عطا ہوا۔ وہ اس خاندان کے برگزیدہ اور معزز و محترم فرد تھے۔ سب لوگ ان کی بے انتہا تکریم کرتے تھے۔ نہ صرف شہر رہتک میں ان کی علمی شان و شوکت مسلمہ تھی، بلکہ اس کے اطراف و جوانب میں بھی ہر طبقہ و خیال کے لوگوں میں انھیں تعظیم و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن ان کی طبیعت میں انقلاب و تغیر کی کچھ ایسی لہر دوڑی کہ منصبِ قضا ترک کر کے اور اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو کر امورِ حکومت میں شامل ہو گئے اور سپاہیانہ زندگی اختیار کر لی۔

شیخ احمد

شیخ محمود کے صاحب زادۂ گرامی قدر شیخ احمد تھے، جو عالمِ طفولیت ہی میں اپنے وطن —— رہتک —— سے نکل گئے تھے اور اس دور کے ایک عالمِ دین شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم کی خدمت میں چلے گئے تھے۔ شیخ احمد کی تعلیم و تربیت شیخ عبدالغنی کے ہاں ہوئی۔ ان کے تفرس و قابلیت سے متاثر ہو کر شیخ عبدالغنی نے اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی۔ شیخ احمد کافی مدت تک شیخ عبدالغنی کے پاس رہے، اس کے بعد وہ دوبارہ رہتک آ گئے تھے اور قلعہ کے باہر ایک بہت بڑی عمارت تعمیر کرا کے خود بھی اسی میں رہنے لگے تھے اور اپنے تمام اعزہ و اقارب کو بھی اسی میں ٹھہرا لیا تھا۔

بیدار مغز اور عالم شخص تھے۔

شیخ منصور اور شیخ حسین

شیخ احمد کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام شیخ منصور تھا اور دوسرے کا شیخ حسین —! شیخ احمد کی آئندہ نسل کا سلسلہ انہی دو بیٹوں سے چلا۔ شیخ منصور متواضع اور بلند اخلاق تھے، شجاعت و بہادری اور تحمل و بردباری میں بھی بے مثل تھے، شیخ حسین سے عمر میں بڑے تھے۔ چھوٹے بھائی شیخ حسین بھی تدین و تقویٰ میں ممتاز اور بہترین اوصاف سے متصف تھے۔

شیخ معظم

شیخ منصور کی دو بیویوں سے چار لڑکے تھے۔ شیخ معظم اور شیخ اعظم ایک بیوی سے، اور شیخ عبدالغفور اور شیخ اسماعیل دوسری بیوی سے —! سب سے بڑے شیخ معظم تھے۔ شیخ معظم بھی باپ کی طرح شجاع اور جری تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سپاہیانہ طرزِ زندگی اختیار کر لیا تھا۔ کفار کے خلاف کئی معرکوں میں شریک ہوئے اور کامیاب رہے۔ جنگ جُو اور مجاہد پیشہ تھے۔ اللہ نے انھیں علم و فضل اور نیکی و صالحیت کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا۔

شیخ وجیہ الدین

شیخ معظم کے تین بیٹے تھے۔ شیخ جمال الدین، شیخ فیروز اور شیخ وجیہ الدین —! شیخ وجیہ الدین بہت سی خوبیوں کے مالک اور متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ جہاں یہ عرفان و ادراک، علم و معرفت، فضل و کمال اور اتقا و للّٰہیت میں یگانۂ روزگار تھے، وہاں فنونِ سپاہ گری اور شجاعت و بسالت میں بھی خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کے زمانے میں مغلیہ سلطنت کا نامور تاجدار ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہ جہان تختِ ہند پر جلوہ افروز تھا۔ یہ اس کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ شاہ جہان کی نظر بندی کے بعد اس کا بیٹا سلطان اورنگ زیب عالم گیر ملک کے اورنگِ سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے شیخ وجیہ الدین کی شجاعانہ سرگرمیوں سے متاثر ہو کر ان کو ایک ممتاز فوجی عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ یہی

شیخ وجیہ الدین ہیں جو حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کے والدِ گرامی قدر اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے جدِّ امجد تھے۔ ان کی نیکی و پارسائی اور بہادری و جواں مردی کے متعدد واقعات منقول ہیں۔

اس خاندان کے تمام افراد اپنے وقت کے فقید المثال انسان تھے۔ یہ خاندان ارضِ ہند میں کوکبِ درخشاں اور مہرِ تاباں کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ خاندان ہے جس نے اس برصغیر کی دبیز ردائے ظلمت کو تار تار کیا اور اپنی علمی مساعی اور بھرپور عملی کوششوں سے ملک کو دینِ صحیح کے نور و ضیا کی لازوال دولت سے روشناس کرایا۔ ان میں سے ہر ایک کی کتابِ زندگی حیرت انگیز کوائف سے معمور اور سبق آموز واقعات سے مملو ہے۔ آئیے، اس مختصر تمہید اور خاندانِ شاہ ولی اللّٰہی کے اسلافِ کرام کے سرسری تعارف کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ضروری حالات کو مرکزِ توجہ ٹھہرائیں اور انھیں قلم و قرطاس کے زاویوں میں لانے کی کوشش کریں۔

ولادت اور دیگر حالات

شاہ عبدالرحیم، ۱۰۵۴ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے اور علم و فضل کی گود، ورع و تقویٰ کی فضا اور تصوف و طریقت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اورنگ زیب عالم گیر کا زمانۂ حکومت تھا اور شاہ صاحب کے والد شیخ وجیہ الدین، عالم گیر کی حکومت میں ایک معزز منصب سے سرفراز تھے۔

شاہ عبدالرحیم کے نانا کا نام شیخ رفیع الدین محمد تھا، جو ایک نیک اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ ان کے حالات میں مرقوم ہے کہ انھوں نے اپنی وفات سے پہلے گھر کا سامان جمع کیا اور شرعی حساب کے مطابق تمام ورثا میں تقسیم کر دیا۔ جب سب سے چھوٹی لڑکی کی باری آئی تو اُن کو فوائدِ طریقت کے چند اجزا اور مشائخ کا شجرہ عطا فرمایا۔ اس پر شیخ کی بیوی نے عرض کیا، یہ لڑکی ابھی غیر شادی شدہ ہے، اس کو کاغذ کے یہ چند اوراق دینا مناسب نہیں، اس کے لیے شادی کا سامان مہیا کرنا ضروری ہے۔ فرمایا: کاغذ کے یہ اجزا ہمارے اسلاف کی یادگار اور بزرگوں کی میراث ہیں، ہم ان کو دنیا

کی تمام شوکت و حشمت سے زیادہ قیمتی اور وقیع ٹھہراتے ہیں۔ اس لڑکی کے ایک فرزند پیدا ہو گا، جو بڑا ہو کر اہل اللہ کی جماعت کا سربراہ قرار پائے گا اور بہت بڑا عالم دین اور مقتدر پیشوا ہو گا۔ درحقیقت وہ ہماری معنوی میراث کا صحیح حق دار ہو گا، لہٰذا یہ اوراق اس کے حوالے کر دینا۔ اس لڑکی کی شادی کے سامان اللہ خود مہیا کرے گا۔ وہ مسبب الاسباب ہے، تم اس کے متعلق کوئی فکر نہ کرو۔

اس لڑکی کی شادی شیخ وجیہ الدین سے ہوئی اور اس سے شاہ عبدالرحیم پیدا ہوئے۔ جب وہ سنِ رشد و شعور کو پہنچے تو یہ کاغذات ان کے حوالے کر دیے گئے۔

شاہ عبدالرحیم نے ابتدائی درسی کتابیں اپنے بڑے بھائی ابوالرضا محمد دہلوی سے اور علومِ مروجہ کی انتہائی کتابیں قاضی محمد زاہد بن محمد اسلم ہروی سے پڑھیں۔ شرح عقائد کے کچھ اسباق شیخ عبداللہ بن عبدالباقی نقشبندی دہلوی سے پڑھے اور ساتھ ہی ان سے بہت سے روحانی فیوض بھی حاصل کیے۔ ان سے بیعت ہونے کی بھی درخواست کی لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور سید عبداللہ اکبر آبادی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کی ہدایت نصیب فرمائی۔ چنانچہ ان سے طریقۂ نقشبندیہ کے مطابق بیعت ہوئے اور کافی عرصہ ان سے منسلک رہے۔ پھر شیخ ابوالقاسم اکبر آبادی سے وابستہ ہو گئے اور ان سے بہت استفاضہ کیا۔ مشہور بزرگ شیخ عظمت اللہ بن عبداللطیف اکبر آبادی سے خرقۂ چشتیہ حاصل کیا۔

شاہ عبدالرحیم کا شمار کبار مشائخ چشتیہ میں ہوتا تھا۔ قرآن و حدیث اور فقہ کے جلیل القدر عالم اور عابد و زاہد تھے۔ اہلِ علم اور اہل معرفت ان کے زہد و ورع اور فضل و کمال پر متفق ہیں۔

بادشاہوں کی مجالس میں حاضری سے گریز

شاہ عبدالرحیم گوشہ گیر عالمِ دین تھے۔ ملوک و امرائے مملکت کے درباروں میں جانے سے قطعی انکار کر دیتے۔ ان کے زمانے میں اورنگ زیب عالم گیر ہندوستان کا حکمران تھا جو نیک دل اور متدین بادشاہ تھا۔ اس کی خواہش کے باوجود شاہ صاحب اس کے پاس نہ جاتے۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو حسبِ ذیل ہے۔

شیخ عبدالرحیم کا ایک مخلص اور بے ریا معتقد بادشاہ اورنگ زیب کے سلسلۂ خدام

ہیں داخل تھا۔ ایک دفعہ وہ عالم گیر کو پنکھا کر رہا تھا کہ دفعتہً اس پر محویت غالب ہوئی اور پنکھا ہاتھ سے چھوٹ کر اس زور سے بادشاہ پر گرا کہ وہ چونک پڑا۔ بیدار ہونے کے بعد دریافت کیا کہ یہ بے جا حرکت کرنے کی کیا وجہ ہے؟ غریب خادم نے کانپتی ہوئی زبان اور تھرتھراتی ہوئی آواز سے شیخ عبدالرحیم کا کچھ حال اور ان کی طرف اپنے انتساب کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس وقت ان کا خیال ذہن میں آگیا تھا، جس کی وجہ سے وہ یہ بھول گیا کہ بادشاہ کو پنکھا کر رہا ہے۔ اس خیال میں کچھ اس طرح کھو گیا کہ پنکھا ہاتھ سے گر پڑا۔ عالم گیر نے یہ بات پورے غور اور توجہ سے سُنی اور غائبانہ مشتاقِ ملاقات ہو کر بولا کہ شیخ کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔ خادم نے نہایت سماجت سے عرض کیا کہ بادشاہوں کی محفلوں اور امیروں کے گھروں میں جانا شیخ کا دستور نہیں۔ چونکہ عالم گیر مذہب کا سخت پابند اور اہل اللہ کا انتہائی معتقد تھا لہٰذا خادم کا یہ جرأت مندانہ جواب سن کر اس کے دل میں شیخ سے اشتیاقِ ملاقات کی آگ بھڑک اٹھی اور اپنے دربار کے ایک معتمد علیہ شخص کو، جو شیخ سے غایت درجہ کا اعتقاد رکھتا تھا، شاہ صاحب کی خدمت میں روانہ کیا اور اشتیاقِ ملاقات کے لیے جو اضطرابی کیفیت طاری تھی، بیان کی۔ اس شخص نے شیخ کو بادشاہِ ہند کا پیغام پہنچایا، اور اس کے دربار میں جانے کی درخواست کی۔ مگر شیخ نے جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں بادشاہ سے ملاقات کے لیے اس کے دربار میں نہیں جا سکتا۔ عالم گیر کے فرستادہ نے مایوس ہو کر عرض کیا کہ آپ کاغذ پر لکھ دیجیے تاکہ میں وہ تحریر بادشاہ کو دکھا دوں اور وہ آپ کے نہ جانے کو میری تقصیر پر محمول نہ کرے۔ آپ نے ایک بوسیدہ کاغذ کا ٹکڑا زمین سے اٹھایا اور یہ عبارت لکھی:"

"اہل اللہ کی جماعت کا اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ بئس الفقیر علیٰ باب الامیر۔ اور اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتا ہے: فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ[۵]۔ قرآنِ مجید کے ان الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر آپ

[۵] یہ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۸ کا ایک جز ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کا فائدہ کم ہے۔

کو دنیاوی اعزاز اور حشمت وشوکت حاصل ہے، وہ اس کائنات کے کل کا ایک نہایت ہی اقل القلیل جُز ہے۔ اگر میں یہ تسلیم بھی کر لوں کہ آپ مجھ سے مل کر خوش ہوں گے اور اپنی دنیاوی شوکت و حشمت میں سے کچھ مجھے دے دیں گے تو اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں کہ ایک جز دیں گے اور میں اس جُز کے لیے اپنا نام خدا کے دفتر سے خارج نہیں کرانا چاہتا، کیونکہ بزرگانِ چشتیہ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ جس شخص کا نام بادشاہ کے رجسٹر میں درج ہو جاتا ہے، خدا تعالیٰ کے رجسٹر سے اس کا نام کھُرچ دیا جاتا ہے۔

یہ الفاظ لکھ کر شیخ عبدالرحیم نے عالم گیر کو بھیج دیے۔ بادشاہ نے یہ الفاظ بار بار پڑھے اور بڑے غور سے پڑھے۔ ان الفاظ سے اس کو ہر دفعہ ایک نیا لطف محسوس ہوتا۔ کاغذ کا یہ پرزہ اس کے نزدیک اس درجہ محبوب تھا کہ اس نے اس کو جیب میں ڈال لیا اور بصورتِ تعویذ اپنے پاس رکھا۔ جب وہ نیا خلعت زیب تن کرتا، اس کو جیب سے نکال کر دوسری جیب میں رکھ لیتا۔ فرصت کے وقت اس کو باقاعدہ پڑھتا اور زار و قطار روتا[۵۶]

مسائلِ فقہی پر تعامل

فقہی مسائل پر تعامل کے سلسلے میں شیخ عبدالرحیم ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ اکثر مسائل میں حنفی مسلک کے مطابق عمل کرتے اور حنفی فقہ کو پیشِ نظر رکھتے، لیکن بعض مسائل کے بارے میں ان کی تحقیق یہ تھی کہ فقہ حنفی کے ان مسائل پر حدیث کو ترجیح حاصل ہے۔ ان مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ نماز میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے، اسی طرح نمازِ جنازہ میں بھی سورہ فاتحہ ترک نہ کرتے —— ایک ایک روز شیخ عبدالاحد سرہندی (متوفی ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ) نے جو شیخ محمد سعید کے بیٹے اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے پوتے تھے، اس مسئلے پر بحث چھیڑ دی اور اپنے اسلاف سے ایک متواتر نقل اس طرح پیش کی کہ نماز باجماعت کی مثال ایسی ہے، جیسا کہ

---

۵۶ حیات ولی، حاشیہ، ص ۱۹۸ تا ۲۰۰

کچھ لوگ بصورتِ جماعت ایک پُرشوکت بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر عرض احوال کریں، اور ظاہر ہے کہ بادشاہ کا درباری ادب اس امر کا مقتضی ہے کہ اس کے سامنے سب لوگ بیک وقت اپنی حاجتیں پیش نہ کریں بلکہ ایک ہی شخص سب کی نمائندگی کا فرض انجام دے۔

شیخ عبدالرحیم نے جواب میں فرمایا کہ نماز کو بادشاہ کے سامنے اس کے دربار میں معروضات پیش کرنے پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ اللہ کے حضور خاص شکل و انداز سے دعا اور الحاح و خضوع سے مناجات کرنا اور ایک مخصوص طریقے سے نفس کو تہذیب و تزکیہ سے آراستہ کرنا نماز کہلاتا ہے۔ اللہ، سمیع ہے، اگر تمام دنیا کے لوگ ایک ہی میدان میں کھڑے ہو جائیں اور ان میں سے ہر شخص الگ زبان اور دوسرے سے مختلف الفاظ و انداز میں اللہ سے کچھ طلب کرے تو وہ علیحدہ علیحدہ ہر شخص کی سنتا ہے، اس کے حضور ایک کی دعا و مناجات دوسرے کی دعا و مناجات میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔

قبولیّتِ دعا

شیخ عبدالرحیم کو اللہ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا، جن میں ایک نعمت یہ عطا فرمائی کہ وہ مستجاب الدعوات تھے۔ ان کی قبولیتِ دعا کے متعلق ان کے حالات میں متعدد واقعات مرقوم ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے بڑے لڑکے صلاح الدین کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہوئے اور مرض نے یہاں تک طول پکڑا کہ زندگی کی امید بالکل منقطع ہو گئی اور ظاہری اسباب دیکھ کر شیخ ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ خود شیخ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب میں نے دیکھا کہ صلاح الدین کی رگِ حیات کٹ چکی ہے تو لوگوں کو کفن خرید کر لانے اور قبر تیار کرنے کا حکم دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی فوراً میرے دل میں ایک جذبہ بیدار ہوا اور میں نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ جب میری الحاح و عاجزی بہت بڑھ گئی تو ایک فرشتہ آیا اور اس نے صلاح الدین کی حیات و صحت کی بشارت دی۔ اسی اثنا میں شیخ صلاح الدین کو چھینک آئی اور کروٹ بدل کر کھڑے ہو گئے۔

شیخ کی قبولیتِ دعا کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ دہلی میں بارش کا سلسلہ بند ہو گیا اور قحط سالی کے آثار پیدا ہو گئے، جس سے لوگوں میں بے چینی اور بے قراری پھیل گئی۔ لوگ دعا کے لیے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کی۔ دعا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ آسمان پر ابر نمودار ہوا اور ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ شیخ نے فرمایا کثرتِ باراں ہماری کچی دیواروں کو کسی چیز سے ڈھانپ دینے پر موقوف ہے۔ غیبی تدبیر ہمارے مکان کی دیواروں کو ڈھانے اور مسمار کرنے سے احتراز کرتی ہے۔ ان کے یہ الفاظ سن کر لوگوں نے فوراً بانس اور گھاس ان کے مکان کی دیواروں پر ڈال دیا۔ بعد ازاں اتنی موسلا دھار بارش ہوئی کہ خشک چشمے اور سوکھی نہریں پانی سے ابل پڑیں اور عرصے تک بارش کی ضرورت نہ رہی۔

تبحرِ علمی

شاہ عبدالرحیم علم و فضل میں بڑی فوقیت رکھتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس نیل گوں آسمان کے نیچے شیخ عبدالرحیم سے زیادہ فنِ حدیث کا ماہر اور عالم ان کے عہد میں کوئی نہ تھا۔ اگر میں انصاف سے اس سلسلے میں رائے ظاہر کروں تو بلا تامل اس حقیقت کا اعتراف کروں گا کہ میں نے ان جیسا ایک شخص بھی نہیں دیکھا جو تمام علوم میں عموماً اور حدیث و فقہ میں خصوصاً تبحر رکھتا ہو۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد شاہ صاحب کے پایہ کے کسی محدث و مفسر اور فقیہ کو ہندوستان کی گود میں پرورش پانا بہت کم نصیب ہوا ہوگا۔ آپ کو صحاح کی اکثر حدیثیں ازبر تھیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تمام احادیث مع اسناد کے بلا توقف بیان کرنے میں انھیں ملکۂ خاص حاصل تھا۔

طالب علمی کا ایک واقعہ

شیخ بچپن ہی سے نہایت ذہین و فطین تھے اور جودتِ فکر میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اس ضمن میں ان کا طالب علمی کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے جو درج ذیل ہے:

میر محمد زاہد ہروی کے مدرسے میں ملا حامد جون پوری، شیخ کے ہم درس تھے اور دونوں شرح مواقف پڑھتے تھے، جو دقیق اور مشکل کتاب ہے۔ ملا حامد بھی بڑے طباع اور

تیز ذہن تھے۔ شیخ کتاب کی عبارت پڑھتے تھے اور کہیں نہ رکتے تھے، نہ کوئی بات استاد سے پوچھتے تھے۔ ملا حامد اس پر نالاں تھے، وہ ہر مسئلہ استاذ سے بتفصیل سمجھنا چاہتے تھے۔ ایک روز شیخ کتاب کا ایک مشکل مقام پڑھ رہے تھے، ملا حامد کو یقین تھا کہ شیخ یہاں ضرور رکیں گے اور استاذ سے پوچھیں گے، مگر شیخ مسلسل پڑھتے چلے گئے۔ اس سے ملا حامد کو سخت غصہ آیا اور شیخ سے مخاطب ہو کر کہا آپ کچھ سمجھتے بھی ہیں یا یوں ہی آگے کو بھاگے جا رہے ہیں؟ شیخ نے نرمی سے جواب دیا، میرا خیال تھا آپ سمجھ گئے ہوں گے، اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی، تو فرمایئے، میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔ ملا حامد نے کتاب کے اس دقیق اور مشکل مقام پر انگلی رکھ کر کہا، بتایئے اس کا کیا مطلب ہے؟ شیخ نے تفصیل و وضاحت سے اور آسان الفاظ میں بات سمجھا دی۔ اس وقت ان کے استاذ میر محمد زاہد ہروی بھی تشریف فرما تھے اور ہم درس طلبا بھی موجود تھے، وہ ان کی حدتِ فہم سے متعجب بھی ہوئے اور خوشی کا اظہار بھی کیا۔

ذوقِ شعری

علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارتِ تامہ کے ساتھ ساتھ، شاہ عبدالرحیم شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے اور ان کی شاعری میں پند و نصائح کا رنگ غالب تھا۔ مثلاً یہ رباعی ان ہی کی ہے:

اے کہ نعمتہائے تو از حد فزوں　　　شکر نعمتہائے تو از حد بروں
عجز از شکر تو باشد شکر ما　　　گر بود فضل تو مارا رہنموں

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں، ایک دفعہ میرے والد نماز ظہر کے بعد اچانک میری طرف متوجہ ہوئے اور برجستہ یہ دو شعر ارشاد فرمائے:

اگر تو راہِ حق بخواہی اے پسر　　　خاطر کس را مرنجان الحذر
در طریقت رکن اعظم رحمت است　　　ایں چنین فرمود آن خیر البشر

یہ رباعی پڑھ کر فرمایا۔ ولی اللہ! قلم دوات پکڑو اور یہ رباعی لکھ لو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے دفعتاً میرے دل میں اس مضمون کو اسی غرض سے القا فرمایا ہے کہ تمھیں

وصیت کروں۔

اہل اللہ اور مجاذیب سے ملاقات

حضرتِ شیخ چونکہ خود بھی اہل اللہ اور صاحبِ تقویٰ تھے، اس لیے وہ اس قسم کے حضرات سے بہت تعلق رکھتے تھے۔ مجذوبوں سے بھی ان کو اُنس تھا اور متعدد مجذوبوں سے انھوں نے ملاقات بھی کی۔ اس نوع کے بہت سے واقعات خود شیخ نے بیان کیے ہیں، ان میں ایک واقعہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ کسی تقریب سے سونی پت گیا۔ اتفاقاً دل میں خیال آیا کہ یہاں منور مجذوب کو دیکھنا چاہیے، چنانچہ میں وہاں پہنچا جہاں وہ قیام پذیر تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ گہری نیند سو رہا تھا، مگر جوں ہی اس نے میری آہٹ محسوس کی، چاروں طرف سے اپنی گدڑی سمیٹ کر اس میں لپٹ گیا اور ہوش و حواس بحال کر کے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا اور جب دیکھا کہ وہ کوئی بات نہیں کرتا تو خود میں نے گفتگو شروع کی اور کہا، مجھے آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے اگر عقل و ہوش سے جواب دیں تو عرض کروں۔ اس نے کہا، آپ بات کیجیے، میں حتی الامکان احتیاط سے جواب دوں گا۔ میں نے کہا، صرف اتنی بات بتائیں کہ آپ کو ایسی کون سی چیز حاصل ہوئی ہے، جس نے آپ کی ساری عقل و تمیز ختم کر کے رکھ دی ہے اور ہوش و حواش سلب کر لیے ہیں۔ مجذوب نے میری بات سن کر پہلے تو سکوت اختیار کیا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہو۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔ عزیزِ من! یہ ایسا نازک اور باریک سوال ہے، جس کا جواب عبارت کے قالب میں ڈھالنا اور الفاظ کے پیرایہ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ البتہ ایک مثال کے اسلوب میں تم پر اس کی کیفیت ظاہر کرتا ہوں۔ سنو! جس چیز نے ہماری عقل و تمیز سلب کر کے ہمیں مجنونوں اور دیوانوں کے زمرے میں داخل کیا ہے، اسے ایک ایسی کیفیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نے مقدار سے زیادہ گرمی محسوس کی اور پسینے میں غرق ہو گیا۔ ناگہاں نہایت سرد اور خوش آئند ہوا کے جھونکے شروع ہو گئے، جن سے اس کو راحتِ کلی حاصل ہوئی۔ بس یہی کیفیت ہم لوگوں پر طاری ہو کر ہمیں اس درجے کو پہنچا دیتی ہے۔ میں نے کہا، اس سے بہتر کیفیت

تو سالکوں کو حاصل ہوتی ہے مگر پھر بھی ان کی عقل بحال اور حواس قائم رہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ عزیزِ من! یہ داشتِ الٰہی ہے، جس شخص کو جیسا چاہتا، رکھتا ہے۔

صوفیا کا لباس

شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں، ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ صوفیا کے لباس میں مقیّد رہنا بہرکیف تکلف سے خالی نہیں۔ اس خیال نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ میں نے اسی آن وہ لباس اتار پھینکا اور سپاہیانہ لباس پہن لیا۔ یعنی عمامہ باندھا، کمر میں تلوار لگائی اور گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل پڑا۔ ابھی تھوڑی دُور گیا تھا کہ ایک مجذوب سامنے سے آکر کہنے لگا، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص چاند کو پیالے سے چھپالے؟۔ ہرگز نہیں۔ عزیزِ من! تیرے معبود کی قسم۔ یہ لباس تیری شان کے سزاوار نہیں، اسے اتار ڈال اور لباسِ صوفیا زیب تن کر۔ چنانچہ اسی وقت میں نے بالالتزام صوفیا کا سا لباس اختیار کر لیا۔ اس کے علاوہ کسی قسم کا لباس پہننا پسند نہیں کیا۔

مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد

ہندوستان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خدمتِ علمِ حدیث کی بنیاد ڈالی، مگر اس زمانے میں چونکہ چاروں طرف جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی لہٰذا حضرت شیخ کی تمام تر مساعی کے باوجود اس کی پوری طرح اشاعت و ترویج نہ ہو سکی۔ ان کے بعد اللہ نے شیخ عبدالرحیم کو پیدا کیا اور انھوں نے دہلی میں مدرسہ رحیمیہ کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی جس میں لوگوں کو علمِ حدیث کی تعلیم دینا شروع کی۔ اس میں دور دراز مقامات سے کثیر تعداد میں علما و طلبا علم حدیث پڑھنے کے لیے آنے لگے اور لوگوں میں اس کے حصول کے لیے ایک تحریک پیدا ہو گئی اور پھر آہستہ آہستہ بے شمار شائقین علومِ دینی اس چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔

علمی مباحث

شیخ عبدالرحیم دہلوی کی خدمت میں مختلف مقامات سے علمائے دین تشریف لاتے اور ان سے بعض دلچسپ علمی بحثیں ہوتیں۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ شاہ ولی اللہ یہ

تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن میرے والد (شیخ عبدالرحیم) نے مجھ سے بیان کیا کہ سید علیم اللہ نے، جو شیخ آدم قدس سرہٗ کے اکابر اصحاب میں سے ایک نہایت مقتدر اور جلیل القدر شخص ہیں اور جن کے فضل و کمال اور علمی کارناموں کی بڑی شہرت ہے، حرمتِ تمباکو کے موضوع پر ایک پُر زور رسالہ لکھا اور دو افغانیوں کی معرفت علمائے دہلی کے پاس بھیجا۔ سب سے پہلے وہ رسالہ مجھے دکھایا گیا۔ اس رسالے میں قرآن کی آیت: فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ [۵۷]۔ اور اسی نوع کے چند اور دلائل سے حرمتِ تمباکو میں استدلال کیا گیا تھا۔ میں نے رسالہ پڑھا تو ان افغانی حضرات سے صاف الفاظ میں کہا کہ حرمتِ تمباکو سے متعلق یہ تمام استدلات بالکل کمزور اور ضعیف ہیں۔ ان سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے بعد میں نے، اس میں درج شدہ روایات کی تفصیل سے تردید کی اور مذکورہ بالا آیت کی صحیح تفسیر بیان کی۔ اس ضمن میں وہ اقوال پیش کیے جو معتبر و مستند مفسرین سے منقول ہیں۔ اگرچہ میری تقریر مدلل اور معلومات سے پُر تھی، تاہم وہ افغانی نہ تو اس سے متاثر ہوئے اور نہ انھوں نے اس میں کوئی دلچسپی لی، بلکہ ناراض اور ناخوش ہو کر مجلس سے اُٹھے اور ملا یعقوب کے مدرسے میں پہنچ گئے۔ ملا یعقوب دہلی کے مشہور عالم اور فاضل شخص تھے، مگر تمباکو نوشی کے سخت عادی تھے اور اسے قطعی مباح سمجھتے تھے۔ یہ لوگ ان کے مدرسے میں گئے تو وہ برسرِ مجلس اور دورانِ درس حقہ پی رہے تھے۔ افغانی طلبا نے اس پر اعتراض کیا تو ملا یعقوب نے کہا، میں برسرِ مجلس اس لیے حقہ پیتا ہوں کہ لوگوں کو اس کی اباحت معلوم ہو جائے، اور اگر کسی کو اس کے مباح ہونے میں شبہ ہو تو دلیل پیش کرے، میں اس کا جواب دوں گا۔

سید علیم اللہ کے فرستادوں یعنی افغانی طلبا نے جرأت مندانہ انداز میں کہا، چونکہ اس مسئلے کا ماخذ موجود ہے، اس لیے اس کا فیصلہ بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ

---

[۵۷] یہ سورہ دخان آیت ۱۰ ہے۔ ترجمہ یہ ہے: اس دن کا انتظار کرو کہ آسمان سے واضح طور پر دھواں نکلے گا۔

انھوں نے اس رسالے میں سے چند فقہی دلائل پیش کیے۔ ملا یعقوب نے فوراً ان کی تردید کردی، اور وہ لوگ زورِ دلائل میں ان کا مقابلہ نہ کر پائے۔ اب دوبارہ شاہ عبدالرحیم کی خدمت میں آئے اور ملا یعقوب سے مباحثہ ومناظرہ کی کیفیت بیان کی۔ شاہ عبدالرحیم نے فرمایا، حرمتِ تمباکو سے متعلق تمھارا استدلال غلط ہے اس لیے تمھارے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہیے تھا۔

شاہ صاحب نے ان سے کہا، مغموم ہونے کی ضرورت نہیں، اب میں تمھیں ایک دلیل بتاتا ہوں۔ تم ملّا یعقوب کے پاس جاؤ اور اسی طرح بات کرو جس طرح میں تم سے کہتا ہوں۔

تم ان سے قرآن کی آیت: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ [۵۸] کا شانِ نزول دریافت کرو۔ وہ اس کا جواب یہ دیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زوجۂ مطہرہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گھر شہد تناول فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تمام ازواجِ مطہرات نے حضرت زینب پر رشک کرتے ہوئے آپس میں مشورہ کیا کہ آج آنحضرتؐ جس بیوی کے پاس تشریف لائیں، وہ آپ سے افسوس ناک لہجے میں عرض کرے کہ حضور کے مبارک منہ سے گندنے (مغافیر) کی بُو آرہی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا، میں نے گندنا (مغافیر) تو نہیں کھایا، البتہ شہد کھایا ہے۔ اس پر ایک زوجۂ مطہرہ نے عرض کیا، معلوم ہوتا ہے شہد کی مکھی گندنے کے درخت پر بیٹھی ہے اور اس کی بو شہد میں سرایت کر گئی ہے۔ یہ بات سن کر آنحضرتؐ نے اپنے آپ پر شہد کو حرام ٹھہرالیا اور نتیجتہً یہ آیت نازل ہوئی۔

شاہ صاحب نے مزید فرمایا کہ جب ملا یعقوب اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں تقریر کر چکیں تو آپ ان سے سوال کریں کہ آخر آنحضرتؐ کے نزدیک شہد کی علّتِ

---

۵۸ یہ سورۂ تحریم کی آیت نمبر ۱ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: اے پیغمبر! جو چیز، اللہ نے آپ کے لیے حلال قرار دی ہے آپ اسے اپنے لیے حرام کیوں ٹھہراتے ہیں۔

کراہت کیا تھی ؟ ملا یعقوب بجز اس کے کچھ نہ کہہ سکیں گے کہ علت کراہت بدبو تھی۔!
اس پر آپ ان سے پوچھیں کہ حدیث شریف میں جو یہ الفاظ وارد ہیں کہ من اکل هاتين الشجرتين فلا يقربن مسجدنا[۵۹] - تو اس میں علتِ نہی کیا ہے ؟۔
ملا یعقوب جواب دیں گے "بوئے بد"!" اس کے بعد آپ بے دھڑک ہو کر پوچھیں کہ حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ آنحضرتؐ خوشبو سے رغبت اور بدبو سے نفرت کرتے تھے تو یہ صحیح ہے یا نہیں ؟ اگر صحیح ہے تو ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کہ تمباکو میں بدبو ہے یا نہیں ؟ اگر اس سوال کے جواب میں ملا یعقوب یہ کہیں کہ تمباکو میں بدبو نہیں ہے، تو آپ ان سے پوچھیں کہ جن لوگوں نے کبھی تمباکو نہیں پیا ہے، ان سے دریافت کرنا چاہیے کہ اس کی بُو دماغ کو اچھی معلوم ہوتی ہے یا بُری -؟ اور جب اس میں از راہِ تجربہ و مشاہدہ بوئے بد کا پایا جانا ثابت ہوتا ہے، تو اصحابِ علم اور اہلِ ورع و تقویٰ کے نزدیک مناسب یہی ہے کہ تمباکو نوشی ترک کر دیں۔

چنانچہ وہ دونوں افغانی طلبا دوبارہ ملّا یعقوب کے پاس گئے اور اسی طرح سلسلۂ گفتگو شروع کیا جس طرح شاہ عبدالرحیم نے فرمایا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملا یعقوب نے ان باتوں کا اعتراف کیا اور اسی وقت چلم اور نے کو توڑ ڈالا اور تمباکو نوشی ہمیشہ کے لیے ترک کر دی۔

شاہ صاحب سے ملا عبداللہ چلپی کی بیعت

ایک مرتبہ ایک مجلس میں شاہ عبدالرحیم صاحب کی ملاقات ملا عبداللہ چلپی سے ہوئی، جنھوں نے بعد میں فتاویٰ عالم گیری کا فارسی میں ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس ملاقات کے نتیجے میں وہ شاہ عبدالرحیم سے بیعت بھی ہوئے۔ اس ملاقات

---

[۵۹] یہ حدیث الفاظ کے تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ مختلف کتب احادیث میں موجود ہے۔ سنن ابی داؤد کے کتاب الاطعمہ میں بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ان دو پودوں (یعنی لہسن اور پیاز) کھانے کے بعد (اس وقت تک) مسجد میں نہ جائے (جب تک اس کی بو باقی رہے)

کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے، جو حضرت شاہ ولی اللہ اپنے والدِ محترم حضرت شاہ عبدالرحیم کی زبانی بیان فرماتے ہیں۔ الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

عبداللہ چلپی ایک داعی تھا، جو روم (ترکستان) سے ایران اور ایران سے ہندوستان آیا۔ اس کے بارے میں عجیب و غریب باتیں لوگوں میں مشہور تھیں۔ ان میں ایک بات یہ تھی کہ وہ چالیس روز بے آب و دانہ حجرے میں معتکف رہتا ہے۔ باہر سے حجرے کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور وہ چالیس دن بعد صحیح اور تندرست حالت میں باہر نکل آتا ہے۔ یہ بھی سنا جاتا تھا کہ اندھیرے میں بیٹھ کر قرآنِ مجید لکھتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زمین میں گھس جاتا ہے اور جہاں سے چاہتا ہے، نکل آتا ہے۔ ان باتوں کی وجہ سے اس کا شمار اولیاء اللہ اور اصحابِ کرامات بزرگوں میں کیا جانے لگا ـــــ شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں، عبداللہ چلپی کے اس قسم کے کمالات و فضائل سن کر میرے دل میں اس سے اشتیاقِ ملاقات کا جذبہ ابھرا اور میں اس سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ ان دنوں وہ بادشاہ سے چھپ کر ایرانیوں کے مکان میں قیام پذیر تھا۔ وہ شیعہ تھے، میں وہاں پہنچا، مذہبی معاملے میں ان سے بحث کا سلسلہ جاری رہا اور انھوں نے بلا تکلف بتایا کہ وہ میری باتوں سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

غرض، بحث ختم ہونے کے بعد میں نے عبداللہ چلپی سے ملاقات کی، یقین جانیے، میں جس بے تابی اور جذبۂ شوق سے اس سے ملنے گیا تھا، اس کی شکل دیکھ کر اس کے لیے میرے دل میں اس سے کہیں زیادہ نفرت اور کراہت پیدا ہوئی۔ میں نے نظرِ اوّل ہی سے معلوم کر لیا کہ یہ شخص اولیاء اللہ کے آداب و اسالیب سے بالکل ناآشنا ہے۔ اسی بنا پر میں نے اس کی تعظیم سے گریز کیا۔ میں نہایت مکدّر ہو کر واپس آنے لگا تھا کہ میرے چہرے کا یہ فوری تغیر ایک ایرانی نے بھانپ لیا اور بولا "کیا وجہ ہے کہ جس شوق سے آپ عبداللہ کی ملاقات کو تشریف لائے تھے، اس سے کہیں زیادہ اسے دیکھ کر اعراض اور پہلوتہی کی۔" میں نے صاف الفاظ میں جواب دیا کہ "میں عبداللہ کو اللہ کا ولی سمجھتا تھا، لیکن دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ولی نہیں ہے بلکہ صاحبِ دعوت ہے۔" عبداللہ نے

میری یہ بات سنی تو کہا، "شیخ سچ کہتے ہیں"۔

اس کے بعد عبداللہ نے دعائے سیفی پڑھنا شروع کی اور پڑھتے پڑھتے ایسے مقام پر پہنچا، جہاں اگرچہ قواعدِ نحوی کے لحاظ سے اِعراب میں دونوں طرح کا احتمال تھا تاہم وجدان کے اعتبار سے صرف ایک ہی وجہ متعین تھی اور عبداللہ نے دوسری وجہ اختیار کی تھی۔ اس پر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں بول اٹھا۔ "عبداللہ! تم نے غلط پڑھا ہے" اس کے جواب میں اس نے پورے زور سے کہا "نہیں۔ میں نے غلط نہیں پڑھا۔ میں نے صحیح پڑھا ہے۔ آپ مجھے غلط بتا رہے ہیں"۔ اس پر بحث شروع ہوگئی اور دعائے سیفی کے وہ نسخے فراہم کیے گئے جو اساتذہ سے پہنچے تھے۔ مختلف اساتذہ کے بارہ نسخے دیکھے گئے اور اتفاق کی بات یہ کہ ان میں اعراب وہی درج تھا جو عبداللہ نے پڑھا تھا۔ اب تیرھواں نسخہ دیکھا گیا۔ یہ نسخہ شیخ احمد جام کے تبرکات میں سے تھا اور سب نسخوں سے زیادہ معتبر اور مستند مانا جاتا تھا۔ یہ نسخہ بہت مشکل سے کسی اہلِ علم امیرِ حکومت کے کتب خانے سے منگوایا گیا تھا۔ اس میں وہ اعراب لکھا تھا، جو میں کہتا تھا۔ اس پر عبداللہ نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور میری تحسین کی۔

اس کے بعد اس نے ایرانیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم جانتے ہو، میں نے اس سلسلے میں اتنی تحقیق اور چھان بین کیوں کی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں دعائے سیفی پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچتا تھا، جس کے نحوی اعراب کے بارے میں شیخ نے مجھ سے اختلاف کیا، تو میں اپنے سامنے ایک ظلمت اور تاریکی پاتا تھا۔

بالآخر عبداللہ چلپی نے نہ صرف شیخ عبدالرحیم کی بات تسلیم کر لی بلکہ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا اور آپ سے بیعت ہو کر طریقہ قادریہ میں شامل ہوا۔

فتاوٰی عالم گیری میں حصہ

شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فقہ اور اس کے مختلف گوشوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فتاوٰی عالم گیری کے سلسلے میں بھی انھوں نے خدمات انجام دیں۔ وہ فتاوٰی عالم گیری کے باقاعدہ مرتبین کی جماعت میں تو شامل نہ تھے، البتہ اس کی ترتیب وتدوین

کے بعد اس پر نظر ثانی میں ان کا حصہ ہے۔ فتاویٰ کی ترتیب کے بعد اس پر نظر ثانی کا مرحلہ پیش آیا تو اس کا اہتمام شیخ حامد جون پوری کے سپرد کیا گیا تھا۔ شیخ حامد جون پوری اپنے وقت کے جید عالم و فقیہ تھے اور علامہ محمد زاہد ہروی کے مدرسے میں شاہ عبدالرحیم دہلوی کے ہم سبق رہ چکے تھے، اس بنا پر شاہ صاحب کی فقہی عظمت اور علمی قابلیت سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ایک دن وہ شاہ صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ اگر آپ فتاویٰ کی دوبارہ تدوین اور نظر ثانی میں مجھ سے تعاون کریں تو اس کے صلے میں ایک معقول رقم روزانہ آپ کی خدمت میں پیش ہوتی رہے گی۔ لیکن شاہ صاحب مستغنی المزاج اور بے نیاز قسم کے عالم تھے، انھوں نے شیخ حامد کی اس پیش کش کو کوئی اہمیت نہ دی اور بے توجہی سے ان کو ٹال دیا۔ اتفاق سے شاہ صاحب کی والدہ ماجدہ نے یہ بات سن لی تھی، انھوں نے بیٹے کی بے پروائی پر خفگی کا اظہار کیا اور گھر کی مالی کمزوریوں کی وجہ سے اصرار کیا کہ وہ یہ خدمت بہرحال قبول کر لیں۔ چنانچہ شاہ صاحب نے والدہ کے حکم سے مجبور ہو کر شیخ حامد کی بات مان لی اور فتاویٰ پر نظر ثانی کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

ایک دن شاہ عبدالرحیم فتاویٰ کے ایک مقام کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ایسی عبارت پر نظر پڑی، جس میں بہت الجھاؤ اور کلی اختلال تھا اور اس اختلال کی وجہ سے مسئلہ زیرِ بحث کی اصل صورت بالکل بدل گئی تھی۔ شاہ صاحب نے شیخ حامد کو فتاویٰ عالم گیری کے اس حصے کے مؤلف کی اس لغزش سے متنبہ کیا اور فرمایا کہ میرے نزدیک یہ عبارت مختل اور الجھی ہوئی ہے اور اصل مسئلہ یوں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شیخ حامد جون پوری نے شاہ صاحب کی بات پر توجہ نہ کی اور مؤلف کی وسعتِ نظر پر اعتماد کر کے آگے بڑھنے کو ترجیح دی۔

شاہ صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید اور وضاحت کے لیے جب مسئلہ زیرِ بحث کا ماخذ تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ دو کتابوں میں مختلف عبارتوں میں لکھا گیا ہے۔ مگر یہاں صورتِ حال یہ تھی کہ فتاویٰ عالم گیری کے مؤلف نے دونوں عبارتوں کو بلا کسی فرق

اور امتیاز کے ایک ہی جگہ درج کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اختلال پیدا ہو گیا تھا، لہٰذا شاہ صاحب نے فتاویٰ کے حاشیے پر یہ عبارت لکھ دی:

من لم یتفقہ فی الدین قد خلط فیہ، ھذا غلط، وصوابہ کذا۔

کہ جو دین کی سمجھ سے بہرہ مند نہیں، اس نے اصل بات کو خلط ملط کر دیا ہے، یہ غلط ہے ــــ اصل مسئلہ یوں ہے۔

جس زمانے میں فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین اور نظر ثانی کا مرحلہ درپیش تھا، اس زمانے میں خود اورنگ زیب اس میں انتہائی دلچسپی لیتا تھا۔ اس میں اس کی محنت اور اہتمام کا اندازہ اُس سے ہو سکتا ہے کہ شیخ نظام برہان پوری اس کام کے نگران تھے، ان کا فقہی مرتبہ نہایت بلند تھا۔ وہ نظر ثانی شدہ مواد کے روزانہ ایک یا دو صفحے بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے اور بادشاہ کامل توجہ اور انہماک سے ایک ایک مسئلے کو دیکھتا اور پورے غور و فکر سے سنتا تھا، وہ کاتبوں کی غلطیاں بھی خود درست کرتا تھا۔ جب شیخ نظام برہان پوری معمول کے مطابق بادشاہ کے سامنے کتاب پڑھنے لگے اور اس مقام پر پہنچے، جس کو شاہ صاحب نے مختل اور الجھا ہوا قرار دیا تھا، تو شاہ صاحب کے حاشیے کی عبارت کو متن کے ساتھ ملا کر پڑھ دیا۔ بادشاہ نے یہ عبارت سنی تو بڑا حیران ہوا۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ شیخ برابر پڑھتے ہی جا رہے ہیں، رکتے نہیں ہیں تو کہا۔

ایں عبارت چیست؟

یہ کیا عبارت ہے؟

ذرا پھر پڑھیے۔ شیخ نظام دوسری مرتبہ بھی حاشیہ اور متن کا فرق سمجھے بغیر اسی طرح پڑھ گئے۔ اب عالم گیر نے شیخ سے اس مقام کی وضاحت چاہی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے، اور کہا:

ایں مقام را مطالعہ نہ کردہ ام، فردا بہ تفصیل عرض خواہم کرد۔

میں نے اس مقام کا مطالعہ نہیں کیا، کل تفصیل سے بتاؤں گا۔

شیخ بڑے حیران اور پریشان ہوئے۔ عالم گیر سے فارغ ہوئے تو فوراً شیخ حامد جون پوری

کے پاس پہنچے اور خفگی کا اظہار کیا۔ فرمایا، میں نے یہ مسودہ آپ کے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا، مگر آپ نے اس پر غور نہیں کیا اور مجھے بادشاہ کے سامنے نادم ہونا پڑا۔

شیخ حامد نے یہ بات سنی تو شاہ عبدالرحیم کے پاس آئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ شاہ صاحب نے وہ دونوں کتابیں جو مسئلہ زیرِ بحث کا اصل ماخذ تھیں، شیخ حامد کے سامنے رکھ دیں اور عبارت کی بے ربطی اور اختلال واضح کیا[۱۰]

اصل واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبدالرحیم کے والدِ گرامی وفات پا چکے تھے اور آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ والدہ کے مجبور کرنے پر فتاویٰ عالم گیری کی تدوین اور نظرِ ثانی کے شعبے میں ملازمت کرنا پڑی۔ ادھر ان کے مرشد خلیفہ ابو القاسم کو پتا چلا تو وہ خفا ہوئے اور ترکِ ملازمت کے لیے کہا۔ شاہ صاحب نے ان سے والدہ کے اصرار اور مالی ضرورت کی بات کی اور ساتھ ہی فرمایا کہ دعا کیجیے، ملازمت خود بخود چھوٹ جائے۔ بادشاہ کے پاس مدوّنینِ فتاویٰ کے ناموں کی فہرست وقتاً فوقتاً پیش ہوتی رہتی تھی۔ اب یہ فہرست پیش ہوئی تو اس نے شاہ عبدالرحیم کا نام اس سے خارج کر دیا اور کہا۔

اگر خواستہ باشد ایں قدر زمین بدہیدہ۔

یعنی اگر وہ چاہیں تو جتنی ان کو تنخواہ دی جاتی ہے، اس قدر زمین دے دی جائے۔

لیکن شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

قبول نہ کردم و شکرانہ بجا آوردم و حمد خدا تعالیٰ گفتم[۱۱]

کہ میں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا، بادشاہ کے اس اقدام پر اس کا شکریہ ادا کیا اور ترکِ ملازمت پر الحمد للہ کے الفاظ کہے۔

انتقال

انتقال سے کچھ عرصہ پہلے شاہ عبدالرحیم جسمانی طور پر خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ اسی کمزوری اور نقاہت کی حالت میں رمضان المبارک کے روزے رکھے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

---

۱۰ انفاس العارفین، ص ۲۴ ۱۱ ایضاً

میں ان دنوں زیادہ تر انہی کے پاس رہتا تھا۔ ان کی زبان پر استغفر اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم کے الفاظ جاری رہتے۔ ماہِ صفر میں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی، لیکن اس حالت میں بھی نماز کا بہت خیال رکھتے اور وقت پر نماز ادا کرتے۔ ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ کو صبح پو پھٹنے سے پہلے ان پر موت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کرب کے عالم میں بھی دل میں نماز کا خیال تھا۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے بار بار پوچھتے کہ فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے؟ لوگوں نے کہا، نماز کا وقت ابھی نہیں ہوا۔ اس پر قدرے خفگی سے فرمایا۔ اگر تمہاری نماز کا وقت نہیں ہوا تو نہ سہی، ہماری نماز کا وقت تو ہو چکا ہے۔ فرمایا، مجھے قبلہ رخ کر دو، چنانچہ قبلہ رخ کر دیے گئے۔ نماز کے وقت میں اگرچہ کچھ دیر تھی، مگر آپ نے اشاروں سے نمازِ فجر ادا کی۔ اس کے بعد اسمِ ذات کے ذکر میں مشغول ہو گئے اور اسی حالت میں انتقال کر گئے۔

شاہ عبدالرحیم نے چہار شنبہ کے روز ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ کو ستّر سال کی عمر پا کر فرخ سیر کے عہد میں بمقام دہلی، داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کے پچاس روز بعد مغل بادشاہ فرخ سیر گرفتار ہوا، اور دہلی میں بڑے سخت واقعات رونما ہوئے، جس کی وجہ سے ایک عام بے چینی اور اضطراب کی فضا پیدا ہو گئی[۱۲]۔

۹۹۔ شیخ عبدالرحیم حسینی بیجاپوری

شیخ عبدالرحیم حسینی بیجاپوری، شیخ و فاضل اور فقہ، اصولِ فقہ اور مروجہ علومِ عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ شہر بیجاپور میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی اور بچپن ہی سے حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ مختصرات اپنے شہر کے اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر جب قاضی ابو البرکات نے سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی رکاب میں بیجاپور کا سفر کیا تو ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسندِ تدریس آراستہ کی اور

---

[۱۲] تفصیل کے لیے دیکھیے، انفاس العارفین اور حیاتِ ولی وغیرہ کتابوں کے وہ حصے جن میں ان کے حالات مرقوم ہیں۔

بے شمار لوگوں کو اپنے علم وفضل سے مستفید فرمایا۔
شیخ عبدالرحیم بیجاپوری نے چہار شنبہ کے روز ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۱۶۸ھ کو وفات پائی۔[۱۳]

۱۰۰- قاضی عبدالرسول سہالوی

شیخ عبدالرسول بن یوسف بن سلیمان سعد اللہ انصاری سہالوی کا مولد و منشا نواحِ لکھنؤ کا ایک قریہ سہالی ہے۔ انھوں نے دہلی کے اساتذہ سے علم حاصل کیا، اور اپنے دور کے کبار فقہائے حنفیہ میں گردانے گئے۔ بعد ازاں علاقہ اودھ میں تشریف لے گئے اور سید عبدالرزاق حسینی قادری بانسوی سے اخذِ طریقت کیا۔ طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے۔ پھر اعمال ڈھاکہ میں ایک مقام ”کونہیٹہ“ کے منصب قضا پر مامور ہوئے۔ سرزمینِ بنگال میں اس عالم وفقیہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔[۱۴]

۱۰۱- شیخ عبدالصمد چریاکوٹی

قاضی عبدالصمد بن قاضی ابوالحسین بن ملا محمد ماہ بن قاضی منصور عباسی، عالی طبع اور روشن ذہن عالم تھے۔ جلیل القدر فقہا میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے والدِ گرامی قاضی ابوالحسن چریاکوٹی سے تحصیل کی۔ پھر سندِ قضا حاصل کرنے کے لیے، جو اُن کا موروثی منصب تھا، والد کے حکم سے دہلی گئے۔ وہاں تمام علما میں صاحبِ فضل وکمال قرار پائے، یہاں تک کہ ارکانِ شاہی نے ان کو فقہ، اصول اور دیگر علومِ منقول ومعقول میں یگانہ تسلیم کیا۔ بادشاہِ دہلی محمد شاہ کے فرمان سے ان کو پرگنہ چریاکوٹ اور دیگر مقامات کا منصبِ قضا عطا ہوا۔ مگر انھوں نے فقط پرگنہ — چریاکوٹ — کے منصبِ قضا کو ترجیح دی، دیگر

---

[۱۳] نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۱۴۵ | محبوب ذی المنن حصہ اوّل، ص ۵۰۶، ۵۰۷
[۱۴] نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۱۴۸ | بحوالہ اغصان الانساب

مقامات کا عہدۂ قضا ان کے قدیم مستحقین کے سپرد کر دیا ـــــ دہلی سے چریاکوٹ آئے تو قضا کی نازک ذمہ داریوں میں مصروف ہو گئے اور فصل خصوصیات کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اپنے مفوضہ فرائض کامل دیانت داری سے انجام دیتے، جس کی وجہ سے بڑی شہرت پائی۔ یگانۂ آفاق حافظ محمد اسحاق ان کے شاگرد تھے۔

قاضی عبد الصمد چریاکوٹی نے ۱۱۷۱ھ کو وفات پائی۔ "قاضی منصف" مادۂ تاریخِ وفات ہے۔[۱۵]

۱۰۲۔ قاضی عبد الصمد عثمانی جون پوری

قاضی عبد الصمد عثمانی جون پوری، ایک فاضل شخص تھے اور فقہ و اصول کے چوٹی کے علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ سرزمینِ ہند کے جلیل القدر عالم و فقیہ شیخ محمد رشید بن مصطفیٰ عثمانی جون پوری (مصنف رشیدیہ۔ متوفی ۱۹ رمضان ۱۰۸۳ھ) کے بھتیجے اور شاگرد تھے۔ عرصے تک ان سے وابستہ رہے، یہاں تک کہ تمام متداول علوم و فنون میں سب سے فوقیت لے گئے۔ پھر دہلی گئے اور علمائے کرام کی اس جماعت میں شامل ہوئے جو فتاویٰ عالم گیری کی تصنیف پر مامور تھے۔ بعد ازاں دکن کے ایک شہر میں عہدۂ قضا پر متعین کیے گئے اور خاصی مدت اس منصب پر فائز رہے۔ پھر لکھنؤ منتقل ہو گئے، وہاں آٹھ سال اقامت گزین رہے۔ بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر ان کی انتہائی تکریم کرتا تھا، اس نے انھیں کئی گاؤں بطور جاگیر عنایت کیے۔ ۲۷ رجب کو (سنِ وفات کا ذکر نہیں ملا) علاقہ دکن میں وفات پائی اور میت کو ایک گاؤں میں جو "سوکلائی" کے نام سے موسوم تھا، لایا گیا اور وہیں قاضی باغ (حدیقۃ القاضی) میں مدفون ہوئے۔[۱۶]

۱۰۳۔ مولانا عبد الصمد دیوی

شیخ عبد الصمد اعظمی دیوی، مفتی عبد السلام اعظمی کی اولاد سے تھے۔ قصبہ دیوہ (یوپی)

---

[۱۵] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۱ ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۵۲۔

[۱۶] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۵۲ بحوالہ باغ بہار ـــــ برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ، ص ۳۰۳

میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما کی منزلیں طے کیں۔ اپنے عصر کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اور فقہ و اصول اور علومِ عربیہ میں ماہرِ کامل ہوئے۔ تفسیرِ قرآنِ مجید میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور بہترین تفسیری نکات بیان فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی تالیف کیا۔ احمد شاہ کے عہد میں دار السلطنت دہلی میں امرا و ملوک کی سلکِ ملازمت میں منسلک ہو گئے تھے، کافی عرصہ یہ خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر فرخ آباد چلے گئے، وہاں نواب غالب جنگ نے اپنے بیٹے مظفر جنگ کا اتالیق مقرر کر دیا تھا۔ وفات تک اس منصب پر مامور رہے[۱۱۷]

۱۰۴۔ مولانا عبد الفتاح صمدانی

مولانا ابو الفرج عبد الفتاح بن ہاشم حسینی صمدانی کا شمار بارھویں صدی ہجری کے مشاہیر فقہائے ہند میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مرکزِ علم جون پور میں سید محمد جون پوری سے اخذِ علم کیا۔ پھر دہلی تشریف لے گئے، وہاں سید محمد زاہد ہروی کا سلسلۂ درس و تدریس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور سید ممدوح کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ علم و تحقیق اور فضل و کمال میں یہاں تک ترقی کی کہ فقہائے عظام اور علمائے کرام کی اس جماعت میں شامل کیے گئے، جنھوں نے فتاویٰ عالم گیری مرتب کرنے کی اہم علمی و فقہی خدمت انجام دی۔ یعنی مولانا عبد الصمد حسینی صمدانی بارھویں صدی ہجری میں عہدِ اورنگ زیب عالم گیر کے وہ فقیہ نامور تھے، جو فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں باقاعدہ شامل تھے اور جنھوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنی تمام فقہی مساعی وقف کر دی تھیں[۱۱۸]

۱۰۵۔ مولانا عبد القادر گجراتی

مولانا عبد القادر بن عبد الغفور گجراتی کا لقب نواب محی الدولہ قادر یار خاں بہادر تھا۔

---

۱۱۷ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۵۳ ــــ عہدِ بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ (اردو ترجمہ تاریخ فرخ آباد)، ص ۲۲، ۲۳

۱۱۸ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۵۶، ۱۵۷۔ بحوالہ عزیز التواریخ ــــ برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ، ص ۳۱۲

فقہ اور اصولِ فقہ کے جید عالم تھے۔ سورت سے اورنگ آباد منتقل ہو گئے تھے، وہاں ایک مدت تک تکیہ شیخ محمود مسافر اورنگ آبادی میں مقیم رہے۔ پھر حیدر آباد کے نواب نظام علی خاں سے تقرب پیدا کیا جو اس زمانے میں علاقہ برار کے والی تھے۔ انھوں نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر فوج کے منصب قضا پر مامور کر دیا۔ اس کے بعد ۵ ربیع الاول ۱۱۸۲ھ کو جب خود نواب نظام علی خاں اپنے بھائی صلابت جنگ کی جگہ سربراہِ مملکت ہوا تو مولانا عبدالقادر گجراتی کو محکمۂ احتساب اور صدارتِ عظمیٰ پر فائز کیا۔ نیز "محی الدولہ قادر یار خاں بہادر" کے لقب سے سرفراز کیا۔ عرصہ تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ اس عالم و فقیہ نے غالباً ۱۱۸۸ھ کو وفات پائی، کیوں کہ ان کے بھائی حکیم جعفر کو اسی سال ان کے بعد منصب صدارت تفویض ہوا تھا۔[۱۹]

۱۰۶۔ شیخ عبدالقادر پٹنی مکّی

شیخ عبدالقادر پٹنی بن شیخ ابوبکر مفتیِ مکّہ معظمہ، شیخ محمد طاہر پٹنی کی اولاد سے تھے۔ فصاحت و بلاغت میں ممتاز، نامور فاضل اور مستند فقیہ تھے۔ تمام علوم کی تحصیل شیخ عبداللہ انصاری مکی شافعی سے کی۔ ان کی تصانیف میں چار جلدوں پر مشتمل فتاویٰ اور مجموعہ منشآت مشہور ہیں۔ ۱۱۸۳ھ میں انتقال ہوا۔[۲۰]

۱۰۷۔ شیخ عبدالقادر لاہوری

شیخ عبدالقادر بن عمر بن ہشام حسنی گیلانی لاہوری کی لاہور میں ولادت ہوئی۔ اور اسی شہر میں پلے بڑھے۔ اپنے ماموں شیخ اسماعیل بن قاسم اُچی لاہوری (متوفی ۱۱ ربیع الثانی ۱۱۴۱ھ) سے علمِ فقہ حاصل کیا۔ حدیث اور تفسیر کی تحصیل بھی انہی سے کی۔ شیخ

---

[۱۹] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۵۸۔ بحوالہ تزکِ محبوبی

[۲۰] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۸

عبدالرسول زنجانی لاہوری سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔ بعض علوم میں سید محمد بن علاء الدین حسینی لاہوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی، ان کا شمار مشائخ قادریہ میں ہوتا تھا، اس سلسلے کے متعدد حضرات نے ان سے استفاضہ کیا۔ کشف الاسرار الصغیر، کشف الاسرار الکبیر اور اسرار کتمانی ان کی تصنیفات ہیں ــــ ۲۸ ذی الحجہ ۱۱۵۴ھ کو وفات پائی[۱۲]

۱۰۸۔ سید عبدالکریم حسینی قنوجی

سید عبدالکریم بن محمد حسینی قنوجی، مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کے فاضل بزرگ تھے اور فقہ و اصول کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ اورنگ زیب نے ان کے علم و فضل کی وجہ سے انھیں برہان پور شہر کا جزیہ وصول کرنے پر مامور کر دیا تھا۔ یہ اہم خدمت انھوں نے بہترین طریقے سے انجام دی۔ پھر بادشاہ نے یہی خدمت علاقہ دکن میں بھی ان کے سپرد کی، چنانچہ وہ دکن کے چار اقطاع کی وصولیِ جزیہ پر مامور ہوئے۔ نہایت فاضل، نیک سیرت، کریم النفس، متدین، پاک باز اور متقی امیرِ مملکت تھے۔ اس منصب کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کی سرگرمیاں بھی جاری تھیں[۲۲]

۱۰۹۔ شیخ عبدالکریم صدیقی بلگرامی

شیخ عبدالکریم صدیقی بلگرامی اپنے وقت کے معروف اور جید عالم تھے۔ فقہ، اصول اور دیگر علومِ مروجہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ معقولات و منقولات کے ماہر تھے۔ مسلکاً حنفی تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ ابتدا میں قرآنِ مجید حفظ کیا، پھر بلگرام ہی کے علمائے کرام سے مختلف علوم و فنون کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سرگرم

---

[۱۲] خزینۃ الاصفیا، ص ۱۹۱، ۱۹۲ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵۹

[۲۲] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۱ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۰

درس وافادہ ہوئے۔ عربی ادبیات میں اس درجہ عبور حاصل تھا کہ مشہور درسی کتاب مقاماتِ حریری زبانی یاد تھی اور عربی انشاپردازی میں بہت تیز تھے۔ عمر کے آخری دور میں مقاماتِ حریری ہی کے انداز میں خود چند مقالے سپردِ قلم کیے اور فارسی میں مقامات کی شرح بھی لکھی۔ حدتِ فکر اور کتابوں پر عبور اور استحضار کا یہ عالم تھا کہ نامور استاد اور محقق شیخ طفیل محمد اترولوی (متوفی ۱۱۵۱ھ) کے لیے صرف تین دن میں معروف اور ادق درسی کتاب "شمسیہ" کی شرح تحریر فرمادی۔ عربی اور فارسی کا خط بڑا عمدہ تھا اور نہایت تیزی سے لکھتے تھے۔

بلگرام کے اس عالم وفقیہ نے بارھویں صدی ہجری کے آخر میں وفات پائی۔[۲۳]

۱۱۰۔ قاضی عبدالکریم کشمیری

قاضی عبدالکریم کشمیری کا مولد ومنشا کشمیر ہے۔ مفتی ابوالفتح کشمیری اور دیگر علما سے اخذِ علم کیا اور دیارِ کشمیر کے جلیل القدر شیخ اور عالم وفقیہ ہوئے۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی فوجی چھاؤنی میں گئے، وہاں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ پھر بادشاہ نے ان کو کشمیر کے منصبِ قضا سے سرفراز کیا، جس پر چوبیس سال مامور رہے۔ عالم گیر کے آخری ایامِ حکومت میں اس منصب سے علیحدہ ہوئے۔ منصبِ قضا کی انجام دہی میں نہایت محتاط تھے، ان کی عدالت میں کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو اس کے تمام پہلوؤں پر انتہائی غور کرتے اور صحیح فیصلے پر پہنچنے میں اللہ سے رو رو کر دعا کرتے۔ ان کی یہ پوری کوشش ہوتی کہ کسی مقام پر لغزشِ فہم کا شکار نہ ہو جائیں۔ بہت نیک، عابد وزاہد، صلاح وتقوے کے زیور سے آراستہ اور شب بیدار تھے۔[۲۴]

۲۳ھ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۲۱ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶۱

۲۴ھ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۱۵، ۱۱۶ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶۱ —— روضۃ الابرار، ص ۶۱

۱۱۱- مخدوم قاضی عبداللطیف ٹھٹھوی

مخدوم قاضی عبداللطیف بن عبدالرحمٰن بن محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی، حدیث، فقہ اور اصول کے ماہر تھے۔ ان کے والد شیخ عبدالرحمٰن بھی جیّد عالم تھے اور ان کا سلسلہ درس جاری تھا۔ بلند بخت بیٹے نے بھی افادہ علما و طلبا کو اپنا معمول ٹھہرایا اور والدِ مکرم اور جدِّ امجد کے مدرسے میں سرگرمِ تدریس ہوئے۔ ان کا معمول تھا کہ ہر روز نمازِ عصر کے بعد اپنی مسجد میں درسِ حدیث دیتے۔ ۱۱۰۷ھ کو محمد سرفراز خاں کے لشکر میں منصبِ قضا پر فائز ہوئے۔ جمعۃ المبارک کے دن لوگوں کو وعظ و نصیحت بھی کرتے تھے[۲۵]

۱۱۲- شیخ عبداللہ حسنی لاہوری

شیخ عبداللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن اسماعیل بن قاسم بن علی بن بدرالدین بن اسماعیل بن عبداللہ الشریف حسنی اچی لاہوری، مشہور علما و فقہا اور معروف اربابِ فضل و صلاح میں شمار ہوتے تھے۔ ہمیشہ تدریس و تلقین میں مشغول رہتے۔ اصحابِ ثروت اور امرا کے ہاں کبھی نہ جاتے۔ متوکل علی اللہ اور قانع عالمِ دین تھے۔ ۱۱ ربیع الثانی ۱۱۴۱ھ کو لاہور میں فوت ہوئے[۲۶]

۱۱۳- سیّد عبداللہ سندیلوی

سید عبداللہ بن زین العابدین حسینی سندیلوی، ہندوستان کے صوبہ یوپی کے قصبہ سندیلہ کے باشندے تھے۔ شیخ، عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ فقہ، اصول اور کلام کے ماہرین سے تھے۔ علامہ کمال الدین انصاری سہالوی ثم فتح پوری (متوفی ۱۴ محرم ۱۱۷۵ھ)

۲۵ھ تحفۃ الکرام، ص ۶۹۶، ۶۹۷ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶۲

۲۶ھ خزینۃ الاصفیا، ص ۱۸۷ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶۳

سے اخذِ علم کیا۔ کافی عرصہ ان کی صحبت و رفاقت میں گزارا۔ جب علوم مروجہ میں شمس بازغہ تک پہنچے تو ارضِ ہند کے مشہور عالم شیخ حمد اللہ سندیلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے، جو فلسفہ و منطق میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان ہی سے سندِ فراغت حاصل کی۔ پھر خود درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور طویل عرصے تک تشنگانِ علوم کو مستفید فرماتے رہے۔ بعدازاں (امیٹھی) یوپی کے نامور عالم شیخ عبدالباسط امیٹھوی (۱۱۶۶ھ) کے حلقۂ بیعت و ارادت میں شامل ہو گئے۔ یہ ان کا وہ دور تھا، جب کہ لوگوں سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ بڑے ذکی اور نیک عالمِ دین تھے۔ آخر عمر میں جنون وجذب کی کیفیت طاری ہو گئی تھی، اسی حالت میں فوت ہوئے[۲۷]۔

ان کے استاذ حمد اللہ سندیلوی

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سید عبداللہ حسینی سندیلوی کے استاذِ گرامی شیخ حمد اللہ سندیلوی کا تعارف بھی کرا دیا جائے، کیونکہ وہ اپنی معروف کتاب "حمد اللہ" کی وجہ سے جو ان کے نام کے ساتھ ہی معروف ہے، ہمارے مدارسِ دینیہ سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں ضلع ہردوئی کا ایک قدیم اور معروف قصبہ "سندیلہ" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ قصبہ لکھنؤ سے تیس میل کے فاصلے پر مراد آباد جانے والی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ مرقوم ہے کہ یہ قصبہ شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی (متوفی ۷۵۷ھ) کے ایک مرید اور خلیفہ مخدوم سید علاء الدین (۶۹۰ - ۷۶۴ھ) نے آباد کیا تھا۔ اس قصبے میں متعدد نامور اصحابِ علم اور اربابِ فضل پیدا ہوئے، جن میں بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم اور مولانا سید عبداللہ سندیلوی کے استاذِ گرامی شیخ حمد اللہ سندیلوی کا نامِ نامی خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہے۔ شیخ حمد اللہ بن شکر اللہ بن دانیال بن پیر محمد، نسباً صدیقی، مذہباً شیعہ اور مولد و مسکن کے لحاظ سے سندیلوی تھے۔ ان کا مدفن بھی سندیلہ

---

[۲۷] تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۰۳ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶۴

ہے۔ شیخ کمال الدین فتح پوری (متوفی ۱۴ محرم ۱۱۷۵ھ) اور فاضلِ اجل شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ) کے تلمیذ تھے۔ یوں تو تمام علومِ متداولہ میں عبور رکھتے تھے، لیکن فلسفہ و منطق اور علومِ حکمیہ میں خصوصیت سے یگانۂ روزگار تھے اور یہاں تک مہارت رکھتے تھے کہ اس سلسلے میں درجۂ امامت اور مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ ان علوم کی تدریس میں انھوں نے نہایت شہرت پائی اور بڑا نام پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ والیِ اودھ ابوالمنصور خاں نے ارضِ ہند کے مغل حکمران احمد شاہ سے ان کی سفارش کی اور بادشاہ نے انھیں فضل اللہ خاں کا لقب عطا کیا اور کافی جاگیر بھی دی۔ پھر انھوں نے اپنے آبائی قصبہ سندیلہ میں بہت بڑا مدرسہ قائم کیا۔

شیخ حمد اللہ نے متعدد علمی و فنی کتابوں پر بہترین حواشی و تعلیقات سپردِ قلم کیں، جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

حمد اللہ: یہ کتاب قاضی محب اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ) کی منطق کی مشہور کتاب سلم العلوم کی مفصل و بسیط شرح ہے۔ یہ شرح خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے، جو اس کے فاضل شارح "حمد اللہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے موضوع سے متعلق کتاب کی علمی افادیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ کتاب صدیوں سے برِصغیر پاک و ہند کے مدارسِ دینیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ علما و طلبا میں اس کتاب کو بے پناہ تلقی و قبولیت حاصل ہوئی۔

حواشی شمس البازغہ: شمس البازغہ، شیخ محمود جون پوری (متوفی ۱۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب ہے اور درسِ نظامیہ میں داخل ہے۔ اس کتاب کو اہلِ علم نے لائقِ اعتنا ٹھہرایا اور اس پر حواشی و تعلیقات لکھے۔ شیخ حمد اللہ نے بھی اس پر بہترین حواشی تحریر کیے۔

حاشیہ صدرا: قاضی محمد بن ابراہیم شیرازی، مشہور عالم تھے، صدر الدین ان کا لقب تھا۔ ہمارے مدارس میں ملا صدرا کے نام سے معروف ہیں۔ ۱۰۵۰ھ میں فوت ہوئے۔ بہت سی علمی و فنی کتابوں کے مصنّف اور محشّی تھے۔ انھوں نے ایک بہت

مشہور متن ہدایۃ الحکمۃ کی شرح بھی قلم بند کی، جس میں منطق اور طبیعیات الٰہیات کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ہدایۃ الحکمۃ کے مصنف اثیر الدین مفضل بن عمر ابہری (متوفی ۶ ھ) تھے، قاضی محمد بن ابراہیم شیرازی (صدر الدین) نے اس کی ایک مبسوط شرح لکھی، جو ان کے نام کی مناسبت سے "صدرا" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ کتاب داخلِ نصاب ہے۔ شیخ حمد اللہ سندیلوی نے اس (صدرا) کی شرح لکھی۔

شرح زبدۃ المقامات: شیخ محمد بن حسین بن عبد الصمد حارثی عاملی ہمدانی، ان کا لقب بہاء الدین تھا۔ مسلکاً شیعہ تھے۔ ۱۰۳۱ھ میں فوت ہوئے۔ بہت سی علمی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں بعض درسِ نظامیہ میں شامل ہیں۔ صرف بہائی بھی انہی کی تصنیف ہے۔ ان کی ایک تصنیف کا نام زبدۃ الاصول ہے۔ شیخ حمد اللہ سندیلوی نے اس کی بھی شرح قلم بند کی۔

بہر حال شیخ حمد اللہ دیارِ ہند کے بہت بڑے صاحبِ فضل و کمال اور محقق و مصنف اور مدرس تھے۔ بے شمار تشنگانِ علوم نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان کا سلسلۂ تدریس بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ۱۱۶۰ھ کو دہلی میں وفات پائی[۲۸]

۱۱۴- قاضی عبد اللہ گجراتی

قاضی عبد اللہ بن شریف گجراتی مسلکاً حنفی تھے۔ شیخ و فاضل اور فقہ و اصول کے جید عالم تھے۔ احمد آباد شہر کے قاضی تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کا بیٹا شاہ زادہ محمد اعظم گجرات کا والی ہو کر آیا تو اس نے ان کو عساکرِ شاہی کے منصبِ قضا پر متعین کر دیا۔ کافی عرصہ اس منصب پر مامور رہے۔ پھر خود سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ۱۰۹۵ھ کو قاضی ابو سعید گجراتی کی جگہ قضاء اکبر کا اعزاز بخشا اور ہندوستان کے قاضی القضاۃ مقرر

---

[۲۸] تذکرۂ علمائے ہند، ص ۵۲ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۷۴، ۷۵ ــــ تذکرۃ المصنفین درسِ نظامی، ص ۹۱ تا ۹۳ ــــ لباب المعارف العلمیہ، ص ۱۳۷، ۱۳۸، ۳۱۲ ــــ تراجم الفضلاء، ص ۸

مقرر کیے گئے۔ طویل مدت تک یہ خدمت ان کے سپرد رہی۔ پھر مسند صدارت تفویض کی گئی ـــــ ۱۱۰۹ھ کو مرض فالج میں مبتلا ہو کر دنیا کو خیر باد کہا۔ ان کے بعد قاضی محمد اکرم دہلوی (متوفی ۱۱۱۶ھ) جو دار الحکومت کے موروثی مفتی تھے، عساکر کی خدمتِ قضا پر مامور ہوئے۔[۲۹]

۱۱۵- مولانا عبداللہ امیٹھوی

شیخ وقت، عالم کبیر، مولانا عبداللہ امیٹھوی، فقہ، اصول اور علم کلام میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ) کے شاگرد تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود درس و تدریس میں مصروف ہو گئے تھے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ ارضِ ہند کے مشہور شیخ و عالم سید علم اللہ حسنی بریلوی کے بعض اخلاف بھی ان سے مستفید ہوئے۔ بادشاہِ دہلی احمد شاہ کے عہد میں وفات پائی۔[۳۰]

۱۱۶- مولانا سید عبداللہ بلگرامی

مولانا سید عبداللہ حسینی بلگرامی کی ولادت اور نشو و نما بلگرام میں ہوئی۔ قرآنِ مجید اور ابتدائی کتابیں اپنے قصبے بلگرام میں پڑھیں۔ پھر کھجنوُ کا عزم کیا جو یوپی میں دریائے گنگا کے کنارے ایک پرگنہ تھا۔ اس زمانے میں کھجنو کو علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور وہاں قاضی علیم اللہ کھجنوی (متوفی ۱۱۱۵ھ) کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور طویل عرصے تک ان سے مصروفِ استفادہ رہے۔ یہاں تک کہ مختلف علوم و فنون پر عبور حاصل کیا اور کبار فقہائے حنفیہ میں گردانے گئے۔ کتابت میں بھی مہارت پیدا کی اور سات قسم کے رسوم الخط سیکھے۔ فنونِ حرب کی تربیت بھی حاصل

---

۲۹ مآثر عالم گیری، ص ۳۶۹ ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶۵

۳۰ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶۶ بحوالہ رسالہ قطبیہ

کی۔ بعدازاں نواب سربلند خاں کے دربار میں پہنچے، اس نے پہلے محکمہ فوج میں پھر ۱۱۲۴ھ میں احمد آباد کے منصبِ صدارت پر مامور کیا۔ وہیں علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی کے نواسے شاہ اسد اللہ علوی سے شرح المواقف پڑھی اور شیخ قوام الدین گجراتی سے ہدایۃ الفقہ کا باقاعدہ درس لیا۔ وہیں علاقہ گجرات کے جلیل القدر عالم اور نامور فاضل شیخ نور الدین احمد آبادی (متوفی ۹ شعبان ۱۱۵۵ھ) سے رابطہ پیدا ہوا۔ مآثر الکرام کی روایت کے مطابق شاہ اسد اللہ علوی سے مولانا سید عبداللہ نے یہ بھی کہا کہ محمد اعظم شاہ کے عہدِ حکومت میں ایک فاضل سے ایک تقریبِ ضیافت میں علمی مباحثہ ہوگیا لیکن انھوں نے بات غصے اور رنج تک پہنچادی۔ یہاں مباحثہ نہیں ہونا چاہیے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ یہ لفظ آپ نے کیوں کہے، علمی بحثیں ہونی چاہئیں۔ ان کا مطلب غم وغصہ نہیں بلکہ افادہ و استفادہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد سید صاحب شاہ صاحب کے گھر گئے اور علمی مباحث کا سلسلہ شروع ہوا، جس سے خود شاہ صاحب بھی اور حاضرینِ مجلس بہت محظوظ ہوئے۔

مولانا سید عبداللہ بلگرامی کو دہلی میں استسقا کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ اسی حالت میں انھیں بلگرام لایا گیا، انھوں نے ۱۱۳۲ھ کو بلگرام میں وفات پائی۔[۳۱]

۱۱۷۔ مولانا عبدالمقتدر بہاری

مولانا عبدالمقتدر بن عبدالنبی بہاری، علومِ حدیث وفقہ میں مرتبۂ کمال پر فائز تھے اور اپنے عصر کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کے والد مولانا عبدالنبی بہاری بھی صاحبِ فضل وکمال تھے۔ لائق بیٹے نے والدِ مکرم سے علم حاصل کیا، حدیث بھی نہی سے پڑھی۔[۳۲]

---

۳۱ مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۳۷، ۲۳۸ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶۶، ۱۶۷

۳۲ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶۹

۱۱۸۔ مفتی عبدالمومن کشمیری

مفتی عبدالمومن بن احسن اللہ کشمیری، حنفی المسلک تھے، شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ مولانا عبداللہ بن محمد فاضل کشمیری (متوفی شوال ۱۱۷۱ھ) اور شیخ عبدالسلام کشمیری (متوفی ۸ شوال ۱۱۷۱ھ) سے حصولِ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کریم داد خاں کے عہد میں کشمیر کی مسندِ افتا پر فائز ہوئے۔ ۱۱۹۷ھ کو وفات پائی ۳۳ھ

۱۱۹۔ قاضی عبدالنبی عثمانی احمدنگری

قاضی عبدالنبی بن عبدالرسول بن ابو محمد بن عبدالوارث عثمانی احمد نگری، دیارِ ہند کے شیخ و فاضل اور مشہور عالمِ دین تھے۔ احمد نگر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ ان کے والد شیخ عبدالرسول عثمانی گجراتی (متوفی ۱۹ شوال ۱۱۳۰ھ) اپنے دَور کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ لائق بیٹے نے مختصرات باپ ہی سے پڑھیں۔ باپ کی وفات کے بعد شیخ عبداللہ احمد نگری اور سید بخش حسینی کرمانی خیر آبادی سے اخذِ علم کیا۔ پھر گجرات گئے اور حاشیہ قدیمہ وغیرہ کتبِ درسیہ شیخ قطب الدین عثمانی گجراتی سے اور اکثر کتبِ درسیہ شیخ محمد محسن بن عبدالرحمٰن صدیقی گجراتی سے پڑھیں اور کافی عرصے تک ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ علمِ نحو اور منطق میں اپنے تمام ابنائے عصر سے فوقیت لے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد احمد نگر کے عہدۂ قضا پر مامور ہوئے، ساتھ ہی درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور خلقِ کثیر کو مستفید فرمایا۔

قاضی عبدالنبی عثمانی احمد نگری کو تصنیف و تالیف سے بھی گہرا تعلق تھا اور وہ اپنے دَور کے کثیر التصانیف عالمِ دین تھے۔ ان کی تصانیف و شروح کی تفصیل درج ذیل ہے:

۳۳ھ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۶۹، ۔۔۔ روضۃ الابرار، ص ۶۹

جامع الغموض و منبع الفیوض : یہ علم نحو کی معروف کتاب کافیہ ابن حاجب کی ایک مبسوط شرح ہے - کتاب فارسی زبان میں ہے جو فاضل مصنف نے ۱۱۴۴ھ میں علاقہ گجرات کے شہر احمد نگر میں لکھی -

دستور العلما : یہ علوم و فنون کی اصطلاحات میں چار مجلدات پر مشتمل ہے -

یزدی کی شرح تہذیب پر مبسوط و مفصل حاشیہ -

میر زاہد ملا جلال پر حاشیہ -

علم صرف کی مشہور درسی کتاب ، دستور المبتدی پر حاشیہ -

عاملی کی خلاصۃ الحساب پر حاشیہ -

اصول الحسامی پر حاشیہ

علم معانی و بیان کی مشہور کتاب مطول پر حاشیہ -

علامہ سعد الدین تفتازانی کی شرح العقائد پر حاشیہ -

حاشیہ الخیالی علیٰ شرح العقائد -

علامہ محمد رشید عثمانی جون پوری کی علم مناظرہ و بحث کی کتاب ، رشیدیہ پر حاشیہ -

اسی موضوع سے متعلق ایک اور کتاب شریفیہ پر حاشیہ -

سیف المبتدین فی قتل المفرورین -

بہر حال قاضی عبد النبی عثمانی احمد نگری بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر ہندی عالم و فقیہ تھے اور علوم متداولہ کے ہر گوشے پر عمیق نظر رکھتے تھے [۳۴]

۱۲۰ - مولانا عبد الولی طرخانی کشمیری

مولانا عبد الولی طرخانی کشمیری ، عالم حدیث اور فقیہ و شیخ تھے - بہت نیک اور متدین تھے - علاقہ ترکستان کے ایک شہر "طرخان" میں پیدا ہوئے اور اپنے علاقے کے

---

۳۴ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۳۵ —— نزہۃ الخواطر - ج ۶ ، ص ۱۷۲ ، ۱۷۳

علما سے اخذِ علم کیا۔ پھر طرخان ہی سے حجاز تشریف لے گئے اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ وہاں صحاح ستہ کے محشی و شارح شیخ ابوالحسن سندھی مدنی سرگرمِ تدریسِ حدیث تھے۔ ان کے مدرسہ دارالشفا میں داخل ہوئے۔ ان سے علمِ حدیث اور تفسیر کا درس لیا اور سند و اجازہ سے بہرہ مند ہوئے۔ ارضِ حجاز سے ہندوستان آئے اور کشمیر میں سکونت اختیار کی۔ بارھویں صدی ہجری کے اس نامور عالمِ ربانی نے کشمیر میں درس و تدریس کا غلغلہ بلند کیا اور تفسیر و حدیث کی اشاعت کی۔

اس عالم و فقیہ سے مفتی قوام الدین محمد کشمیری (متوفی ۹ ذی قعدہ ۱۲۱۹ھ) اور خلقِ کثیر نے اخذِ علم کیا۔

یاد رہے، مولانا عبدالولی چوں کہ طرخان میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے تھے، اس لیے طرخانی کہلائے، اور پھر کشمیر کو اپنا مسکن ٹھہرالیا تھا، لہٰذا کشمیری مشہور ہوئے۔ اس جلیل القدر عالم نے ۱۱۷۱ھ کو جامِ شہادت نوش کیا۔[۳۵]

۱۲۱- میر سید عبدالوہاب منور آبادی

میر سید عبدالوہاب بن ہاشم حسینی منور آبادی خطۂ کشمیر کے باشندے تھے۔ عالمِ باعمل، فقیہِ کامل اور متورع و متقی تھے۔ مسلکاً حنفی تھے اور ان کا شمار کبار فقہائے ہند میں ہوتا تھا۔ تمام عمر قرآن و حدیث کی تدریس اور تحقیقِ مسائل میں مصروف رہے۔ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ اور اخذِ علم کیا۔ اسّی سال سے زائد عمر پاکر ۱۱۵۲ھ کو اچھی صحت میں رحلت فرمائی۔[۳۶]

---

[۳۵] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۳۷ —— نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۱۷۴ —— حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۵ — روضۃ الابرار، ص ۱۷

[۳۶] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۳۸ —— نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۱۷۴، ۱۷۵ —— حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۳ —— تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۵ —— روضۃ الابرار، ص ۶۲

۱۲۲- شیخ عتیق اللہ جالندھری

شیخ عتیق اللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عتیق اللہ بن فاضل بن مصطفیٰ بن عثمان بن اللہ بخش بن قاسم بن اسماعیل بن ابراہیم حسینی بلخی سرہندی ثم جالندھری۔

شیخ عتیق اللہ کا سلسلۂ نسب حضرت زید بن علی بن حسین سے ملتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد بلخ کے رہنے والے تھے، بعد میں واردِ ہند ہوئے اور پنجاب کے شہر جالندھر کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ شیخ ممدوح کا مولد و منشا جالندھر ہے، انھوں نے مختلف علمائے عظام سے تحصیل کی اور فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے ماہرین میں شمار ہوئے۔ تصوف و طریقت کا جذبہ موج زن ہوا تو شیخ ابوالمعالی بن محمد اشرف حسینی انبیٹھوی (متوفی ۱۱۱۶ھ) کی خدمت میں حاضری دی جو ضلع سہارن پور کے قریہ انبیٹھہ کے باشندے تھے اور ہندوستان کے مشاہیر مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔

شیخ عتیق اللہ حسینی جالندھری نے ماہِ شعبان ۱۱۳۱ھ میں وفات پائی۔[۳۷]

۱۲۳- قاضی عثمان احمد عثمانی بلگرامی

قاضی عثمان احمد بن قاضی احسان اللہ عثمانی بلگرامی، اصحابِ فضل و صلاح اور اربابِ خیر و معروف میں سے تھے۔ عالم و شیخ اور نامور فقیہ تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما کی منزلیں طے کیں۔ ابھی چار سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ میر محمد بن محمد فاضل حسینی قنوجی کے حلقۂ درس میں داخل کر دیے گئے۔ کچھ بڑے ہوئے تو عازمِ سندیلہ ہوئے، وہاں مولانا عبداللہ بن زین العابدین حسینی سندیلوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور بعض کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ بعض کتابیں ایک اور بزرگ دین محمد بن وجیہ الدین سندیلوی سے پڑھیں۔ وہاں سے

---

[۳۷] خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۴۹۴ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۷۷

ملاوہ کا قصد کیا، جہاں شیخ محمد عظیم ملانوی بن کفایت اللہ فاروقی گوپاموی ثم ملانوی (متوفی بعد ۱۱۰۰ھ) سرگرم درس و افادہ تھے، ان سے کتب درسیہ میں سے مطولات کی تکمیل کی۔ مثلاً تفسیر بیضاوی اور صحیحین ان ہی سے پڑھیں اور ان ہی سے سندِ حدیث لی۔ بعد ازاں اپنے وطن بلگرام تشریف لے گئے۔[۳۸]

۱۲۴۔ قاضی عصمت اللہ فاروقی لکھنوی

قاضی عصمت اللہ فاروقی لکھنوی، قاضی عبد القادر فاروقی لکھنوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب اٹھارہ واسطوں سے مشہور بزرگ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ قاضی عصمت اللہ لکھنوی ارضِ ہند کے بڑے فاضل بزرگ تھے۔ علمِ فقہ پر کامل عبور رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں پرورش پائی۔ اپنے والدِ مکرم قاضی عبد القادر فاروقی لکھنوی (متوفی ۲۷ شعبان ۱۰۷۰ھ) اور مفتی وجیہ الدین گوپاموی (متوفی ۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۸۳ھ) سے جو مرتبینِ فتاویٰ عالم گیری میں شامل تھے، علم حاصل کیا۔ طریقت و سلوک کی منزلیں شیخ پیر محمد سلونی (متوفی ۲۲ محرم ۱۰۹۹ھ) سے طے کیں۔ پھر بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر سے منسلک ہو گئے، اس نے ان کو مراد آباد کا والی مقرر کر دیا۔ خاصی مدت اس منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں مختلف شہروں میں آنا جانا رہا۔

قاضی ممدوح ایک صاحبِ ثروت اور امیر عالمِ دین تھے۔ نہایت سخی، ایثار پیشہ اور مستحقین پر مال و دولت خرچ کرنے والے تھے۔ علما و مشائخ کا اس درجہ خیال رکھتے کہ ان کو خراجی زمینوں سے ایک لاکھ کاشت کار دیے، جن کے ساتھ کثیر تعداد میں مویشی بھی تھے۔ نیز اپنی جاگیروں سے سات گاؤں عطا کیے۔ طلبا سے تعلقِ خاطر کا یہ عالم تھا کہ روزانہ دو سو طلبا کو کھانا کھلاتے اور رمضان المبارک میں روزانہ ایک ہزار اشخاص

---

[۳۸] مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۸۵، ۲۸۶ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۱۷۷ ــــ

کو اپنے ذاتی لنگر سے کھانا مہیا کرتے —— علمِ فقہ اور اس کی جزئیات و فروع پر عبور کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مرتبین فتاویٰ عالم گیری کی عظیم القدر جماعت میں شامل تھے۔ حافظِ قرآن اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔

قاضی عصمت اللہ لکھنوی کی وفات ساحلِ نربدہ پر ۱۲ ر رجب ۱۱۱۳ھ کو اس وقت ہوئی جب وہ بلادِ دکن سے لوٹ رہے تھے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۶۷ سال تھی۔

تذکرہ علمائے ہند کی روایت کے مطابق ہفتے کی رات ۲ رجب ۱۱۱۳ھ کو دکن کے راستے میں موضع بربندہ میں وفات پائی اور جمعہ کے روز ۱۷ شوال ۱۱۱۳ھ کو لکھنؤ کے قریب بھدانوہ میں دفن کیے گئے ۳۹؎

۱۲۵- شیخ عصمت اللہ سہارن پوری

شیخ عصمت اللہ بن محمد اعظم بن عبدالرسول سہارن پوری، مسلکاً حنفی تھے۔ عالمِ کبیر، فاضلِ اجل اور ہندوستان کے نامور محقق تھے۔ سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں نشو و نما پائی۔ دیارِ ہند کے مختلف اساتذہ سے علم حاصل کیا اور فقہ، اصول، فروع، معانی، بیان، ہیئت، ہندسہ، ریاضی اور تمام علومِ عربیہ میں مہارت پیدا کی۔ یہ وہ ہندی عالم ہیں، جن کی چشمِ بصارت غائب تھی لیکن چشمِ بصیرت نہایت تیز اور روشن تھی۔ ذہن اور دماغ کے تمام گوشے منوّر تھے۔ کتابوں پر استحضار کا یہ عالم تھا کہ نابینا ہونے کے باوجود طلبا کو درس دیتے، علما کو مستفید فرماتے، مشکل ترین موضوع پر کتابیں تصنیف کرتے، کتب درسیہ کی شرحیں سپردِ قلم کرتے اور باقاعدہ فتوے دیتے۔ یعنی وہ بیک وقت عالم، فقیہ، مدرس، مصنف، مفتی سب کچھ تھے۔ تصنیفات و شروح درجِ ذیل ہیں:

۳۹؎ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۰ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۷۹، ۱۸۰ —— برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ، ص ۳۱۳ تا ۳۱۶

حاشیہ شرح جامی : مولانا عبدالرحمٰن جامی نے علم نحو کی انتہائی کتاب کافیہ کی جو ابن حاجب کی تصنیف ہے، فوائد ضیائیہ کے نام سے شرح لکھی۔ یہ شرح بڑی مفصل اور مبسوط ہے اور شرح جامی کے نام سے مشہور ہے۔ مدارسِ دینیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ مولانا عصمت اللہ سہارن پوری نے شرح جامی پر حواشی تحریر کیے۔

شرح تشریح الافلاک : محمد بن حسین بن عبدالصمد حارثی عاملی ہمدانی، اپنے لقب بہاء الدین سے معروف تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں بعض کتابیں داخلِ نصاب ہیں۔ علمِ صرف کی صرف بہائی اور علم ہیئت کی تشریح الافلاک ان ہی کی تصانیف ہیں۔ انھوں نے ۱۰۳۱ھ کو اصفہان میں وفات پائی۔ مولانا عصمت اللہ سہارن پوری نے تشریح الافلاک کی نہایت عمدہ اور بسیط شرح لکھی۔

شرح خلاصۃ الحساب : علمِ ریاضی میں بھی خلاصۃ الحساب کے نام سے تشریح الافلاک کے مصنفِ شہیر بہاء الدین عاملی نے ایک کتاب تصنیف کی ہے، مولانا سہارن پوری اس کی بھی بہترین شرح ضبط تحریر میں لائے۔ یہ علمی کام انھوں نے ۱۰۸۶ھ میں مکمل کیا۔

رسالہ حرمۃ الغناء والمزامیر : یہ رسالہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے: سبحانك اللھم ارنا حقائق الاشیاء کما ھی، ولا تجعلنا من الناس من یشتری لھو الحدیث و الملاھی۔ یہ ان کی ۱۰۸۹ھ کی تصنیف ہے، اور ایک مقدمہ، سات فصول اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ غنا کے معنی اور مسئلہ زیرِ بحث کی تعیین کو محیط ہے۔ اس سے آگے فصل اوّل میں وہ آیاتِ قرآنی مندرج ہیں جو غنا اور مزامیر کی حرمت پر دلالت کناں ہیں۔ فصل ثانی میں وہ احادیث منقول ہیں جو اس کی حرمت پر دال ہیں۔ فصلِ ثالث ان اقوالِ مجتہدین کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو اس کی حرمت میں وارد ہیں۔ فصل رابع حرمتِ غنا و مزامیر میں صوفیا کے اقوال کو گھیرے ہوئے ہے۔ فصل خامس حرمتِ رقص سے متعلق ہے۔ فصل سادس میں ان احادیث کی محدثانہ نقطۂ نظر سے وضاحت کی ہے، جن سے غنا و مزامیر اور رقص و سرود کو مباح قرار دینے والے لوگ استدلال کرتے ہیں۔ فصل سابع میں یہ مرقوم ہے کہ صوفیا میں اباحتِ غنا کی شہرت

کے اصل اسباب کیا ہیں۔ خاتمہ کتاب میں اہلِ غنا و رقص کے موقف کی شریعت کی روشنی میں تردید کے بعد حقائق کی روشنی میں تردید کی گئی ہے۔

رقیب باب المعروف والمنکر: یہ کتاب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق ہے۔ آغاز، الحمد للّٰہ الذی یأمرنا بالعدل والاحسان کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ سنِ تالیف ۱۰۹۱ھ ہے۔ کتاب ایک مقدمہ، چند فصلوں اور خاتمہ پر محتوی ہے۔ مقدمۂ کتاب میں امر اور نہی کی اصل تعریف بیان کی گئی ہے۔ فصولِ کتاب میں فاضل مصنف نے پہلے تو وہ آیات و احادیث نقل کی ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر امر اور نہی کے ارکان و فرائض بیان کیے ہیں۔ بعد ازاں ان لوگوں کو ہدفِ تنقید و تردید ٹھہرایا ہے جو امر اور نہی کے سلسلے میں لوگوں سے تعرض نہیں کرتے اور ان سے سختی سے پیش نہیں آتے۔ اس سے آگے امرا و سلاطین کو معروف کا حکم دینے کا بیان ہے۔ پھر ولایت و حکومت اور اس کی شرائط کی صراحت ہے۔ خاتمہ کتاب میں خلفائے راشدین اور دیگر زعمائے اسلام کی سیرت کا تذکرہ ہے۔

شیخ عصمت اللہ سہارن پوری نے ۱۱۳۳ھ میں وفات پائی۔[۴۰]

شیخ عصمت اللہ سہارن پوری کے حالات کے سلسلے میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مآثر الکرام[۴۱] اور سبحۃ المرجان[۴۲] میں میر غلام علی آزاد بلگرامی نے، ابجد العلوم[۴۳] میں نواب صدیق حسن خاں نے، قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب[۴۴] میں مولوی ذوالفقار احمد نے، تذکرہ علمائے ہند[۴۵] میں رحمان علی نے اور حدائق الحنفیہ[۴۶] میں مولوی فقیر محمد جہلمی نے شیخ عصمت اللہ سہارن پوری کا سالِ وفات ۱۰۳۹ھ لکھا ہے۔ یعنی انھیں گیارھویں

---

۴۰ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۸۰۔۱۸۱ بحوالہ تبصرۃ الناظرین از محمد بن عبدالجلیل بلگرامی

۴۱ دیکھیے، ص ۱۹۴ — ۴۲ ص ۵۲ — ۴۳ ص ۹۰۰

۴۴ ص ۱۹۷ — ۴۵ ص ۱۴۰ — ۴۶ ص ۴۰۷

صدی ہجری کے علما میں شمار کیا ہے۔ صرف صاحبِ نزہۃ الخواطر علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نے ان کو بارھویں صدی ہجری کے ہندی علما کی فہرست میں تحریر کیا ہے اور سنِ وفات ۱۱۳۳ھ لکھا ہے[۱۴۷] علامہ عبدالحی حسنی کا ماخذ سید محمد بن سید عبدالجلیل حسینی بلگرامی (متوفی ۱۱۸۵ھ) کی تصنیف تبصرۃ الناظرین ہے۔ جبکہ باقی سب تذکرہ نگاروں کا ماخذ میر غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) کی مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان ہیں۔ ہمارے خیال میں علامہ عبدالحی حسنی کا موقف صحیح ہے، کیونکہ تبصرۃ الناظرین غالباً قلمی کتاب ہے اور شیخ عصمت اللہ سہارن پوری کے قریبی معاصر کی تصنیف ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تبصرۃ الناظرین نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانے کی کتاب ہوگی اور یہ تمام کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کی تحویل میں چلا گیا تھا، صاحبِ نزہۃ الخواطر نے شیخ سہارن پوری کے بارے میں اسی سے معلومات اخذ کیے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے شیخ ممدوح کے بارے میں جو تفصیلات درج کی ہیں، وہ کسی اور تذکرہ نگار نے بیان نہیں کیں۔

یہاں یہ سوال ذہن میں ابھر سکتا ہے کہ اگر تبصرۃ الناظرین نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے کتب خانے کی کتاب ہے تو خود نواب صاحب نے ابجد العلوم میں شیخ سہارن پوری کا سنِ وفات ۱۰۳۹ھ کیوں رقم فرمایا ہے، تو اس بارے میں یہ عرض ہے کہ ممکن ہے، ان کی نظر اس پر نہ پڑی ہو، اور انھوں نے مآثر الکرام ہی کو پیشِ نگاہ رکھا ہو۔ لیکن نزہۃ الخواطر کے مصنفِ شہیر نے ان مصنفینِ گرامی کے تسامح کی نشان دہی نہیں کی معلوم نہیں۔ کیوں۔؟ واللہ اعلم بالصواب۔

۱۲۶- شیخ عطاء اللہ دہلوی

شیخ عطاء اللہ بن حسن حسینی نارنولی ثم دہلوی، عالم و فقیہ اور مشاہیر مشائخ میں سے تھے۔ اصلاً نارنول کے رہنے والے تھے، اس لیے نارنولی کہلائے، لیکن ان کے والدِ گرامی

---

[۱۴۷] ملاحظہ ہو: نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۸۰، ۱۸۱

سیّد حسن رسول نما (متوفی ۲۲ شعبان ۱۱۰۳ھ) نارنول سے دہلی منتقل ہو گئے تھے اور وہیں گھر بنا لیا تھا، شیخ عطاء اللہ ممدوح ان کے تیسرے بیٹے تھے۔ دہلی میں سکونت کی وجہ سے دہلوی مشہور ہوئے۔[۴۵]

۱۲۷۔ شیخ علی اصغر قنوجی

شیخ علی اصغر بن عبد الصمد بکری کرمانی قنوجی، عالم کبیر اور شیخ وقت تھے۔ الفصول العمادیہ کے فاضل مصنف شیخ عماد الدین کرمانی کی اولاد سے تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، صرف و نحو اور علمِ بیان و معانی میں وحید العصر اور فرید الدہر تھے۔ تصوف و سلوک سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ ۱۰۵۱ھ کو قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ علومِ درسیہ اور فنونِ متداولہ کی تحصیل سید محمد قنوجی (متوفی ۱۱۰۱ھ) سے کی، جو اس زمانے میں قنوج میں سرگرمِ درس و افادہ تھے۔ شیخ عصمت اللہ سہارن پوری (متوفی ۱۱۳۳ھ) کی خدمت میں بھی گئے، ان سے متوسطات و مطولات کی تکمیل کی۔ ان کے علاوہ اور بھی مختلف علمائے کرام سے استفادہ کیا اور علم و فضل کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ ان کے اساتذہ کی فہرست میں شیخ لطف اللہ کوروی، مولانا محمد زمان کاکوروی اور نواب دیانت خاں ایسے رفیع المرتبت علما کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ تصوف و طریقت میں لکھنؤ جا کر پیر محمد لکھنوی سے استفاضہ کیا۔ پھر اپنے وطن قنوج کو مراجعت کی۔ یہ وہ عالم و فقیہ ہیں جو تمام علائقِ دنیا سے منقطع ہو کر علما و طلبا کو پورے ساٹھ سال تک علومِ مروجہ پڑھاتے رہے۔ اس طویل مدت میں بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ قرآنِ مجید پر گہری نظر تھی۔ ثواقب التنزیل کے نام سے تفسیر جلالین کے انداز پر ایک تفسیر بھی لکھی۔ یہ اُن کی عمر کے آخری دَور کی تصنیف ہے۔ اس سے پہلے تصوف و سلوک کے بارے میں بھی کچھ تصنیفات کیں

---

[۴۵] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۸۲ بحوالہ بحرِ ذخار

اور اس موضوع کی بعض کتابوں پر حواشی و تعلیقات بھی سپردِ قلم کیے۔ برصغیر پاک و ہند کے یہ عالم و فقیہ تادمِ واپسیں مصروفِ تدریس رہے۔

ان کے حالات میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان کے بعض آبا و اجداد مدینہ منورہ سے کرمان آئے اور وہاں سے ان میں کے ایک بزرگ شیخ مبارک بن عماد الدین واردِ ہند ہوئے اور قنوج میں توطن اختیار کیا۔

شیخ علی اصغر قنوجی نے ۱۵ شعبان ۱۱۴۰ھ کو وفات پائی[۴۹]۔

۱۲۸۔ مفتی علیم اللہ گوپاموی

مفتی علیم اللہ بن عبید اللہ بن عیسیٰ بن آدم شہابی صدیقی گوپاموی کا شمار ارضِ ہند کے علمائے اعلام میں ہوتا تھا، اپنے دَور کے شیخ اور فقیہ تھے۔ ان کے والد مفتی عبید اللہ بھی اپنے علاقے کے جلیل القدر عالم تھے اور صوبہ یوپی کے شہر گوپامئو کی مسند افتا پر فائز تھے۔ والد کی وفات کے بعد لائق بیٹے (مفتی علیم اللہ گوپاموی) کو اس شہر کا مفتی مقرر کیا گیا ——— ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۰۳ھ کو فوت ہوئے[۵۰]۔

۱۲۹۔ سید عنایت اللہ بلگرامی

سید عنایت اللہ بن سید عبد الستار بن حاتم بن بدر الدین حسینی واسطی بلگرامی بہت بڑے فقیہ، جلیل القدر عالم دین اور اپنے دَور کے بے نظیر طبیب تھے۔ نہایت ذہین،

---

[۴۹] مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۳۹، ۲۴۰ (بضمن ترجمہ قاضی علیم اللہ کھندوی) ——— ابجد العلوم، ص ۹۳۰، ۹۳۱ ——— خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۳۶۸ ——— تقصار جنود الاحرار، ص ۱۸۹ ——— ہدیۃ العارفین۔ ج ۱، ص ۷۶۶ ——— حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۸ ——— تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۱، ۱۴۲ ——— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۸۷

[۵۰] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۹۱

بلند فکر اور طباع تھے۔ ابتدا میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اس وقت بلگرام میں میر سید اسماعیل بن سید قطب عالم حسینی بلگرامی (متوفی ۴ شوال ۱۰۸۸ھ) کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں داخل ہو گئے۔ سید اسماعیل سے تمام درسی کتابیں باقاعدہ پڑھیں اور خوب علمی تربیت حاصل کی۔ یوں تو تمام علومِ مروّجہ میں درجۂ کمال پر فائز تھے، لیکن فقہ اور طب میں بالخصوص بہت مشہور تھے اور اس میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ استخراجِ مسائل فقہیہ میں جماعت علما میں منفرد حیثیت کے حامل تھے۔ ان کے عہد کے تمام اصحابِ فتویٰ فقہ و اصول میں ان کے تفوق کو مانتے اور ان کی بالادستی کے معترف تھے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے ہر وقت مطالعۂ کتب میں مصروف رہتے۔ مطالعۂ کتب، افتا نویسی اور طبابت ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا اور اس میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اس عہد میں فتویٰ نویسی کا سلسلہ ان پر ختم تھا۔ یہ اس باب میں سب سے آگے تھے —— بلگرام کے اس بلند مرتبہ عالم و فقیہ نے ۱۱۲۰ھ کو وفات پائی [۵۱]

۱۳۰۔ شیخ عنایت اللہ سندھی

شیخ عنایت اللہ بن فضل اللہ ٹھٹھوی سندھی، عالمِ کبیر اور فقیہ نامدار تھے۔ معقولات و منقولات کے ماہر تھے۔ مولانا احمد بن اسحاق ٹھٹھوی کے شاگرد تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسندِ تدریس بچھائی۔ ان کے شاگردوں میں مولانا ضیاء الدین بن ابراہیم ٹھٹھوی، شیخ محمد معین بن محمد امین سندھی مصنفِ "دراسات اللبیب"، اور علما کی بڑی جماعت شامل ہے —— ۱۱۴۴ھ کو سرزمینِ سندھ میں فوت ہوئے [۵۲]

۱۳۱۔ سید عنایت اللہ بالاپوری

سید عنایت اللہ بن محمد اللہ داد بن موسیٰ بن ظہیر الدین حسینی خجندی بالاپوری، شیخ اور

---

[۵۱] مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۳۳ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶ ص ۱۹۳

[۵۲] تحفۃ الکرام، ص ۶۸۷ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۹۳، ۱۹۴

عالم وفقیہ تھے۔ مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے۔ شیخ ابو المظفر نقشبندی برہان پوری (متوفی تقریباً ۱۱۰۸ھ) اور شیخ محمد معصوم بن شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی (متوفی ۹ ربیع الاوّل ۱۰۷۹ھ) سے اخذِ طریقت کیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے مشہور شہر برہان پور سے چار میل کے فاصلے پر بالا پور کے مقام کو اپنا مسکن ٹھہرا لیا اور صدق وعفاف، توکل واستغنا اور لوگوں سے منقطع ہو کر عبادتِ الٰہی اور افادۂ عوام میں مشغول ہو گئے۔ بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ واستفاضہ کیا۔ نوافل وادعیہ سے متعلق عنایۃ الواصلین کے نام سے ان کی ایک تصنیف بھی ہے ــــــ ۱۱۱۷ھ میں فوت ہوئے[۵۳]

۱۳۲- شیخ عنایت اللہ شال کشمیری

شیخ عنایت اللہ شال کشمیری سرزمینِ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ نامور علمائے کشمیر سے اکتسابِ علم کیا، جن میں مولانا ابو الفتح کشمیری اور مولانا عبد الرشید کشمیری شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ حیدر بن فیروز چرخی کشمیری کے فرزندِ گرامی سے بھی استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ کم عمری ہی میں معقول ومنقول کے ماہر ہوئے، بالخصوص حدیث اور فقہ میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شغف ومحبت کا یہ عالم تھا کہ چھتیس[۳۶] مرتبہ طلبائے علم کو صحیح بخاری پڑھائی۔ مثنوی مولانا روم نہایت ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے اور علم وفضل میں اپنے اقران ومعاصرین سے فائق تر تھے۔ اچھے شاعر بھی تھے اور صوفیانہ انداز کے شعر کہتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ صبغت اللہ سرہندی (متوفی ۹ ربیع الاوّل ۱۱۲۱ھ) سے اخذِ طریقت کیا تھا۔ سخت قسم کے موحد تھے اور توحید میں بہ سختی اپنے مرشد شیخ صبغت اللہ سرہندی کی صحبت وارشاد کا نتیجہ تھی۔

---

۵۳ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۹۴ + ـــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۲ ـــــ

مجبوب ذی المنن، حصہ اول، ص ۱۱۳

ارضِ کشمیر کے اس ممتاز عالم وفقیہ نے ارسٹھ ۶۸ سال کی عمر پاکر ماہِ شعبان ۱۱۲۵ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا[۵۴]

۱۳۳۔ شیخ عنایت اللہ قادری لاہوری قصوری

شیخ عنایت اللہ حنفی لاہوری قصوری، ان کی کنیت ابو المعارف تھی۔ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم اور نامور فقیہ تھے۔ کئی کتابوں کے مصنّف تھے، جن میں فقہ کی مشہور درسی کتاب شرح وقایہ پر ایک مفصل وبسیط حاشیہ بھی ہے۔ یہ حاشیہ دو جلدوں میں ہے اور "غایۃ الحواشی" کے نام سے موسوم ہے۔ مولانا عبد الحی لکھنوی فرنگی محلی نے اپنی کتاب "عمدۃ الرعایہ" کے مقدمہ میں جو شرح وقایہ کا حاشیہ ہے، غایۃ الحواشی کا ذکر کیا ہے اور اس کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے غایۃ الحواشی کا مطالعہ کیا ہے، جو دو جلدوں میں مشتمل ہے اور بہت سے مسائل کو محیط ہے۔ اس کے علاوہ شیخ عنایت اللہ لاہوری کنز الدقائق کی بھی ایک مبسوط شرح ضبطِ تحریر میں لائے، جس کا نام "ملتقط الحقائق" رکھا، اس میں انھوں نے تشہد میں اشارہ سبابہ کو مسنون قرار دیا ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد میں انگشتِ شہادت اٹھاتے تھے — صوم وصلوٰۃ اور دیگر ارکانِ اسلام اور عبادات کے بارے میں بھی ایک کتاب تصنیف کی۔ ۱۱۱۰ھ میں مبحثِ وجود کے بارے میں "تنقیح المرام" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

شیخ عنایت اللہ قادری نے ۱۱۴۱ھ میں وفات پائی[۵۵]

---

[۵۴] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۵۲ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۵ — تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۱۹، ۲۲۰ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۹۵ روضۃ الابرار، ص ۶۰۔

[۵۵] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۵۲ — خزینۃ الاصفیا، ص ۱۸۵ تا ۱۸۷ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۹ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۱۹۵، ۱۹۶۔ مقدمہ عمدۃ الرعایہ

غ

۱۳۴ - شیخ غلام اخی عثمانی بلگرامی

شیخ غلام اخی بن محی الدین بن محمد امجد عثمانی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی - بلگرام ہی میں تعلیم حاصل کی اور فقہ کے جلیل القدر علما میں شمار کیے گئے - حج و زیارت کی سعادت بھی حاصل کی - غنیۃ العلم کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو حدیث اور مسائلِ فقہ کا ایک مجموعہ ہے - علم فرائض میں "سراجی"، ایک مشہور درسی کتاب ہے، اس کا ترجمہ کیا۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۱۶۱ھ کو بلگرام میں وفات پائی [۱]

۱۳۵ - سید غلام حسین اورنگ آبادی

سید غلام حسین بن شہاب الدین بن محمد اسحاق بغدادی ثم ہندی اورنگ آبادی، نامور عالم و فقیہ اور اپنے عصر کے مشہور شیخ تھے - حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے - "جبر" نام کے ایک شہر میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں گجرات چلے گئے. وہاں کے اساتذۂ عصر سے علم حاصل کیا - پھر شیخ علی رضا بن فرخ شاہ سرہندی ثم گجراتی (متوفی ۲۱ ذی القعدہ ۱۱۴۲ھ) کے دامنِ مشیخت سے وابستہ ہو گئے، ان سے اخذِ طریقت کیا - بعد ازاں اورنگ آباد کا عزم کیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی - اورنگ آباد میں تمام علائق دنیا سے منقطع ہو کر زہد و عبادت میں مشغول ہو گئے - ان کا تمام وقت تلاوتِ قرآنِ مجید، درود شریف، تہلیل و تسبیح اور دیگر وظائف و اوراد میں گزرتا - منقول ہے کہ پوری عمر میں کبھی نماز باجماعت ترک نہیں ہوئی ——— اس عالمِ دین نے ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۷۶ھ کو اورنگ آباد (دکن) میں داعی اجل کو لبیک کہا [۲]

---

[۱] نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۱۹۸، بحوالہ شرائف عثمانی

[۲] محبوب ذی المنن حصہ دوم، ص ۵۶۲، ۵۶۳ ——— نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۱۹۹

۱۳۶- میر سید غلام علی آزاد بلگرامی

قسّامِ ازل نے برصغیر پاک و ہند کی سرزمین کو جس بہت بڑی نعمت سے نوازا ہے، وہ علم کی فراوانی ہے۔ علم کے جو چشمے اس خطۂ ارض سے پھوٹے اور جس قدر علما و فقہا، صوفیا و مشائخ، محققین و مصنفین، معلمین و مدرّسین، ارباب فضل اور اصحابِ کمال یہاں پیدا ہوئے، وہ کم ہی علاقوں اور ملکوں میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ محلِّ وقوع کے اعتبار سے ہندوستان مرکزِ اسلام سے بہت دور تھا اور اسے کفرستان کی حیثیت حاصل تھی، لیکن اس پر اللہ کے احسانِ بے پایاں کا ایسا شامیانہ سایۂ فگن ہوا کہ جگہ جگہ سے قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند ہونے لگیں۔ علما سرگرمِ تدریس ہوئے، صوفیا نے رشد و ہدایت کی مسندیں بچھائیں اور فقہا و محدثین نے قلم اور زبان سے لوگوں کی ذہنی، علمی اور روحانی تربیت کا بیڑا اٹھایا، اور بہت جلد یہ صنم کدۂ ہند مرکزِ اسلام کی حیثیت اختیار کر گیا۔ بت تراش، بت شکن ہو گئے اور دین و شریعت سے ناآشنا لوگ اسلام کے داعی اور دین کے مبلّغ بن کر ابھرے۔

اس سلسلے میں دیارِ ہند کے بہت سے علاقوں نے بے پناہ شہرت حاصل کی، جن میں لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح کے متعدد قصبات و دیہات خاص طور سے مشہور ہیں۔ وہاں کے جو مقامات فی الواقع مردم آفرین اور علم و فضل کے مراکز کہلائے، ان میں بلگرام کی بستی کا نام تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ نقش رہے گا۔ واقعات و حالات میں خواہ کتنی بھی تبدیلی واقع ہو اور انقلاب و تغیر کی بے شک کتنی بھی لہریں اٹھیں، تاریخ کے صفحات بلگرام کو ابدالآباد تک اپنے دامن میں محفوظ رکھیں گے۔

فقہائے ہند کی پہلی جلدوں اور زیرِ مطالعہ جلد میں متعدد مرتبہ بلگرام اور وہاں کے علمائے کرام کا ذکر آ چکا ہے۔ ان سطور میں ہم اس بستی کے ایک اور جیّد عالم اور نامور مورخ سید غلام علی آزاد بلگرامی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے قبل کہ سیّد ممدوح کے

بارے میں کچھ عرض کیا جائے، یہ بتانا ضروری ہے کہ پہلے پہل وہاں علم کی شمع کب روشن ہوئی اور خانوادۂ سادات نے کس طرح اس کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔

واسطی سادات کی بلگرام میں آمد

واسطی سادات میں سے جو سب سے پہلے سید بلگرام میں آکر آباد ہوئے، ان کا نام سید محمد صغریٰ تھا، وہ خراسان سے آئے تھے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ احیار سنت اور اماتتِ بدعت میں پیش پیش رہتے تھے اور سلطان شمس الدین ایلتتمش کے حلقۂ دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ ۶۱۴ھ میں وہ ایک فوجی کی حیثیت سے غازیانِ اسلام کے ساتھ بلگرام آئے۔ اس زمانے میں ایک نہایت متعصب اور مغرور و سرکش راجا بلگرام کا حکمران تھا، جس کا نام سری تھا۔ سید محمد صغریٰ اس کی سرکوبی کے لیے تھوڑی سی فوج لے کر آئے، معرکۂ قتال گرم ہوا، اور راجا اپنے تمام اقارب واعیان کے ساتھ جنگ میں مارا گیا اور سید ممدوح نے بلگرام کو فتح کر لیا۔ تاریخِ فتح لفظ ”خداداد“ (۶۱۴ھ) سے نکلتی ہے۔ اس کے بعد سید محمد صغریٰ نے بلگرام ہی میں سکونت اختیار کر لی اور فرشوری شیوخ اور ترکمان بھی جو اُن کے ساتھ تھے، یہیں رہ پڑے۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

وبعد از فتح خود با شیوخ فرشوری و ترکمانان دراں مقام طرح اقامت ریخت۔[۵۳]

یعنی بلگرام فتح کرنے کے بعد سید محمد صغریٰ نے فرشوری شیوخ اور ترکمانوں کے ساتھ اسی جگہ کو اپنا مسکن قرار دے لیا۔

اس زمانے میں مال گزاری کا دستور یہ تھا کہ غلّے کی پیداوار کا دسواں حصّہ انھیں دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ سلطان سکندر لودھی کے بیٹے سلطان ابراہیم لودھی کے عہد تک جاری رہا۔ چنانچہ اس ضمن میں فرماں روائے دہلی محمود شاہ بن محمد شاہ بن سلطان فیروز نے ایک فرمان میں جو ۲۷ ربیع الثانی ۸۰۵ھ کا لکھا ہوا ہے اور سید غلام علی آزاد بلگرامی

---

۵۳ مآثر الکرام دفتر اوّل، ص ۱۲

نے اسے دیکھا ہے یہ الفاظ میں مرقوم ہیں:

"چنانچہ در عہدِ سلاطین ماضیہ عشر عین غلہ دادہ اند ہم بر آن جملہ بدمہند"[۵۴]

سید غلام علی آزاد کے اسلاف پرگنہ بلگرام کے غلّے کی پیداوار میں سے دسواں حصّہ باقاعدہ سلطان ابراہیم لودھی کے عہد تک وصول کرتے رہے۔ لیکن جمادی الاخریٰ ۹۳۲ھ کو جب مغل حکمران ظہیر الدین بابر نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر اسے قتل کر دیا اور اپنی حکومت قائم کر لی تو بقول آزاد بلگرامی کے غلّے کی وصولی کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

واز عہد بابر بادشاہ سررشتۂ قدیم برہم خورد[۵۵]

سید محمد صغریٰ بڑے عالم و فاضل اور صاحبِ دعوت بزرگ تھے۔ انھوں نے ۶۲۷ھ میں سلطان شمس الدین ایلتمش کے حکم سے بلگرام میں ایک بلند مقام پر شہر کے وسط میں قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ مرورِ ایّام سے جب قلعے کی دیواریں ٹوٹ گئیں تو اس کے کتبے کا پتھر جس پر سلطان شمس الدین کا نام کندہ تھا، محلہ سیّدواڑہ کی مسجد میں نصب کر دیا گیا۔ اس کتبے کی عبارت یہ ہے:

حامی البلاد، داعی العباد، ذی الامان لاھل الایمان، وارث ملک سلیمان صاحب الخاتم فی ملل العالم، ظل اللہ فی الخافقین، ابو المظفر ایلتمش السلطان ناصر امیر المومنین، دام اللہ تمکینہ فی شھور سبع وعشرین وستمائۃ۔

فتح بلگرام کے بعد سیّد محمد صغریٰ اکتیس ۳۱ سال زندہ رہے اور زندگی کے یہ لیل و نہار بلگرام ہی میں بسر ہوئے۔ انھوں نے ۱۴ شعبان ۶۴۵ھ کو وفات پائی۔

سیّد غلام علی آزاد ان ہی سید محمد صغریٰ کی اولاد میں سے تھے۔

سید غلام علی کی ولادت اور تعلیم و تربیت

سیّد غلام علی آزاد، یک شنبہ کے روز ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ والد

---

۵۴ مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۱۲ ۵۵ ایضاً

کا اسمِ گرامی سیّد محمد نوح حسینی واسطی تھا۔ علم و فضل کی گود میں پرورش پائی اور صالحیت و مشیخت کے ماحول میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ کتبِ درسیہ سیّد طفیل محمد اترولوی بلگرامی (متوفی ۱۱۵۱ھ) سے پڑھیں، جو اس عہد کے مشہور فاضل اور نامور عالم تھے۔ عروض و قافیہ اور ادب کی بعض کتابوں کی تحصیل سیّد محمد بلگرامی (متوفی ۱۱۸۵ھ) سے کی جو آزاد کے ماموں اور سید عبدالجلیل بلگرامی (متوفی ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ) کے فرزندِ رشید تھے۔ اس زمانے میں سید عبدالجلیل بلگرامی کا شمار اساتذۂ روزگار میں ہوتا تھا۔ وہ آزاد کے نانا تھے اور سولہ برس کی طویل سیر و سیاحت اور ملازمتِ سلطنت کے بعد ۱۱۳۲ھ میں اپنے وطن بلگرام آئے تھے۔ آزاد کی عمر ان دنوں سترہ برس کی ہو چکی تھی اور پہلی دفعہ دیارِ ہند کے اس فاضل کبیر کی زیارت کا موقع میسّر آیا تھا۔ آزاد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ کتبِ حدیث ان سے پڑھیں اور سند و اجازہ سے بہرہ مند ہوئے۔ ۱۱۳۴ھ میں سید عبدالجلیل نے پھر دہلی کا عزم کیا۔ آزاد نے چوں کہ ابھی تکمیل کی منزلیں طے نہیں کی تھیں، اس لیے یہ بھی ساتھ گئے اور تین برس تک ان کی خدمت میں رہ کر مزید استفادہ کیا۔ اب قاموس اللغۃ کا بڑا حصّہ ان سے پڑھا اور حدیث کی بعض کتابیں مکمل کیں۔ سیرت کی کچھ کتابوں کے لیے بھی ان سے رجوع کیا، بعض دیگر مروّجہ علوم و فنون بھی ان سے پڑھے۔

سید عبدالجلیل اپنے عصر کے جلیل القدر عالم تھے اور جوہر قابل کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ آزاد کی ذہانت اور استعداد و قابلیت سے وہ بڑے متاثر تھے، اکثر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے آزاد سے کہتے:

می خواہم بہ وجہِ نشانی از من باقی ماندیؔ[۵۶]

مجھے امید ہے، تمھاری وجہ سے میری علمی یادگار قائم رہے گی۔

اپنے نانا سیّد عبدالجلیل بلگرامی سے اکتسابِ علم کا ذکر آزاد اشعار میں بھی کرتے

---

۵۶ مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۶۱

ہیں - ایک شعر میں کہتے ہیں :

آزاد ما کہ فضل و کمال رساند — خدمت نمود حضرت عبدالجلیل را

فارغ التحصیل ہونے کے بعد آزاد سوادِ بلگرام میں واپس آئے اور پھر کافی عرصے تک یہاں مقیم رہے - آزاد طبعاً درویش منش اور صوفی مزاج تھے، اس لیے عین عالمِ جوانی (ماہ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۷ھ) میں سلسلۂ چشتیہ کے مطابق میر سید لطف اللہ بلگرامی المعروف بہ شاہ لدھا (متوفی شبِ یک شنبہ ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ) سے بیعت ہوئے اور کسبِ فیض کیا -

سیر و سیاحت:

اب آزاد کی سیر و سیاحت کا دَور شروع ہوتا ہے - ۱۱۴۲ھ میں وہ سندھ کے سفر پر روانہ ہوئے - اس زمانے میں ان کے ماموں سید محمد بلگرامی بادشاہِ دہلی کی طرف سے سندھ کے میر بخشی اور وقائع نگار تھے، اور سندھ کا ایک شہر سیوستان ان کا صدر مقام تھا - آزاد ان سے ملاقات کے لیے ذی الحجہ ۱۱۴۲ھ میں بلگرام سے نکلے اور دہلی، لاہور اور ملتان سے گزرتے ہوئے، ربیع الاول ۱۱۴۳ھ کے عشرہ اوّل میں سیوستان پہنچے - یعنی یہ مسافت ایک برس تین مہینے میں طے ہوئی، اس سے اس دَور کے سفر کی مشکلوں اور دشواریوں کا اندازہ ہو سکتا ہے -

میر سید محمد نے آزاد کی سیوستان میں آمد کو غنیمت جانا اور انھیں اپنا قائم مقام مقرر کرکے خود اپنے وطن بلگرام کا عزم کیا - پورے چار سال بعد وہ سندھ واپس آئے اور سیوستان پہنچے - آزاد نے میر ممدوح کی سرکاری ذمہ داریاں ان کے سپرد کیں اور ۱۱۴۷ھ میں دہلی کا رُخ کیا - یہاں آکر انھیں پتا چلا کہ ان کے والد اپنے اہل و عیال سمیت الہ آباد تشریف لے گئے ہیں - یہ بات سنتے ہی وہ آگرہ ہوتے ہوئے الہ آباد پہنچے - جب شہر میں داخل ہوئے تو لوگ رمضان المبارک کا چاند دیکھ رہے تھے - والدین سے مل کر آزاد نہایت خوش ہوئے - الہ آباد میں تین سال مقیم رہے - اس تین سال کے زمانۂ قیام میں دو مرتبہ بلگرام بھی گئے -

قصدِ حج

بلگرام کے دوسرے سفر سے آلہ آباد واپس آئے تو حریم دل میں سفرِ حج کے شوق نے کروٹ لی۔ منقول ہے کہ عہدِ طفولیت کے ایک خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ اس خواب کی تعبیر کے لیے نہایت بے تاب رہتے۔ بالآخر چارۂ ضبط نہ رہا اور ۳ رجب ۱۱۵۰ھ میں بے اختیار گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ ان کی زندگی کا نہایت ہی اہم سفر تھا۔ اس سے قبل کبھی پیادہ روی کا اتفاق نہیں ہوا تھا، لیکن اس طویل سفر پر وہ پا پیادہ ہی روانہ ہو گئے اور بغیر کسی کو اطلاع دیے چپکے سے عزمِ سفر کیا۔ تیسرے دن لوگوں کو ان کی روانگی کا علم ہوا۔ گھر کی عورتوں نے بالخصوص بڑی پریشانی کا اظہار کیا۔ آزاد نے متعارف اور معمول کا راستہ چھوڑ کر غیر متعارف راستہ اختیار کیا تھا تاکہ لوگوں کو پتا نہ چل سکے اور کوئی تعاقب میں نکلے تو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ ان کے بھائی میر سید غلام حسن نے تین منزل تک ان کا تعاقب کیا، لیکن وہ ہاتھ نہ آئے، لہٰذا مجبوراً واپس آ گئے۔

آزاد کو غیر متعارف راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے بڑی صحرا نوردی کرنا پڑی اور اس میں انھیں بہت تکلیفیں پہنچیں۔ ایک مثنوی میں جس کو وہ طلسمِ اعظم کے تاریخی نام سے موسوم کرتے ہیں، ان تکلیفوں کا ذکر کیا ہے۔

یوں تو آزاد سفرِ حج اور قصدِ بیت اللہ کے لیے بہت عرصے سے بے قرار تھے، لیکن اس اثنا میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے سوزِ دل کو مہمیز لگا دی اور وہ ہر ممکن عجلت کے ساتھ عازمِ بیت اللہ ہو گئے۔ شفیق نے گلِ رعنا میں وہ واقعہ خود آزاد سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ان کے قیامِ الٰہ آباد کے زمانے میں مبارز الملک نواب سربلند خاں صوبہ الٰہ آباد کے ناظم تھے۔ وہ اپنے لڑکے میر محمود خاں المخاطب بہ نواب شاہنواز خاں کو اپنا نائب بنا کر اس عہد کے حکمراں محمد شاہ کی خدمت میں دہلی گئے۔ آزاد کے والد میر سید محمد نوح بلگرامی اس زمانے میں نواب شاہنواز خاں

مذکور کی سرکار میں میر سامان تھے۔ ایک دن وہ اپنے دونوں بیٹوں، میر سید غلام حسن اور میر غلام علی آزاد بلگرامی کو نواب شاہ نواز کی خدمت میں لے گئے۔ نواب اپنے بنگلے میں بیٹھے تھے اور آزاد کے والد سید محمد نوح ان کے قریب کھڑے دستخطوں کے لیے کاغذات ان کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ یہ دونوں بھائی کچھ فاصلے پر "سلام گاہ" میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے کہ نواب اس طرف نگاہِ التفات کریں تو یہ انھیں آداب بجالائیں۔ لیکن نواب دستخط کرنے میں اتنے منہمک تھے کہ دیر تک اس کا موقع نہ آیا۔ چوب داروں کا قاعدہ تھا کہ ٹھہر ٹھہر کر اپنے آقا کو اشارہ کرتے تھے، مثلاً مجرائی کے لیے بلند آواز سے کہتے تھے، "با ادب با قاعدہ"، چوب دار نے دو تین مرتبہ صدا لگائی، لیکن نواب نے ادھر عنانِ توجہ مبذول نہ کی۔ آزاد کہتے ہیں کہ اس صورتِ حال سے میری غیرت جوش میں آئی اور میں نے دل میں سوچا کہ مخلوق کے دروازے پر اس قدر لجاجت کناں ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ میں وہاں سے واپس چلا آیا۔ والد گھر آئے تو مجھ سے پوچھا کہ تم نواب کو آداب بجا لائے بغیر کیوں چلے آئے۔ آخر تمھارا کیا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا، جو آپ خیال فرمائیں۔ اسی دن سے میں نے عہد کر لیا کہ جتنی جلدی ہو سکے مخلوق کے دروازے سے کنارہ کش ہو کر خالق کے دروازے پر پہنچنا چاہیے۔

آخر وہ ساعتِ سعید آگئی جب آزاد کی یہ تمنّا پوری ہوئی اور انھوں نے مخلوق کے دروازے سے منہ موڑ کر درِ خالق کا رُخ کیا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، آزاد بالکل خاموشی سے اس سفر پر روانہ ہوئے تھے، کسی کو اس کی اطلاع نہ دی تھی۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ والدِ گرامی یا کوئی اور شخص ان کے ارادے میں حائل نہ ہوں اور وطن میں مقیم رہنے اور حکومت کی ملازمت اختیار کرنے پر اصرار نہ کریں، چنانچہ اس میں وہ کامیاب رہے اور تلاش و تعاقب کے باوجود اعزہ و اقارب کے ہاتھ نہ آئے۔ اثنائے راہ میں انھوں نے اپنے اعزہ کو ایک رقعہ لکھا، جس میں یہ شعر درج تھا:

رفتہ ام از خود چہ می پرسی دگر از حالِ ما   کعبہ می آید درایں وادی باستقبالِ ما

اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ آزاد کے دل میں شوقِ حج اور زیارتِ کعبہ کا جذبہ کس قدر موج زن تھا۔ انھوں نے بلگرام سے سرونج تک جو حدودِ مالوہ میں واقع ہے، پا پیادہ سفر کیا، اور چوں کہ اس طرح کے مشقت آمیز سفر کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، اس لیے پاؤں میں آبلے پڑ گئے اور زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس میں ان کا رفیقِ سفر محض تنہائی تھا۔ صبح سے شام تک چلنے سے پاؤں خون آلود ہو گئے تھے۔ ہر طرف پہاڑ اور ناہموار جنگل تھے اور خوف اور دہشت کا منظر تھا۔ لیکن ایک سچا عاطفہ شوق تھا جو انھیں کشاں کشاں لیے جا رہا تھا۔ اس کیفیت کو مآثر الکرام میں آزاد ان اشعار میں بیان کرتے ہیں:

می بریدم رہے بہ بے پائی   با رفیقے کہ بود تنہائی
صبح تا شام راہ می رفتم   خون چکان تر ز آہ می رفتم
ہمہ کہسار و دشتِ ناہموار   قدم مور د ایں رہِ دشوار
ہر قدم رود ہا و جیحو نہا   چوں دمِ تیغ تشنۂ خونہا
موجِ خونناب و جوشِ آبلہا   ریخت در راہ رنگ سلسلہا
فکرہا دست زد بہ دامنِ دل   کرد شمشیر کلفتم بسمل[۵]

نواب آصف جاہ کے دربار میں

آزاد جن دنوں علاقہ مالوہ میں پہنچے، ان دنوں نظامِ دکن نواب آصف جاہ مالوے میں فوجیں لیے پڑا تھا —— نواب مذکور کے لشکریوں میں ایک نیک دل شخص نے آزاد کے حالات سے مطلع ہو کر نہایت فیاضی کا مظاہرہ کیا، گھر میں لے گیا، اپنا مہمان بنایا اور ایک نہایت شان دار رتھ سواری کو دیا۔ ان کے علم و فضل کا شہرہ چوں کہ دُور دُور تک پہنچ چکا تھا، لہٰذا نواب آصف جاہ

---

[۵] مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۹۲

کے دربار میں ایک تقریب کا انعقاد عمل میں لایا گیا اور ۲۲ شعبان ۱۱۵۰ھ کو نواب سے ملاقات کا موقع میسّر آیا۔ آزاد نے زندگی میں کبھی امرا و ملوک کی مدح میں زبان آلودہ نہ کی تھی، لیکن سفرِ حج کے شوق اور زیارتِ بیت اللہ کی بے تابی میں اس خود داریٔ نفس کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دربار میں جا کر نواب کی مدح میں یہ رباعی پڑھی:

اے حامیِ دین، محیطِ جود و احسان — حق داد ترا خطاب آصف شایان
او تختِ بہ درگاہ سلیمان آورد — تو آلِ نبی را بہ درِ کعبہ رسان

ماثر الکرام میں یہ رباعی درج کرنے کے بعد خود آزاد اس کا ذکر کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

فقیر با وصف موزونیِ طبع مدت العمر زبان بہ مدح اغنیا نہ کشودہ ام، الّا ایں رباعی کہ در استعانت سفر بیت اللہ سرزد، و دو بیت عربی کہ در دفتر ثانی در ترجمہ نواب نظام الدولہ شہید مذکور می شود[۵۸]

یعنی اس فقیر نے شاعر ہونے کے باوجود عمر میں کبھی اربابِ دولت کی مدح سرائی میں زبان نہیں کھولی۔ صرف یہی ایک رباعی ہے جو سفر بیت اللہ میں استعانت کے سلسلے میں نوکِ زبان پر آگئی۔ یا ماثر الکرام کے دفتر ثانی میں جسے سروِ آزاد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، نواب نظام الدولہ شہید کے حالات کے ضمن میں عربی کے دو بیت موزوں ہو گئے۔

میدانِ جنگ میں

نواب آصف جاہ اس زمانے میں مرہٹوں سے برسرِ پیکار تھا، جس کے نتیجے میں رمضان کا پورا مہینہ یوں گزرا کہ حدودِ بھوپال میں ہر طرف آتشِ جنگ مشتعل اور زلزلہ قیامت بپا تھا۔ آزاد کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

القصہ دراں حدود نواب آصف جاہ متوجہ تنبیہ افواج مرہٹہ بود، تمام

---

۵۸ ماثر الکرام دفتر اوّل، ص ۲۹۳

رمضان در سوادِ شہر بھوپال آتش حرب اشتعال داشت و زلزلہ ساعت قائم بود۔[۵۹]
یعنی ان دنوں نواب آصف جاہ مرہٹوں کے لشکر کی سرزنش میں مصروف تھا، بھوپال کا شہر تمام رمضان المبارک میں جنگ کی آتش خیزیوں کا مرکز بنا رہا اور پورا مہینہ قیامت کی سی کیفیت طاری رہی، درو دیوار لرزتے اور کانپتے رہے۔

خود آزاد بھی اس موقع پر شمشیر بدست ہوئے اور جنگ میں حصہ لیا۔ اس کا ذکر وہ بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں:

من ہم آں روز در صفِ اسلام	بایکے ذو الفقارِ خون آشام
قدمِ پُردلانہ افشردم	حملہ ہا بر مخالفان بردم
تشنگیہائے روزۂ رمضان	کردہ از کام تا جگر بریان
سفرِ کعبہ و صیام و جہاد	ایں سہ دولت بہم مرا رو داد

حج کو روانگی

رمضان المبارک (۱۱۵۰ھ) کے آخری دنوں میں نظام الملک نواب آصف جاہ نے مرہٹوں سے صلح کر لی اور جنگ ختم ہو گئی۔ اب نواب نے دکن کو مراجعت کی اور ہر طرف سے مطمئن ہو کر آزاد کے سفرِ حج کے لیے خرچ اور سواری کا معقول انتظام کیا۔ بقول آزاد:

"و بہ اعانت نواب زاد و راحلہ خاطر خواہ دست بہم داد۔"

صاحبِ شرائف عثمانی کے بیان کی رو سے نواب نے پانچ سو روپے عنایت کیے، جو اس زمانے میں واقعی "خاطر خواہ" رقم تھی۔

اوائل شوال میں آزاد، بھوپال سے نکل کر برہان پور گئے۔ وہاں سے روانہ ہوئے تو ۱۰ ذی قعدہ کو سورت پہنچے۔ سورت کی بندرگاہ سے ۲۴ ذی قعدہ کو جہاز میں سوار ہو کر کرۂ خاکی سے کرۂ آبی میں داخل ہوئے۔ ۱۸ محرم ۱۱۵۱ھ کو ان کا جہاز

---

[۵۹] مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۹۳، ۲۹۴

بندرگاہ جدہ میں لنگر انداز ہوا۔ سورت سے جدہ تک کا سفر ایک مہینہ اٹھارہ دن میں طے ہوا۔

شیخ محمد فاخر سے ملاقات

شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی (متوفی ۱۱ ذوالحجہ ۱۱۶۴ھ) جو برصغیر کے سلفی العقیدہ عالم کبیر، متبع سنت، مصنف شہیر، نامور محدث و فقیہ اور بلند مرتبہ صوفی و شاعر تھے، اس زمانے میں وہیں قیام فرما تھے، آزاد کے بہت قدر دان تھے، ان کی آمد کی خبر سن کر نہایت اشتیاق سے استقبال کو آئے، آزاد جہاز سے اُترے تو سب سے پہلے ان ہی سے ملاقات ہوئی اور دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ آزاد لکھتے ہیں:

شیخ محمد فاخر متخلص بہ زائر الہ آبادی ... در جدہ تشریف داشت، خبر قدوم فقیر از مردم جہازی کہ دو روز پیش از جہاز ما رسیدہ بود، یافتہ، بر لب دریا انتظار می کشید، ہمیں کہ قدم از بحر بہ خشکی گزاشتم ملاقات شد، و سرور عجبی دست داد[۵]

یعنی شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی ... جدہ میں تشریف فرما تھے، جو لوگ ہمارے جہاز سے دو دن پہلے وہاں پہنچ چکے تھے، ان سے اس فقیر کی آمد کی اطلاع پا کر ساحلِ سمندر پر انتظار کر رہے تھے۔ جوں ہی میں نے سمندر سے خشکی میں قدم رکھا، ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اور بے حد مسرت ہوئی۔

مکہ مکرمہ میں حاضری

آزاد کا دل سرزمینِ حجاز میں پہنچنے کے لیے انتہائی بے تاب تھا اور آنکھیں زیارت حرمین کے لیے بدرجہ غایت بے قرار تھیں۔ وہ ہر ممکن عجلت کے ساتھ جدّہ سے روانہ ہوئے اور ۲۳ محرم ۱۱۵۱ھ کو مکّہ مکرّمہ کی ارضِ پاک پر قدم رکھا۔ وہاں ان کی جبینِ نیاز اپنے پروردگار کے حضور بیت اللہ میں سجدہ ریز ہوئی اور تسکینِ قلب و روح کا سامان بہم پہنچایا۔ خود فرماتے ہیں:

---

[۵] مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۹۴

"وجبینِ نیاز بآستان سائی بیت اللہ برافروختم"

حرمِ مقدس میں ان کے دل کے تار ہل چکے تھے اور باطن کی دنیا یک لخت بدل گئی تھی، چنانچہ سراپا عجز ہو کر ان کی زبان حق بیان سے یہ ترانہ بلند ہوا:

الٰہی نالہ گرمی دل دیوانۂ ما را ۔ کرامت کن نہاں آتشینی دانۂ مارا
مدہ در دست زنگارِ ہوس آئینۂ دل را ۔ زحسن خویش کن آباد حیرت خانۂ مارا
کریمان را نظر بر زشتی مہمان نمی باشد ۔ مبراز باغ بیرون سبزۂ بیگانہ ما را
درین بزمِ کہن از دستِ مردم آبرو مشکن ۔ تو گردش دہ برنگ آسمان پیمانۂ مارا
دل ما در چراغان تجلی رنگ می بازد ۔ سمندر ساز و در آتش نشان پروانۂ مارا
تہی مگزار یک دم سینہ را از جنبش آہی ۔ بایں سنبل سراسر سبز کن ویرانۂ مارا
صریر خامۂ آزاد را شور دو عالم کن ۔ نمک دہ از قبول خویشتن افسانۂ مارا

مدینہ منورہ میں آمد

مکہ مکرمہ میں آزاد اس وقت پہنچے تھے، جب موسمِ حج گزر چکا تھا، اور اگلے سال کے حج میں کئی مہینے باقی تھے، لہٰذا صرف تین دن وہاں رہے تھے کہ دل میں مدینہ منورہ کے لیے آتشِ شوقِ زیارت بھڑک اٹھی۔ خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں:

چوں موسمِ حج دور بود، سہ روز در مکہ معظمہ ماندہ رو بمدینہ منورہ آوردم وغبارِ آستانِ رسالت را کحل الجواہر چشمِ نیاز ساختم[۱۱۱]

یعنی چوں کہ زمانۂ حج ابھی دور تھا، اس لیے صرف تین دن مکہ معظمہ میں رہ کر مدینہ منورہ کا رخ کیا اور چشمِ عقیدت نے غبارِ آستانۂ رسالت کو سرمہ بنایا۔

مآثر الکرام میں رقم طراز ہیں کہ ۲۶ محرم ۱۱۵۱ھ کو مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ کا قصد کیا۔ ان کی عمر اس وقت چھتیس برس کی تھی۔

از آں جا کہ شوقِ مدینہ سکینہ جلوہ ریز بود، طاقتِ صبر در خود نیافتہ بست و

---

۱۱۱ خزانۂ عامرہ، ص ۱۲۵

ششم منہ روز جمعہ بعد ادائے نماز جمعہ رو براہ مدینہ مقدسہ آوردم۔ بست و پنج ماہ صفر کہ دریں تاریخ از کتم عدم بہ شہرستان ہستی وارسیدہ ام، و مرحلہ سی و ششم گزاشتم، وقتِ سحر از سوادِ مدینہ منورہ سرمہ سعادت در چشم کشیدم، و دیدۂ آرزومند را بر قبۂ روضۂ اقدس مالیدم[۱۲]

مکہ معظمہ سے دلِ بے قرار میں مدینہ منورہ کی شوقِ زیارت نے کروٹ لی، چنانچہ طاقتِ صبر نہ پاکر ۲۶ محرم کو جمعۃ المبارک کے دن، نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد مدینہ مقدسہ کی راہ اختیار کی۔ ۲۵ ماہِ صفر کو کہ اسی تاریخ کو میں جہانِ عدم سے عالم وجود میں آیا تھا اور اب چھتیس ۳۶ سال کی عمر کو پہنچ گیا ہوں، سحری کے وقت، سوادِ مدینہ کا سرمہ سعادت آنکھوں میں ڈالا اور دیدۂ آرزومند کو روضۂ اقدس کے آستانۂ مبارک کی دید سے بہرہ مند کیا۔

اس دور میں سفر کس قدر دشوار تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ آزاد نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ تک کی مسافت ایک مہینے میں طے کی۔

شیخ محمد حیات سندھی سے اجازۂ حدیث

جس زمانے میں میر غلام علی آزاد مدینہ منورہ میں آئے، اس زمانے میں وہاں کشورِ سندھ کے جلیل القدر محدث و فقیہ اور رفیع المرتبت عالم و مصنف شیخ محمد حیات سندھی مدنی (متوفی ۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ) کا ہنگامۂ درس جاری تھا اور بے شمار اصحاب فضل و کمال ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ وہ سندھ کے چاچڑ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور اعمالِ بھکر کے موضع عادل پور کے باشندے تھے۔ عنفوانِ شباب ہی میں حجاز تشریف لے گئے تھے اور مدینہ منورہ میں متوطن ہو گئے تھے۔ آزاد اگرچہ ہندوستان کے متعدد باکمال علما اور فاضل اساتذہ سے تحصیل کر چکے تھے اور اہلِ علم کے نزدیک بڑی قدر و منزلت کے مالک تھے، لیکن تشنگیِ علم ہنوز باقی تھی اور وہ سیرابیِ ذہن و فکر کے مزید سامان تلاش کر رہے تھے۔ چنانچہ مدینہ منورہ پہنچے تو شیخ محمد حیات کے

---

۱۲ مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۹۴

حلقۂ درس میں شامل ہوگئے اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ ان سے صحیح بخاری پڑھی اور صحاح ستہ کی سند حاصل کی۔ شیخ ممدوح کا آزاد نہایت احترام سے نام لیتے اور ان کے فضل و کمال کا فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

درشہورِ اقامتِ این بلدۂ طیبہ صحیح بخاری را خدمت مولائی و استاذی شیخ محمد حیات السندی المدنی نور اللہ ضریحہ سند کردم و اجازت صحاح ستہ و سائر مفردات مولانا برگرفتم [۱۳]

یعنی جن مہینوں میں مجھے مدینہ کے بلدۂ طیبہ میں اقامت کا موقع ملا، میں نے مولائی و استاذی شیخ محمد حیات سندھی مدنی (اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے) کی خدمت میں حاضر ہو کر صحیح بخاری کا درس لیا اور صحاح ستہ کی سند و اجازہ کا شرف حاصل کیا۔

اس زمانے میں آزاد کا یہ معمول تھا کہ اکثر راتوں کو مسجدِ نبوی میں جاکر منبرِ رسول کے قریب بیٹھ جاتے اور صحیح بخاری کا مطالعہ کرتے۔ اس زمانے میں ایک غزل کہی، جس کا مطلع یہ ہے:

نمود جلوۂ اعجاز شمع مطلبی — نماند شوخیِ چشمِ شرار بولہبی

چند روز کم آٹھ مہینے مدینہ منورہ میں قیام رہا۔

مکہ مکرمہ کو روانگی

آزاد ۲۵ صفر ۱۱۵۱ھ کو مدینہ شریف میں آئے تھے، ۱۴ شوال ۱۱۵۱ھ کو قصدِ حج سے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ روانگی کے وقت وہ جس قلبی کیفیت سے دوچار تھے اور جو حالت ان پر طاری تھی، اس کا تذکرہ انھوں نے نہایت مؤثر انداز اور رقت آمیز الفاظ میں سبحۃ المرجان میں کیا ہے [۱۴]

بارہ دن کے بعد ۲۶ شوال کو وہ مکہ معظمہ پہنچے۔ یہاں مناسکِ حج کی ادائیگی کے ساتھ تحصیلِ علم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ مکہ معظمہ میں انھوں نے شیخ عبدالوہاب

---

۱۳ مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۹۴

۱۴ دیکھیے: سبحۃ المرجان، ص ۱۲۰

طنطاوی مصری سے جو اس دور کے مشہور محدث ہو گزرے ہیں، فن حدیث میں استفادہ کیا۔ آزاد لکھتے ہیں کہ جب شیخ عبدالوہاب کو میرے تخلص کا علم ہوا اور مجھ سے لفظ آزاد کے معنی سمجھے تو فرمایا: یا سیدی انت من عتقاء اللہ[۱۵]

۱۱۵۲ھ کے سال کا آغاز ان کو مکہ معظمہ ہی میں ہو گیا تھا۔ چار مہینے سے زیادہ عرصہ وہ اس مقدس شہر میں مقیم رہے اور اس اثنا میں فریضۂ حج ادا کیا۔

ماہِ ربیع الاوّل میں وہ مکہ مکرمہ سے طائف کی سیر کے لیے نکلے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے مرقد پر پہنچے۔ وہاں ان اشعار میں اپنے جذبۂ اخلاص کا اظہار کیا:

اے صبا رو بہ مزارِ پسرِ عمِ نبی — خاکِ آں روضہ کم از عنبرِ تر نشناسی
کردہ ام خوب تماشا چمنِ طائف را — نہ رسد ہیچ گلِ او بہ گلِ عباسی

آخر ربیع الثانی ۱۱۵۲ھ میں وہ طائف سے مکہ مکرمہ واپس آئے اور طواف وداع کرنے کے بعد جدّہ کو روانہ ہوئے۔

مراجعتِ ہند

۳ جمادی الاولیٰ ۱۱۵۲ھ کو آزاد مراجعتِ ہند کی غرض سے بندرگاہ جدہ سے جہاز میں سوار ہوئے، چھبیس[۲۶] روز کے بعد ۲۹ جمادی الاولیٰ کو ان کا جہاز سورت پہنچا۔ ۲ جمادی الاخریٰ کو وہ شہر سورت میں داخل ہوئے۔

آزاد اپنی تصنیف "ید بیضا" میں وطن میں واپسی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "اہل و عیال، بالخصوص والدین کی محبت مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی اور اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وطن جا کر ان کی خدمت کروں اور مجھ پر جو اُن کے حقوق عائد ہوتے ہیں، انھیں ادا کرنے کا فرض انجام دوں۔" لیکن یہ عجیب بات ہے کہ سورت پہنچ کر وہ فوری طور پر وطن نہیں گئے بلکہ پانچ مہینے سے بارہ تیرہ دن اوپر

---

[۱۵] سروِ آزاد، ص ۲۹۴

وہیں مقیم رہے، پھر وہاں سے نکلے تو دکن کا رخ کیا۔ شرائف عثمانی کے دیباچے میں شیخ غلام حسن ثمین ان کے دکن جانے کے بارے میں اس امکان کا اظہار کرتے ہیں کہ نظام الملک نواب آصف جاہ نے آزاد کو حج کے لیے رخصت کرتے وقت ان سے یہ استدعا کی تھی کہ واپسی پر اسی (دکن کے) راستے سے آئیں، ممکن ہے، سورت پہنچ کر انھیں نظام الملک کی یہ استدعا یاد آگئی ہو، اور جذبۂ احسان مندی نے انھیں دکن جانے پر مجبور کر دیا ہو —— لیکن اگر یہ صحیح ہے تو مسلسل ساڑھے پانچ مہینے سورت میں کیوں رکے رہے؟ سب سے پہلے دکن آنا چاہیے تھا۔

دکن کو روانگی

۱۱ ذوالقعدہ ۱۱۵۲ھ کو وہ سورت سے دکن کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۷ ذوالقعدہ کو اورنگ آباد پہنچے۔ وہاں انھوں نے بابا شاہ مسافر نقشبندی کی خانقاہ میں قیام کیا۔ اس خانقاہ میں آزاد نے مختلف اوقات میں سات سال کا طویل عرصہ گزارا۔ پہلی دفعہ کم و بیش دو سال مقیم رہنے کے بعد ۲ رمضان ۱۱۵۴ھ کو اورنگ آباد سے نکلے اور قلعہ محمد آباد، بیدر، خاندیش اور برار وغیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے اس شہر میں پہنچے جو دکن کے سلاطینِ بہمنیہ کا دار السلطنت رہ چکا تھا۔ اس شہر کا حال بیان کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں کہ اب یہ شہر خستہ حالت میں ہے اور بڑی بڑی شاہی عمارتیں کھنڈروں میں بدل چکی ہیں، جو دیکھنے والوں کے لیے سامانِ عبرت پیدا کرتی اور دنیا کی ناپائداری کا مرثیہ پڑھتی ہیں۔

۴ محرم ۱۱۵۵ھ کو وہ حیدر آباد میں وارد ہوئے، حیدر آباد کی وہ بہت تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس شہر کی عمارتیں بڑی عمدہ ہیں، شاہ راہیں کشادہ ہیں، یہاں پانی کی فراوانی ہے، درخت اور کھیت شاداب ہیں۔ ۱۹ صفر تک وہ حیدر آباد میں مقیم رہے اور ۱۵ جمادی الاولیٰ کو اورنگ آباد لوٹے۔

نظام الدولہ ناصر جنگ سے انسلاک

۱۱۵۸ھ میں نظام الملک نواب آصف جاہ نے اپنے بیٹے نواب نظام الدولہ

ناصر جنگ کو اورنگ آباد کی صوبے داری پر مامور کیا۔ ۱۱۵۹ھ میں آزاد کی اس سے ملاقات ہوئی۔ شفیق "گل رعنا" میں کہتے ہیں کہ نواب نظام الدولہ سے اس ملاقات کی وجہ ایک دن آزاد نے اُن سے یہ بیان کی کہ حجاز سے واپس آنے کے بعد میں سورت ہوتا ہوا، اورنگ آباد پہنچا۔ یہاں میں نے دس سال توکل میں گزار دیے۔ اب میری عمر چالیس سال سے متجاوز ہو چکی تھی، قوائے جسمانی میں کمزوری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے اور لازمی ضروریات کے لیے اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج سمجھنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب توکل سے کام نہیں چل سکتا۔ ان ہی ایام میں نواب نظام الدولہ نے مجھ سے رفاقت و انسلاک کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اسے قبول کر لیا۔

اس سلسلے میں شفیق مزید لکھتے ہیں کہ اس کے بعد آزاد نے فرمایا کہ نواب نظام الدولہ کی رفاقت اختیار کرنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ کسی ایک شخص کے حلقۂ ملازمت میں رہنا، توکل کی زندگی اختیار کرنے سے بہتر ہے۔ کیوں کہ بہ نسبت ہزار لوگوں پر نظر رکھنے کے ایک ہی شخص پر نظر رکھنا زیادہ اولیٰ ہے۔ جب ہر طرف سے نظر ہٹ کر ایک ہی شخص پر مرکوز ہو جاتی ہے تو یہ چیز جمعیتِ قلب اور سکونِ خاطر کا باعث بنتی ہے"۔ اور ہر کام خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی بلا کسی تشویش کے پورا ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں بھی آزاد نے اسی نقطۂ فکر کا اظہار کیا ہے:

توکل را نظر ہر روز بر تو خدمتے باشد	ہماں بہتر کہ ایں کس یار صاحب دولتے باشد
اگر بستی میاں را در کشاد کار محتاجاں	تقرب با خداوندانِ دولت طاعتے باشد
سوادِ فکر را از پرتو دولت چراغاں کن	ترا زیں جامعیت با سلیمان نسبتے باشد

توکل کے بارے میں آزاد کی اس تعبیر سے ہر شخص کو اتفاق نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے، آزاد کے ذاتی حالات بہت زیادہ پریشان کن نوعیت اختیار کر گئے ہوں اور کئی قسم کی پریشانیاں ان پر مسلط ہو گئی ہوں، یا ان کی افتادِ طبع ہی ایسی ہو جس نے انھیں توکل سے منہ موڑ کر ایک صاحبِ دولت سے وابستہ ہونے پر مجبور کر دیا ہو۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، ایک عالمِ دین اور صاحبِ فضل و کمال کا شیوہ یہی ہے کہ وہ اللہ پر توکل رکھے اور

اسی کو کارساز سمجھے۔ سرکار سے وابستگی اور امراسے انسلاک شرعاً ممنوع نہیں ہے، تاہم توکل، اللہ ہی پر رکھنا چاہیے، وہ انسان کے مناسب حال کوئی بہتر صورت پیدا کر دیتا ہے۔

بہر حال نواب نظام الدولہ ناصر جنگ، حسنِ اخلاق کا مالک اور اہلِ علم کا قدردان تھا۔ اسی بنا پر وہ آزاد کا بہت مداح اور ان کے علم و فضل اور فہم و فراست کی وجہ سے ان کی بہت تکریم کرتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوسکتا ہے کہ ۱۱۵۹ھ میں نواب نظام الملک آصف جاہ نے اسے حیدر آباد طلب کیا تو نظام الدولہ نے آزاد کو بھی ساتھ جانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ وہ اس کی معیّت میں ۲۷ ذوالقعدہ ۱۱۵۹ھ کو اورنگ آباد سے چلے اور سری رنگ پٹن تک سیاحت کی، جو کہ مہاراجہ میسور کی عمل داری میں واقع تھا۔ ماہِ صفر ۱۱۶۱ھ میں وہ اورنگ آباد واپس آئے۔

حجِ ثانی کا خیال اور اس کا ترک

اسی سال رمضان المبارک کے مہینے میں آزاد کے دل میں دوبارہ عرب جانے کا خیال کروٹ لینے لگا۔ وہ لکھتے ہیں:

در عشرۂ اخیر رمضان ۱۱۶۱ھ مزاج بندہ را وحشتے بہم رسید، بخاطر افتاد کہ از ہمہ قطع نظر باید کرد و بار دیگر سری بہ دیارِ عرب باید کشید[۱۶]

یعنی رمضان ۱۱۶۱ھ کے عشرۂ آخر میں میرے مزاج میں ایک وحشت سی پیدا ہوئی اور دل نے چاہا کہ تمام امور سے قطع تعلق کر کے دوبارہ دیارِ عرب کو جانا چاہیے۔

لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ کیوں؟ اس کی وجہ وہ خود ہی بیان کرتے ہیں:

ناگاہ شب بیست و ہفتم ماہِ مذکور، طرف سحر، در عالم رویا اندیشہ ام متوجہ شعر گردید، بیتے موزوں ساختم، و معاً از خواب بیدار شدم، بیت بیادماند و آں اینست:

چہ خوش گفت گویندۂ نامدار   مکش دست از دامنِ روزگار

۱۶۔ سروِ آزاد، ص ۲۹۳

لختے بتامل رفتم، دانستم کہ گوینده سروش غیبی است و مخاطب بنده، امتثال امر غیب واجب دیدم و ارادہ کہ تصمیم یافتہ بود، فسخ نمودم، و سرّ الہام آنست کہ حجے کہ فرض بود، پیش ازیں بتقدیم رسید، اگر دست از دامن علائق ظاہری می کشیدم و بہ تحصیل نافلہ شتافتم، چندیں حقوق واجب الادا فوت می باشد

ترک واجب نتواں کرد پے نافلہا[۱۷۵]

یعنی ۲۷ رمضان المبارک کی شب کو سحری کے وقت جب کہ میں سویا ہوا تھا، اچانک خواب میں فکرِ شعری بیدار ہوا، اور توجہ ادھر منعطف ہوئی۔ ایک شعر موزوں ہوا، اور معاً آنکھ کھل گئی۔ وہ شعر مجھے یاد ہے، جو یہ ہے:

چہ خوش گفت گویندۂ نامدار　　مکش دست از دامنِ روزگار

کہ کہنے والے نے یہ کیا خوب بات کہی ہے کہ دامنِ روزگار سے ہاتھ نہ کھینچو۔

تھوڑی دیر کے لیے میں سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر سمجھا کہ کہنے والا آوازِ غیبی ہے اور مخاطب یہی بندہ (آزاد) ہے، امرِ غیب کو ماننا میرے نزدیک ضروری ہے، چنانچہ وہ ارادہ جسے میں پختہ کر چکا تھا، فسخ کر دیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جو حج فرض تھا، وہ میں پہلے کر چکا۔ اب اگر علائقِ ظاہری سے دامن کشاں ہوں گا اور حصولِ نفل کے لیے سرگرداں ہوں گا تو اس سے وہ حقوق فوت ہو جائیں گے، جن کا ادا کرنا مجھ پر واجب ہے ــــــ اور نوافل کے لیے واجب کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔

آزاد کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔ حج زندگی میں ایک ہی مرتبہ فرض ہے۔ علائق ضروریہ کو ترک کر کے دوبارہ قصدِ حج کرنا حقوقِ واجب الادا سے صرفِ نظر کرنے کے مترادف ہے۔

برہان پور اور حیدر آباد وغیرہ کے سفر

۱۱۶۲ھ میں آزاد نے دوسری مرتبہ برہان پور کا سفر کیا۔ اسی سال وہ ۱۴ شوال کو

---

[۱۷۵] سروِ آزاد، ص ۲۹۲

ارکاٹ گئے اور ایک سال چند مہینے وہاں رہے۔ ۱۱۶۴ھ میں نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کی شہادت کے بعد وہ اورنگ آباد چلے آئے۔ ۱۱۶۵ھ میں نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں حیدر آباد گئے تو انھیں بھی ساتھ لے گئے۔ ۹ رجب کو اورنگ آباد سے چلے اور ۷ شعبان کو حیدر آباد پہنچے۔ پھر ۱۶ ذوالقعدہ کو حیدر آباد سے نکلے اور ۵ ذی الحجہ کو اورنگ آباد لوٹے۔ بعد ازاں ۱۱۶۷ھ میں بھی آزاد حیدر آباد گئے اور ۱۱۶۸ھ میں اورنگ آباد واپس آئے۔

جوان بیٹے کا انتقال

آزاد کے ایک ہی بیٹے تھے اور سید نور الحسن ان کا نام تھا۔ وہ اپنے وطن بلگرام میں رہتے تھے اور بلگرام کے ایک تالاب میں غسل کرتے ہوئے عین عالمِ جوانی میں غرق ہو گئے تھے۔ یہ حادثہ ۱۱۶۸ھ میں پیش آیا۔ آزاد کے لیے یہ نہایت غم انگیز حادثہ تھا۔ جوان بیٹے کی وفات پر انھوں نے دردناک مرثیہ لکھا، جس کا ایک شعر یہ ہے:

قیامت بر سرِ ایں بوستاں رفت　　　کہ یک گل داشت آں ہم نوجواں رفت

اس حادثے کے بعد آزاد کی سیر و سیاحت کی تفصیل نہیں ملتی۔ ممکن ہے پھر انھوں نے زیادہ سفر نہ کیا ہو۔ ایک تو نوجوان بیٹے کی موت کا حادثہ انتہائی سخت تھا، دوسرے ان کی عمر اس وقت باون[۵۲] سال کی ہو چکی تھی اور وہ کہولت کی منزل میں داخل ہو گئے تھے، اس لیے ہو سکتا ہے، سیر و سیاحت کا سلسلہ ختم کر دیا ہو۔ خیال یہ ہے کہ ان کا حیدر آباد کا مذکورہ بالا سفر آخری تھا، اس کے بعد وہ اورنگ آباد ہی میں مستقل طور پر رہنے لگے تھے، اس سے باہر نہیں گئے۔ چنانچہ ۱۱۸۱ھ میں "گل رعنا" میں لچھمی نرائن شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہیں:

خود آزاد کا اپنا بیان بھی یہی ہے۔

چند بار بہ تماشائے اطرافِ ملک دکن برخاستم، اکنوں در دارالامن اورنگ آباد گوشہ گیرم۔[۱۸]

---

[۱۸] خزانۂ عامرہ، ص ۱۲۵

یعنی کئی دفعہ ملک دکن کے اطراف وجوانب کی سیر وسیاحت کا لطف اٹھایا، لیکن اب اورنگ آباد کے دارالامن میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گیا ہوں۔

ایک اہلِ علم ولیم چیمبرز تھے، جو آزاد کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے آزاد کی مشہور تصنیف خزانہ عامرہ کے بعض حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں:

(آزاد) اس وقت تک اورنگ آباد دکن میں بقیدِ حیات ہیں اور سال ہا سال تک علمی وادبی مشاغل اور سیر وسیاحت میں مصروف رہنے کے بعد اب عزت واحترام اور کسی قدر ٹھاٹھ کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر پچاسی ۸۵ برس ہے، موجودہ نظام حیدرآباد دوبار ان سے ملنے اورنگ آباد آچکے ہیں۔

ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ اورنگ آباد میں ان کی بڑی قدر ومنزلت تھی، خود نظام دکن ان کا بے حد احترام کرتا اور ملاقات کے لیے آتا۔ اس شہر کے لوگوں اور اس کے در ودیوار سے آزاد بہت مانوس ہو گئے تھے، اور اسی شہر کو جسے وہ دارالامن قرار دیتے ہیں، اپنا مستقل مسکن ٹھہرالیا تھا۔

آزاد نے زندگی میں بہت سفر کیے اور مختلف مقامات کی سیاحت کو گئے، لیکن اس سے ان کا مقصد مال و دولت جمع کرنا ہرگز نہ تھا، فقط ایک شوق تھا جو انھیں جگہ جگہ لیے پھرتا تھا۔ خود لکھتے ہیں:

حق سبحانہٗ، علیم است کہ ہلال وار مقصود ازیں سیر وسفر نہ تن پروری باشد، حاشا وکلاّ بلکہ مانند بدر منظور شکست نفس بود۔ [۱۹]

خداہ گواہ ہے کہ اس سفر سے میرا مقصد ہلال کی طرح، جو طلوع ہونے کے بعد نمایاں تر ہوتا چلا جاتا ہے تن پروری وخود نمائی نہ تھا بلکہ بدر کی مانند جو کمال پر پہنچنے کے بعد روبزوال ہو جاتا ہے، خواہشِ شکستِ نفس تھی۔

بہرکیف آزاد کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر وسیاحت میں گزرا اور انھوں نے دیارِ ہند کے

---

۱۹ سروِ آزاد، ص ۲۹۵

متعدد شہروں اور علمی مرکزوں کا مختلف تقریبات کے سلسلے میں سفر کیا۔ ان کی بعض تصنیفات کا آغاز اور اختتام بھی سفر اور سیاحت ہی کے دوران میں ہوا۔ آئندہ سطور میں ہم ان کی تصنیفات کا ذکر کریں گے، جو کئی عنوانات پر مشتمل ہیں اور عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں۔

تصنیفات

آزاد کی تصنیفات کا تذکرہ کرنے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ ان کی تصنیفات سرزمینِ برّصغیر میں اپنی نوعیّت کی اوّلیں تصانیف ہیں۔ فنِ رجال اور علمِ تاریخ سے مسلمانوں کو ہمیشہ خاص لگاؤ اور تعلقِ خاطر رہا ہے، لیکن اسے ایک علمی حادثہ کہنا چاہیے کہ برّصغیر میں اہلِ علم کی بہت بڑی اکثریت کے باوجود اس موضوع کو کسی نے بھی لائقِ التفات نہ گردانا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس خطۂ ارض کے بے شمار اصحابِ علم اور اربابِ کمال کے حالات گم نامی کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔ اس نواح میں آزاد پہلے عالم اور اوّلین مصنّف ہیں، جنھوں نے اس اہم موضوع کو ہدفِ فکر ٹھہرایا اور اس سرزمین کے علما و فضلا کے حالات ہمیشہ کے لیے صفحاتِ قرطاس میں محفوظ کر دیے۔ انھوں نے اس اوّلیّت پر متعدد مقامات میں اظہارِ فخر کیا ہے اور بلاشبہ اس فخر میں وہ حق بجانب ہیں ــــ اب تصنیفات کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

۱۔ یدِ بیضا: یہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے اور آزاد کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ کتاب سیوستان (سندھ) کے زمانہ قیام میں لکھی گئی جو ۱۱۴۵ھ میں مکمل ہوئی۔ اہلِ سیوستان نے آزاد سے اس کی کئی نقلیں لیں۔ ایک شخص اس کا ایک نسخہ دہلی بھی لے گیا تھا۔ آزاد جب سیوستان سے اپنے وطن بلگرام جاتے ہوئے لاہور آئے تو یہاں ان کی ملاقات محمد فقیر اللہ آفرین لاہوری سے ہوئی۔ انھوں نے بڑی خواہش کا اظہار کر کے یدِ بیضا کا ایک نسخہ ان سے لیا۔

یدِ بیضا کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور اہلِ ذوق میں یہ اتنی جلد مقبول ہوئی کہ متعدد مقامات میں پھیل گئی، لیکن الٰہ آباد کے زمانہ قیام میں آزاد کو "موادِ تازہ"

میسّر آیا اور انھوں نے اس کا پہلا نسخہ منسوخ کرکے ایک نیا نسخہ مرتب کیا۔ یہ نسخہ ۱۱۴۸ھ میں مکمل ہوا۔ آزاد نے "طبع کلیم ید بیضا نمود" اس کی تاریخ کہی تھی۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ انھوں نے "اس کتاب کا اصلی مسودہ خود آزاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے"[۲۰] ید بیضا کا قلمی نسخہ اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (بہار۔ ہندوستان) میں موجود ہے

۲۔ روضۃ الاولیا: یہ کتاب خلد آباد کے اولیائے کرام کے حالات میں ہے، اور ۱۱۶۱ھ میں اس زمانے میں لکھی جب وہ برہان پور کی سیر کو گئے۔

۳۔ شمامۃ العنبر فی ما ورد فی الھند من سیّد البشر: یہ کتاب آزاد نے ۱۱۶۲ھ میں ان دنوں تصنیف کی جب وہ دوسری مرتبہ برہان پور گئے۔ تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں ہند کا جو ذکر آیا ہے، وہ اس رسالے میں جمع کر دیا گیا ہے۔

۴۔ مآثر الکرام: حج بیت اللہ کے لیے جانے سے پہلے آزاد نے اپنے وطن بلگرام کے علما و فضلا اور فقرا و شعرا کے حالات ضبط تحریر میں لانا شروع کیے تھے، اس کا کچھ حصّہ وہ قلم بند بھی کر چکے تھے کہ ۱۱۵۰ھ میں حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہو گئے اور یہ اہم کام درمیان ہی میں رہ گیا۔ حرمین سے واپس آنے کے بعد جب دکن میں مستقل طور سے قیام فرمایا تو وہ نامکمل مسوّدہ وطن سے منگوا کر اس کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ یہ مسودہ دو جلدوں میں مکمل کیا گیا۔ ایک جلد مآثر الکرام کے نام سے موسوم ہے اور دوسری سروِ آزاد کے نام سے! پھر مآثر الکرام کو بھی دو حصّوں میں تقسیم کیا ـــ حصّہ اوّل جسے وہ فصلِ اول کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ۸۱ فقرا و مشائخ کے حالات پر مشتمل ہے، حصّہ ثانی جسے فصل ثانی کہا جاتا ہے، ۷۱ فضلا کے حالات و کوائف کو محیط ہے۔

۵۔ سروِ آزاد: جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، یہ کتاب مآثر الکرام کی جلد ثانی ہے، اور شعرا کا تذکرہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں یا دونوں جلدیں ۱۱۶۶ھ میں پایۂ تکمیل کو

نمبر ۲۰ مقالاتِ شبلی۔ ج ۵، ص ۱۲۵

پہنچیں۔ یہ کتابیں صرف بلگرام کے اہلِ علم کے حالات تک محدود نہیں ہیں بلکہ ارضِ ہند کے بعض دیگر علما و فضلا کے سوانح بھی ان میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کتابوں کو بنیادی کتبِ حوالہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ آزاد نے یہ کتابیں معرضِ تصنیف میں لاکر بہت بڑی علمی اور تحقیقی خدمت انجام دی ہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ آزاد کی ان کتابوں پر بلگرام کے بعض حضرات نے اعتراضات بھی کیے اور ان کے جواب اور تردید میں آزاد ہی کے ایک ہم وطن شیخ غلام حسن ثمین صدیقی نے شرائف عثمانی کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ شیخ غلام حسن ثمین نے ان کتابوں کے بارے میں شرائف عثمانی کے مقدمے میں جو الفاظ لکھے ہیں، ان کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

جب آزاد نے اپنی دو کتابوں، مآثر الکرام اور سروِ آزاد، دکن سے بلگرام بھیجیں اور وہ بلگرام کے فضلا و رؤسا کی نظر سے گزریں تو وہ بڑے حیران ہوئے، کیوں کہ مآثر الکرام کے اکثر بیانات "در تاریخ و اسناد و حقائق و قراین" کے خلاف تھے۔ اس کتاب کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ "ساقط از اعتبار" ہے۔ آزاد کے ماموں اور استاد سید محمد بلگرامی سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے اس سلسلے میں آزاد سے دریافت کیا، وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔

غلام حسن ثمین صدیقی نے شرائف عثمانی میں آزاد کی تاریخی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔

مآثر الکرام اور سروِ آزاد کے جواب اور تنقید میں ایک اور کتاب "تحقیق السداد فی مزلات الآزاد" لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۱۶۷ھ میں بلگرام کے ایک غیر معروف شاعر محمد صدیق سخنور عثمانی نے لکھی۔ اس کتاب میں آزاد کی تاریخی غلطیوں کو واضح نہیں کیا گیا بلکہ ان کے اسلوبِ بیان اور شاعری کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کتاب کی وجہ تالیف ذاتی مخاصمت ہے اور اس کا لب و لہجہ نہایت درشت ہے۔ اس کے جواب میں آزاد کے ایک شاگرد عبدالقادر سمرقندی دہلوی نے تادیب الزندیق فی

تکذیب الصدیق کے نام سے کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب بڑی متانت اور معقولیت سے لکھی گئی ہے اور مصنّف کا انداز و اسلوب بہت عمدہ ہے۔

۶۔ خزانۂ عامرہ :۔ سید غلام علی آزاد نے شعرائے فارسی کے دو تذکرے لکھے، یدِ بیضا اور سروِ آزاد — ! لیکن یہ تذکرے عام نوعیت کے تھے، ان سے شعرا کے کسی خاص طبقے کی وضاحت نہیں ہوتی تھی۔ آزاد کے بھتیجے میر سیّد اولاد محمد نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک ایسا تذکرہ مرتب کیا جائے جو صرف ان شعرا کے حالات پر محتوی ہو، جنھوں نے امرا اور اربابِ ثروت کی مدح گستری کی ہو اور اپنے ممدوحین سے اس کا صلہ پایا ہو۔ آزاد اپنے اس بھتیجے کو بہت عزیز سمجھتے تھے، اس لیے آمادہ ہو گئے، اور "خزانۂ عامرہ" کے نام سے ۱۱۷۶ھ میں یہ تذکرہ معرضِ تصنیف میں آیا — اس کا قطعہ تاریخ خود آزاد نے کہا :

آزاد رقم نمود نو تذکرہ ۔۔۔ درجیب ورق ریخت نقوۂ سرہ
گنجور خرد گوہر تاریخ فشاند ۔۔۔ حق دادہ عجب خزانۂ عامرہ

خزانۂ عامرہ میں ہندوستان اور ایران کے ایک سو پینتیس ۱۳۵ شعرا کے علاوہ نظام الملک آصف جاہ، نظام الدولہ ناصر جنگ، امیر الممالک سیّد محمد خاں اور بعض دیگر معاصر امرا کے حالات اور مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کی جنگ کی روداد بھی بہترین انداز سے قلم بند کی گئی ہے۔ یورپین مؤرخین، اس کے مستند تاریخی مواد کی وجہ سے اس کو قابلِ اعتنا گردانتے ہیں۔ خزانۂ عامرہ ۱۱۷۶ھ کی تصنیف ہے، جب کہ آزاد کی عمر اکسٹھ ۶۱ برس کی ہو چکی تھی۔

۷۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان : یہ کتاب عربی زبان میں ہے جو آزاد نے ۱۱۷۷ھ میں تصنیف کی۔ کتاب چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں یہ تفصیل بیان کی ہے کہ احادیث و تفاسیر میں ہندوستان کا ذکر کہاں کہاں ہوا ہے اور کس انداز سے ہوا ہے۔ درحقیقت شمامۃ العنبر فی ما ورد فی الہند من سید البشر کو جس کا تعارف اوپر کی سطور میں ہو چکا ہے، فصل اوّل میں شامل کر لیا گیا ہے۔ دوسری

فصل علمائے ہند کے حالات میں ہے۔ یہ فصل بھی زیادہ تر آزاد کی ایک اور تصنیف "تسلیۃ الفواد" سے ماخوذ ہے۔ تیسری فصل محسنات کلام یعنی صنائع بدائع سے متعلق ہے۔ چوتھی فصل میں عاشق و معشوق کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے ہندوستانی موسیقی اور اس کی اقسام پر بھی مفصل بحث کی ہے۔ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵ء) میں یہ کتاب بمبئی سے شائع ہوئی تھی، علاوہ ازیں یہ کتاب مصر میں بھی طبع ہوئی۔

سبحۃ المرجان کے تیسرے اور چوتھے باب کا ترجمہ خود آزاد نے ۱۱۷۸ھ کو غزلان الہند کے نام سے فارسی میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ انھوں نے اپنے دوست اور شاگرد عبدالقادر مہربان اور لچھمی نرائن شفیق کی فرمائش پر کیا تھا۔ لیکن خود لچھمی نرائن شفیق اپنی تصنیف گلِ رعنا میں لکھتے ہیں کہ آزاد نے یہ ترجمہ عبدالقادر مہربان کی خواہش پر کیا تھا۔

سبحۃ المرجان کے پہلے اور دوسرے باب کا فارسی ترجمہ بنارس کے راجا مہاراج ایسری پرشاد کی فرمائش پر سید شمس الدین بن شاہ وارث علی حسنی حسینی بنارسی نے کیا تھا۔ سید شمس الدین بنارسی اس زمانے میں راجا مذکور کے حلقۂ ملازمت میں شامل تھے۔

۸۔ ماثر الامرا: آزاد کے علمی اور تحقیقی کاموں میں ماثر الامرا کا تذکرہ نہایت ضروری ہے۔ ماثر الامرا موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے فنِ تاریخ میں بقول علامہ شبلی کے "ایسی کتاب ہے، جس کی نظیر عربی زبان میں بھی باوجود اس وسعت اور فراوانیِ مواد کے موجود نہیں۔" اس کتاب کی تصنیف کا آغاز صمصام الدولہ شاہ نواز خاں نے کیا تھا جو نظام دکن کے مورثِ اعلیٰ نظام الملک آصف جاہ کے اُمرائے سلطنت میں سے تھے۔ شاہ نواز خاں صرف اس موضوع پر کتاب لکھنا چاہتے تھے کہ بابر کے زمانے سے عہدِ مغلیہ کے آخر تک جو بھی عہدہ دارانِ مملکت گزرے ہیں، ان سب کے حالات ضبطِ تحریر میں لائے جائیں۔ چنانچہ "ماثر الامرا" کے نام سے کتاب کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ شروع کیا جو پورے پانچ برس جاری رہا۔

امیر صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کا علمی پایہ بلاشبہ اس قدر بلند تھا کہ وہ اس قسم

کی کتاب کی تصنیف سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، لیکن امارت میں جو آرام طلبی کے لوازم پلئے جاتے ہیں، وہ کتاب کی تکمیل میں مانع تھے۔ امیر موصوف خود بھی اس مجبوری کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے حالات کا جائزہ لے کر سید غلام علی آزاد بلگرامی کو یاد کیا۔ آزاد ان دنوں اپنے وطن بلگرام میں تھے، وہیں قاصد بھیجا اور پورا سامانِ سفر اُن کے لیے مہیا کیا۔ مسودۂ کتاب کس درجے ترتیب کا طالب اور سخت محنت کا متقاضی تھا، اس کا اندازہ علّامہ شبلی مرحوم کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

میں نے حیدرآباد میں خود آزاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط دیکھا ہے، جس میں وہ ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ نواب صمصام الدولہ نے مآثر الامرا کا مسودہ بھیجا ہے۔ کتاب اچھی ہے لیکن ترتیب کے لحاظ سے سخت اصلاح کی محتاج ہے۔ میں نے نواب صاحب کو لکھا کہ یہ کام اتنی دور سے انجام نہیں پا سکتا۔ نواب نے میرے لیے پالکی کی ڈاک کا انتظام کر دیا ہے، دو مہینے میں اورنگ آباد پہنچوں گا اور مسودہ درست کروں گا۔[۲۱]

اندازہ کیجیے، اس دور کے امرائے سلطنت کا علمی ذوق کتنا گہرا تھا کہ ملک کے دور دراز علاقوں کے اہلِ تحقیق کا انھیں علم تھا اور وہ انھیں یاد رکھتے تھے۔ بہرکیف آزاد اورنگ آباد پہنچے اور کتاب کی اصلاح و ترتیب کا کام مکمل کیا۔ لیکن اس کے بعد سوئے اتفاق سے نواب شاہ نواز خاں ۱۱۷۱ھ کو ایک لڑائی میں مارے گئے، ان کا گھر لٹ گیا، کتب خانہ تباہ ہو گیا، ساتھ ہی یہ کتاب بھی برباد ہو گئی۔ آزاد اس سے بڑے فکر مند ہوئے۔ انھوں نے کمال تلاش و تفحص سے پورے ایک سال کے بعد مسودّے کا سراغ لگایا، لیکن مسودہ دیکھا تو تمام اجزائے کتاب درہم برہم ہو چکے تھے اور بہت سے حصے بالکل ضائع ہو گئے تھے۔ آزاد کو اس کا بے حد دکھ ہوا، اور انتہائی مشکل اور دیدہ ریزی سے ان اوراقِ پریشان کو مرتّب و مدوّن کیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ قطب الملک عبداللہ خاں کے حالات سرے سے درج ہی نہ تھے، امیر الامرا حسین علی

۲۱؎ مقالاتِ شبلی۔ ج ۵، ص ۱۳۰

خاں کا تذکرہ ابتدا سے ناقص تھا، آصف جاہ اور نظام الدولہ کا حال خود مصنّف نے چھوڑ دیا تھا۔ آزاد نے ان سب کے حالات خود لکھے اور کتاب میں شامل کیے۔ ابوالفضل اور سعد اللہ خاں کے حالات سے بھی مسودہ خالی تھا۔ غرض آزاد نے کتاب کے تمام اجزا جمع اور مرتب کیے، نامکمل حالات کی تکمیل کی، خود مصنفِ کتاب نواب شاہ نواز خاں کے حالات لکھے، حمد و نعت لکھی اور ان کی محنت اور سعی و کاوش کے نتیجے میں اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک ایسی کتاب کا اضافہ ہوا، جسے ہر صورت میں جوہرِ نایاب کی حیثیت حاصل ہے، اور جو اپنے دامنِ صفحات میں بے شمار معلومات کا ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔ یہ کتاب ۱۱۹۴ھ میں مکمل ہوئی۔

۹۔ ضوء الدراری شرح صحیح بخاری: آزاد کو اللہ نے علم و تحقیق کے تمام گوشوں سے بہرہ ور کیا تھا۔ وہ حدیث سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ علمِ حدیث انھوں نے مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی سے اور مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالوہاب طنطاوی مصری سے حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری سے انھیں خصوصی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور یہ کتاب ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھی۔ چنانچہ شروع سے لے کر کتاب الزکوٰۃ تک عربی میں اس کی شرح سپردِ قلم کی[۲۲]۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے اور اس کے قلمی نسخے برِّصغیر میں موجود ہیں۔

سید مقبول احمد صمدانی کا کہنا ہے کہ آزاد کی ضوء الدراری درحقیقت شیخ شہاب الدین کی ارشاد الساری کا بعض فوائد کی زیادت کے ساتھ ملخص ہے[۲۳]۔

۱۰۔ دو عربی دیوان: عربی کے ان دو دیوانوں کا آزاد نے سبحۃ المرجان میں ذکر کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ مجھ سے پہلے کسی ہندوستانی کا عربی دیوان مرتب نہیں ہوا، نہ کسی ہندوستانی عالم نے اس اسلوب کے اشعار کہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں نے یہ دونوں

۲۲۔ سبحۃ المرجان، ص ۱۲۲

۲۳۔ حیاتِ جلیل، حصہ دوم، ص ۱۷۵

دیوان مدینہ منورہ کے بعض فضلا کی خدمت میں بھیجے، انھوں نے ان کو گنبد خضرا کے سامنے رکھا بلکہ روضۂ اقدس کی جالیوں کے اندر ڈال دیا۔ مجھے امید ہے کہ ان دواوین کو قبولِ عام حاصل ہوگا[۲۴]۔ یہ دیوان حیدر آباد سے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۱۔ السبعۃ السیارہ: یہ آزاد کے سات دواوین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ۱۱۷۹ھ سے ۱۱۹۴ھ تک کا کلام درج ہے۔ سید مقبول احمد صمدانی کا بیان ہے کہ آزاد کے اس مجموعۂ کلام کا انتخاب، "مختارہ دیوان آزاد" کے نام سے ۱۳۲۸ھ میں مطبع آسی لکھنو سے شائع ہوا تھا۔

۱۲۔ تسلیۃ الفواد فی قصائد آزاد: یہ آزاد کے قصائد کا مجموعہ ہے، جس میں زیادہ تر نعتیہ قصائد ہیں۔ اس کا کچھ حصہ آزاد نے تراجم العلما کے عنوان سے سبحۃ المرجان میں شامل کر لیا ہے۔

۱۳۔ مظہر البرکات: یہ ایک صوفیانہ مثنوی ہے جو سات دفتروں پر مشتمل ہے۔ پہلا دفتر ۱۱۹۴ھ میں، دوسرا، تیسرا اور چوتھا ۱۱۹۵ھ میں مکمل ہوا۔ پانچویں، چھٹے اور ساتویں دفتروں میں تاریخ اختتام درج نہیں ہے۔

۱۴۔ شفاء العلیل فی اصطلاحات کلام ابی الطیب متنبی: یہ متنبی کے کلام کی مخصوص اصطلاحات کی شرح ہے۔

۱۵۔ مکاتیبِ حضرت مجدد: سید مقبول احمد صمدانی کا بیان ہے کہ آزاد نے حضرت شیخ مجدد الف ثانی کے بعض مکاتیب کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ وہی مکاتیب ہیں[۲۵]۔

۱۶۔ کشکول: اسے کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن کے کیٹلاگ میں عربی کتابوں میں رکھا گیا ہے۔ صاحبِ قاموس العالم شمس اللہ قادری، اسے فارسی کتاب بتاتے ہیں،

---

۲۴ سبحۃ المرجان، ص ۱۲۲، ۱۲۳

۲۵ حیاتِ جلیل، حصہ دوم، ص ۱۷۵

اسٹوری کا خیال ہے کہ یہ دونوں زبانوں (عربی اور فارسی) کے اشعار کا انتخاب ہوگا۔[۲۶]

۱۷۔ شجرۂ طیبہ : سیّد غلام علی آزاد کی یہ کتاب ساداتِ بلگرام کے احوال و انساب پر مشتمل ہے، اور فارسی زبان میں ہے۔

۱۸۔ مرأۃ الجمال : یہ ان ایک سو پانچ (۱۰۵) اشعار کو محیط ہے، جن میں معشوق کا سراپا بیان کیا گیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ (سبحان اللہ کلیکشن) میں ایک مخطوطہ "مثنوی سراپائے معشوق" کے نام سے موجود ہے۔ اسٹوری کا خیال ہے کہ "مثنوی سراپائے معشوق" اور "مرأۃ الجمال" ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں۔

۱۹۔ دیوانِ فارسی : یہ دیوان حیدر آباد میں ۱۳۰۱ھ میں طبع ہو چکا ہے۔

۲۰۔ سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات : یہ ۳۲ صفحات کا رسالہ ہے، جس میں آزاد نے سادات کے خصائل و مکارم بیان کیے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سادات کا خاتمہ لازماً اچھا ہوتا ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۰۸ھ میں بمبئی سے چھپ چکا ہے۔

۲۱۔ مثنوی بجواب مثنوی میر عبد الجلیل بلگرامی : یہ میر عبد الجلیل بلگرامی کی مثنوی، فرخ سیر کی کتخدائی کے متعلق ہے۔

۲۲۔ چند منظومات اور رسائل : یہ وہ رسائل ہیں، جن کا ذکر خود آزاد نے کیا ہے۔[۲۷] ان منظومات میں ممکن ہے کہ مثنوی بجواب مثنوی میر عبد الجلیل بلگرامی بھی شامل ہو۔

۲۳۔ دیوانِ اردو : عرصہ ہوا، ہندوستان کے ایک نامور محقق جناب عبد الرزاق صاحب قریشی (انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی) نے سید غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات میں ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ یہی مضمون آزاد

---

[۲۶] پرشین لٹریچر، جلد اوّل، حصہ دوم، ص ۸۲۲

[۲۷] ملاحظہ ہو سبحۃ المرجان، ص ۱۲۳

کی تصنیف مآثر الکرام (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں قریشی صاحب لکھتے ہیں کہ آزاد کی کسی تحریر سے یہ پتا نہیں چلتا کہ انھوں نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں۔ ان کے تذکرہ نگار اور سوانح نویس بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ بلکہ سید مقبول احمد صمدانی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اردو میں شعر کہنا آزاد "اپنے مرتبہ عالی سے پست اور دوں سمجھتے تھے"۔ لیکن اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی نے "گل عجائب" میں ان کے اردو دیوان کا ذکر کیا ہے اور ان کے دو شعر بھی بطور نمونے کے نقل کیے ہیں[۲۸]۔ اسد علی خاں تمنا چوں کہ آزاد کے شاگرد تھے، اس لیے ان کے بیان پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں[۲۹]۔

بلاشبہ آزاد نے بعض مقامات پر اس بات کی تصریح کی ہے کہ وہ ہندی زبان سے پوری واقفیت رکھتے ہیں، خزانۂ عامرہ میں مسعود سعد سلمان کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"من اگرچہ دو دیوان دارم، عربی و فارسی، لکن شعر ہندی را خوب می فہم واز چاشنیِ آں خط مستوفی دارم۔

یعنی میں نے اگرچہ دو دیوان لکھے ہیں جو عربی اور فارسی زبانوں میں ہیں، لیکن ہندی شعر بھی خوب سمجھتا ہوں اور اس کی چاشنی سے بہرۂ وافر رکھتا ہوں۔

۲۴۔ گریہ نامہ:۔ اردو کی ایک چھوٹی سی کتاب "گریہ نامہ" بھی ان کی طرف منسوب ہے، لیکن فی الحقیقت اس کتاب کے مصنف آزاد امروہی ہیں[۳۰]۔

آزاد کی شاعری پر اہلِ علم کی تنقیدات

کوئی محقق و مصنف اور شاعر و ادیب ایسا نہیں جس کے افکار و خیالات پر اس کے معاصرین

۲۸۔ گلِ عجائب، ص ۳

۲۹۔ مآثر الکرام، طبع لاہور، مضمون عبدالرزاق قریشی، ص ۱۵۔ بحوالہ "معارف" اعظم گڑھ۔

۳۰۔ رسالہ سہ ماہی صحیفہ، لاہور۔ ڈاکٹر نجم الاسلام کے دو مقالے۔ بعنوان "گریہ نامہ"۔

یا بعد کے اہلِ نظر نے تنقید نہ کی ہو، آزاد بھی اس سے بچ نہیں سکے۔ ان کی مآثرالکرام وغیرہ پر جس انداز سے ان کے ہم عصروں نے تنقید کی اور جس اسلوب سے انھیں طعن و مخالفت کا ہدف ٹھہرایا وہ پہلے گزر چکا۔ ان کی شاعری پر جو اعتراضات کیے گئے، اب وہ سنیے۔! پاکستان کے نامور اہلِ علم ڈاکٹر وحید قریشی نے مآثرالکرام (مطبوعہ لاہور) پر "پیش لفظ" تحریر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے ان حضرات کا ذکر کیا ہے، جو آزاد کی شاعری پر معترض ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وارستہ سیالکوٹی نے بھی تذکرۃ الشعرا میں آزاد کی شعر و شاعری پر اعتراضات وارد کیے اور ان کی بعض تصانیف سے غلطیاں نکالیں۔

ملا محمد باقر آگاہ نے اپنی تصنیف "چہار صد ایراد بر کلام آزاد" میں آزاد کی تصانیف اور شاعری سے چار سو غلطیوں کی نشان دہی کی۔ آگاہ نے اس کتاب کا دوسرا تاریخی نام "عثراتِ آزادیہ" تجویز کیا ـــــ ابجد کے اعداد سے اس کا سالِ تصنیف ۱۱۹۹ھ نکلتا ہے، جو آزاد کی وفات سے ایک برس پہلے کا زمانہ ہے۔ یہ کتاب قلمی ہے۔

ملا محمد باقر آگاہ ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے، سالِ وفات ۱۲۲۰ھ ہے۔ یہ جنوبی ہند کے ممتاز عالم اور صاحبِ فضل و کمال تھے۔ آگاہ صرف آزاد ہی سے نبرد آزما نہیں ہوئے۔ اپنے ایک جلیل القدر ہم عصر عالم بحرالعلوم مولانا عبدالعلی (متوفی ۱۲۲۵ھ) سے بھی ان کے مناظرے اور مباحثے ہوتے رہے۔

"چہار صد ایراد بر کلام آزاد" کی تصنیف کا باعث ایک دلچسپ واقعہ ہے، وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آزاد نے آگاہ کو "خاں صاحب" لکھ کر خطاب کیا۔ آگاہ اس لفظ کو اپنے لیے ننگ اور عار سمجھتے تھے، لہٰذا برہم ہو گئے اور ترکی بہ ترکی جواب دینے کی غرض سے آزاد کو "مرزا بیگ" وغیرہ لکھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتراضات کی ابتدا آگاہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ آزاد نے جواب میں آگاہ کے اشعار کی چند فنی اور ادبی غلطیاں نشان زد کر کے بھیجیں، لیکن آگاہ نے اسے مجادے پر محمول کیا اور میدان میں

اتر آئے۔ کہا کہ: الحدید یلین بالحدید (لوہے کو لوہا نرم کرتا ہے)۔ بس اتنی سی بات تھی، جس کے جواب میں پوری کتاب لکھ ڈالی[۱۳۱]

علامہ شبلی، وہ اہلِ قلم ہیں جو آزاد کے علم و فضل، وسعتِ نظر اور تحقیق و تفحص کے بہت مداح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "آزاد سب سے پہلے شخص ہیں، جس نے ہندوستان کے علما اور اربابِ عمائم کے حالات قلم بند کیے۔ آزاد نے اس اوّلیت پر خود جا بجا فخر کا اظہار کیا ہے اور بجا کیا ہے"۔ وہ آزاد کی مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان کے اختصار سے تو مطمئن نہیں، البتہ انھیں "مستند" قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کی عربی اور فارسی شاعری کو سخت لب و لہجے میں نشانۂ تنقید ٹھہراتے ہیں اور لکھتے ہیں:

آزاد کا عربی اور فارسی کلام اگرچہ کثرت سے ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے چہرۂ کمال کا داغ ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب ہیں، نہایت نادر کتبِ ادبیہ پر ان کی نظر ہے، لغات اور محاورات ان کی زبان پر ہیں، لیکن کلام میں اس قدر عجمیت ہے کہ اس کو عربی کہنا مشکل ہے۔ ان کو اس پر ناز ہے کہ انھوں نے عجم کے خیالات، عربی میں منتقل کیے ہیں، لیکن نکتہ سنج جانتے ہیں کہ یہ ہنر نہیں بلکہ عیب ہے:

خطا نمودہ ام و چشمِ آفرین دارم

فارسی کی بھی یہی حالت ہے۔ سیکڑوں، ہزاروں اشعار ہیں، ایک شعر بھی ایسا نہیں نکلتا جو اہلِ زبان کا کلام سمجھا جائے۔ آزاد نے والہ داغستانی کے حال میں لکھا ہے کہ "چوں کہ میری اور ان کی بہت کم صحبت رہی، اس لیے نہ میں نے ان کا ذکر سروِ آزاد میں کیا، نہ انھوں نے میرا ذکر ریاض الشعرا میں کیا"۔

اپنے خیال کے مطابق جو کچھ آزاد نے لکھا، صحیح لکھا، لیکن والہ داغستانی کی نسبت ان کا نرا حسنِ ظن ہے۔ والہ داغستانی، آزاد کے کلام کو اس قابل کب سمجھتا تھا کہ تذکرے

---

۱۳۱ پیش لفظ مآثر الکرام، ص ۲۱، ۲۲

میں درج کرتا۔ اس نے بجا تصریح کی ہے کہ ہندوستانی شعرا، جس زبان میں شعر کہتے ہیں خدا جانے کس ملک کی زبان ہے [۳۲]

چند واقعات و لطائف

آزاد نے بھرپور علمی و عملی زندگی گزاری اور ہر قسم کے لوگوں سے ان کی ملاقات رہی۔ دنیا کی حیاتِ مستعار میں انھیں بے شمار معاملات پیش آئے۔ وہ نہایت زندہ دل عالمِ دین تھے۔ ان کے حالات میں بہت سے لطائف و واقعات مذکور ہیں، جن میں سے چند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ لچھمی نرائن شفیق ان کے بہت مداح اور شاگرد تھے، وہ اپنی کتاب گلِ رعنا میں لکھتے ہیں کہ آزاد ایک دن مولوی قمر الدین اورنگ آبادی کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے مولوی موصوف کو بطور ہدیہ ایک کتاب پیش کی۔ درحقیقت اس شخص کو مولوی صاحب سے ایک کام تھا، کام یہ تھا کہ وہ ان سے ناظمِ شہر کے نام ایک سفارشی خط لینا چاہتا تھا۔ مولوی صاحب نے کتاب کو "وجہِ رشوت" قرار دے کر لینے سے انکار کر دیا۔ آزاد نے اس شخص سے کہا کہ تم یہ کتاب بطور ہدیہ مجھے دے دو، اس نے دے دی۔ آزاد نے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کی اور کہا کہ اب یہ کتاب میری ہے اور میں آپ کو دے رہا ہوں۔ اب اس میں شائبۂ رشوت باقی نہیں رہا۔ مولوی قمر الدین مسکرائے اور کتاب لے لی۔ حاضرینِ مجلس آزاد کے اس نکتے سے بہت محظوظ ہوئے۔

۲۔ ایک دن سید غلام حسن اور مولوی فخر الدین میں نغمہ و سرود کے مسئلے پر بحث چھڑ گئی۔ سید غلام حسن اسے جائز قرار دیتے تھے اور مولوی فخر الدین ناجائز ٹھہراتے تھے۔ مجلس میں ایک شخص حاجی حسام الدین بیٹھے تھے جو عالم بھی تھے اور بہت بڑے سیاح بھی— اور وہ اس مسئلے میں سید غلام حسن کے مؤید تھے۔ بحث نے طول کھینچا تو اسے

---

[۳۲] مقالاتِ شبلی۔ ج ۵، ص ۱۲۹

ختم کرنے کے لیے آزاد کو ایک تدبیر سوجھی۔ انھوں نے حاجی حسام الدین سے کہا کہ آپ نے مختلف مقامات کی بہت سیاحت کی ہے، آپ یہ فرمایئے کہ حضرت ہود کی قبر کہاں ہے؟ انھوں نے جواب دیا، یمن میں۔! آزاد نے کہا، جی نہیں، حضرت ہود کی قبر شام میں ہے۔ حاجی صاحب نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ یمن میں ہے، میں نے خود اس قبر کی زیارت کی ہے۔ آزاد نے جواب دیا، میں نے ایک معتبر کتاب میں پڑھا ہے کہ شام میں ہے۔ کچھ دیر دونوں میں اس پر بحث ہوتی رہی۔ سید غلام حسن اور مولوی فخر الدین اپنی بحث کو بھول کر اس بحث کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جب آزاد نے دیکھا کہ نغمہ و سرود کا جھگڑا ختم ہو چکا ہے تو حاجی حسام الدین سے کہا، آپ صحیح فرماتے ہیں، حضرت ہود کی قبر یمن میں ہے۔

۳۔ جس زمانے میں آزاد شاہ محمود کی خانقاہ میں مقیم تھے، ایک مغل بخارا سے آیا اور اسے آزاد کے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ صبح کو وہ آزاد کے کمرے میں آیا اور بڑے بے تکلفانہ انداز سے کہا کہ میں تازہ وارد مہمان ہوں، آپ نے میری دعوت نہیں کی۔ آزاد نے برجستہ جواب دیا، اتنی قدیم آشنائی کے باوجود آپ میرے لیے کوئی تحفہ نہیں لائے۔

۴۔ ایک دن آزاد، نواب آصف جاہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک ہندو، مسلمان ہونے کی غرض سے آیا اور مشرف بہ اسلام ہوا۔ عرض بیگی نے عرض کی کہ یہ نومسلم چاہتا ہے کہ اس کا نام تجویز فرمایا جائے۔ نواب آصف جاہ نے آزاد سے کہا کہ اس کا کوئی ایسا نام تجویز کرو، جس سے دینِ اسلام کی وضاحت ہوتی ہو۔ آزاد نے کہا، دین محمد۔! نواب نے کہا، ابھی کل ہی ایک ہندو مسلمان ہوا، اور اس کا نام دین محمد رکھا گیا۔ آزاد نے فوراً جواب دیا، دینِ محمد جس قدر زیادہ پھیلے، بہتر ہے۔ نواب بہت خوش ہوا، اور یہی نام رکھا گیا۔

۵۔ میسور کے سفر میں ایک دن آزاد اور نواب نظام الدولہ ناصر جنگ ہاتھی پر سوار جا رہے تھے کہ ایک ہموار صحرا سے گزر ہوا، جہاں تک نگاہ جاتی تھی،

سوار اور پیادے ہی نظر آرہے تھے۔ نواب نے آزاد سے کہا، لشکر کا یہ منظر قابلِ دید ہے۔ آزاد نے جواب دیا کہ جبر و اختیار کا مسئلہ جو مشکل ترین مسئلہ ہے، یہاں حل ہو جاتا ہے۔ ان تمام سپاہیوں کی حرکات ایک شخص کے تابع ہیں، اور وہ اس کے ارادہ (حکم) سے حرکت کرتے ہیں۔

۶۔ ایک رات نواب نظام الدولہ نے ساداتِ عرب کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چل رہا تھا، نواب کو قہوہ بہت مرغوب تھا۔ مدینہ منورہ کے ایک سید نے مزاحاً کہا، القھوۃ محرمۃ عند بعض العلماء۔ نواب نے آزاد سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کا اس مسئلے کے متعلق کیا خیال ہے۔؟ آزاد نے جواب دیا، سید صاحب کا مفہوم یہ ہے کہ قہوہ بعض علما کے نزدیک معظم ہے، کیوں کہ محرمۃ کا مطلب احترام ہے۔ نواب خاموش ہو گئے اور سید صاحب بھی بات سمجھ گئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو سید ممدوح نے آزاد کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ نے میرے قول کی نہایت عمدہ توجیہ کی۔

۷۔ ارکاٹ کے زمانۂ قیام میں ایک روز ایک ہرن کو نواب نظام الدولہ کے خیمے کے پاس لا کر بٹھایا گیا۔ نواب نے حاضرینِ مجلس سے پوچھا، آپ کی کیا رائے ہے، اسے ذبح کیا جائے یا آزاد کر دیا جائے؟ نواب صاحب ہرن کے شکار کے بہت شوقین تھے، ان کی رغبتِ طبع کے پیشِ نظر حاضرین نے جواب دیا، ذبح کرنا چاہیے۔ نواب نے آزاد سے پوچھا تو آزاد نے کہا، مجھے ایک قصہ یاد آگیا ہے، اگر اجازت ہو تو سناؤں، نواب نے کہا، سنائیے۔ آزاد نے کہا، ایک مرتبہ ایک بادشاہ نے ایک قیدی کے قتل کا حکم جاری کیا۔ قاعدے کے مطابق قتل سے پہلے اس شخص سے پوچھا گیا کہ تمھاری کوئی خواہش ہے؟ اس نے کہا، میری یہ خواہش ہے کہ قتل ہونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے مجھے بادشاہ کی مجلس میں باریابی کا شرف بخشا جائے۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے اسے دربار میں لانے کا حکم دیا۔ دربار میں اس سے پوچھا گیا کہ کچھ کہنا چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا، کچھ نہیں کہنا چاہتا،

لیکن جب بادشاہ اُٹھ کر جانے لگا تو قیدی عرض گزار ہوا کہ بادشاہ سلامت میں قصوروار اور قابلِ قتل ہوں، لیکن چند لمحے آپ کی صحبت میں گزار چکا ہوں، اس طرح آپ پر میرا حق صحبت ثابت ہوتا ہے۔ بادشاہ اس حسنِ ادا سے بہت خوش ہوا، اور اُسے معاف کر دیا۔ یہ قصہ سنانے کے بعد آزاد نے کہا، یہ ہرن بھی آپ کی صحبت میں بیٹھ چکا ہے، آگے آپ کی مرضی! نواب صاحب مسکرائے اور ہرن کا نام آزاد رکھ کر اسے آزاد کر دیا۔

۸- ارکاٹ ہی کے دورانِ سفر کا واقعہ ہے کہ ایک دن آزاد چند احباب کے ساتھ خیمے میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک درویش شاہ جمیل نامی ان کے پاس آئے، وہ ان کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے اور ان سے خوش اخلاقی سے باتیں کیں۔ جب شاہ جمیل چلے گئے تو حاضرینِ مجلس نے کہا، آپ نے بھی کس کی تعظیم کی، یہ تو فلاں شخص کا باورچی ہے، آزاد نے جواب دیا، میں نے لباسِ فقیر کی تعظیم کی ہے۔ اس کے بعد شاہ جمیل کی آمد و رفت کا سلسلہ جب تک جاری رہا، آزاد ان کی اسی طرح تعظیم کرتے رہے، جس طرح پہلے دن کی تھی ___ اتفاق سے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ، ہمت خاں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کے بعد شاہ جمیل، آزاد سے ملنے آئے تو ہمت خاں کے مدار المہام امانت اللہ خاں کو بھی ساتھ لائے۔ امانت اللہ خاں نے پچاس ہون طلائی دکنی سکے آزاد کی خدمت میں پیش کیے اور کہا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمت خاں کی ذات سے آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔

۹- ایک دفعہ اورنگ آباد میں آزاد کی شال چوری ہو گئی۔ چند روز بعد ان کے ایک دوست نے دیکھا کہ ایک آدمی اسے بازار میں فروخت کر رہا ہے۔ اس دوست نے وہ شال خریدنے کے بہانے اس سے لے لی اور لا کر آزاد کو دکھائی، اور کہا کہ اس آدمی سے پوچھنا چاہیے کہ یہ شال اس نے کہاں سے لی۔ آزاد نے کہا، کہ میں ایک چھوٹے آدمی کے ساتھ عدالت میں کھڑا ہونا پسند نہیں کرتا۔ اور یہ شال اسے واپس لوٹا دی۔

۱۰۔ جس زمانے میں نواب نظام الدولہ، مظفر جنگ سے، جس کو فرانسیسیوں کی امداد حاصل تھی، نبرد آزما تھا۔ ایک روز آزاد نے نمازِ مغرب میں سورہ اذا جاء نصر اللہ والفتح، پڑھی۔ شرکائے نماز بہت خوش ہوئے اور آزاد سے کہا کہ آپ نے یہ سورۃ بالکل برموقع پڑھی ہے، ان شاء اللہ ہماری فتح ہوگی اور یدخلون فی دین اللہ افواجاً کے مطابق فوجِ نصاریٰ مطیع ہو جائے گی۔ آزاد نے کہا، میں نے یہ سورۃ قصداً فال لینے کی غرض سے پڑھی ہے —— چنانچہ دوسرے روز نواب نظام الدولہ کی فتح کا اعلان ہوا، اور آزاد کی فال نے حقیقت کی شکل اختیار کر لی۔

اس قسم کے بہت سے واقعات و لطائف ہیں جو آزاد کے بارے میں مرقوم ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد بڑے عالی ظرف، نکتہ آفرین، بذلہ سنج، شگفتہ مزاج، بلند اخلاق اور حاضر دماغ تھے۔ لچھمی نرائن شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد کی بزم میں ہزل کا گزر نہ تھا۔ ان کے قلم یا زبان پر کبھی تلخ اور مبتذل لفظ نہیں آیا۔ خود ان کا اپنا شعر ہے:

ز حرفِ تلخ مبرا است خامۂ آزاد　　　که زہر ریختن از نیشکر نمی آید

اپنی اس خصوصیت کا وہ صاف لفظوں میں اظہار کرتے ہیں کہ لوگوں سے بہت زیادہ اختلاط کے باوصف اور ہر قسم کے افراد سے شدید امتزاج کے باوجود تکریم و تعظیم ہمیشہ میرا بنیادی وصف رہا ہے۔ میرا قلم ابتذال سے محفوظ اور میری زبان ہرزہ گوئی سے مصئون ہے۔ خود مجھے بھی سب نے سزاوارِ اکرام قرار دیا ہے۔ امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے روز بھی قربِ بساطِ عزت سے مسرور ہوں گا[۳۳]

ضبط و تحمل

آزاد نہایت صلح کل، نرم خو اور حلیم الطبع عالم تھے۔ ضبط و تحمل کے پیکر تھے

۳۳ھ خزانۂ عامرہ، ص ۲۲

لوگوں سے لڑنا اور جھگڑنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ اگر کوئی ناگوار بات سنتے تو صبر کرتے اور خاموش ہو جاتے۔ کہا کرتے کہ اندمالِ زخم ہنر ہے اور انقطاع بے ہنری۔ دانشمند کو چاہیے کہ عمارت کو گرنے سے بچائے، ڈھانے کا کام تو ہر ایک کر سکتا ہے۔ انھوں نے طبیعت کچھ ایسی پائی تھی کہ کوئی شخص انھیں ذہنی یا مالی تکلیف پہنچاتا تو انتقام نہ لیتے اور بدی کے بدلے میں بھلائی کرتے۔ ان کا قول ہے کہ سب سے بڑا انتقام یہ ہے کہ مخالف تمھارے سامنے اپنی التجا پیش کرنے پر مجبور ہو جائے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں:

آزاد من بدشمنِ خود بد نمی کنم　　　نامنصف است ہر کہ نہ عامی دہد مرا

ان میں یہ خوبی تھی کہ دو شخصوں میں کشیدگی یا تلخی پیدا ہو جاتی تو اپنے حسنِ تدبیر سے اس کو رفع کر دیتے۔ نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں ان کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

بر رشتۂ دوستی ما گرہے عجب افتادہ بود، بناخنِ تدبیر شما واشد۔[۱۳۴]

ہماری دوستی کے تعلق میں عجب گرہ پڑ گئی تھی، لیکن آپ کے ناخنِ تدبیر سے کھل گئی۔

فقیرانہ زندگی

حاکم لاہوری نے "مردم دیدہ" میں آزاد کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آزاد کی زندگی کا بڑا حصہ اربابِ دولت کی صحبت اور اصحابِ امارت سے وابستگی میں گزرا، لیکن وہ جلبِ منفعت سے ہمیشہ گریزاں رہے، انھوں نے کبھی سرکاری اثر و رسوخ پر اظہارِ فخر نہیں کیا، کبھی اپنے آپ کو اقتدار و ثروت کی چوکھٹ پر نہیں گرایا اور کبھی منافع دنیا جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی ساری زندگی فقیرانہ شان اور درویشانہ انداز سے گزری، وہ غرور سے پاک اور فخر سے مبرّا تھے۔ تواضع، حلم اور نرمی ان کا اصل جوہر تھا۔ بلند اخلاقی اور خوش مزاجی کی دولت سے مالا مال تھے۔ غریبوں کے ہمدرد، محتاجوں کے معاون اور فقیروں کے مددگار تھے۔ سب سے خوش

---

[۱۳۴] منشآت شاہ نواز خاں

رہتے اور ہر ایک کو خندہ پیشانی سے ملتے[۳۵]

لچھمی نرائن شفیق نے گلِ رعنا میں آزاد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو اس دنیا میں سب سے کم درجے کا ہے، وہ عالمِ آخرت میں سب سے اونچے درجے پر فائز ہوگا۔ آزاد خود کہتے ہیں:

سرفراز آں جہاں باشد ذلیل ایں جہاں — حرفِ ختم صفحہ تاجِ صفحہ آیندہ ہست

شفیق ان کی اس درجے تعریف کرتے ہیں کہ مبالغے کا شُبہ ہوتا ہے، تاہم یہ بالکل صحیح ہے کہ خود آزاد نے اصحابِ اقتدار سے اپنی ذات کے لیے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، البتہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے اور اپنے تعلقات و رسوخ سے فیض یاب کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ وہ حکامِ وقت سے مخلوقِ خدا کی پُرزور سفارش کرتے اور جو شخص کسی کام سے ان کے پاس آجاتا، بلا تامل اس کے ساتھ چل پڑتے۔ اس بارے میں وہ کتنی عمدہ بات بیان کرتے ہیں۔

اس خادمِ خلائق کا نقطۂ نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اگر دستِ کوتاہ میں طاقت رسائی نہیں تو نہ سہی، پاؤں تو ضرورت مند کے ساتھ چل کر جا سکتے ہیں۔ اگر انگشتِ ناتواں میں طاقتِ گرہ کشائی نہیں تو کیا ہوا، زبانِ قلم سے تو سفارش کی جا سکتی ہے[۳۶]

حاکمِ وقت سے راہ و رسم کی تلقین

آزاد بلاشبہ طبعاً مستغنی اور بے نیاز قسم کے شخص تھے، اور ان کا اسلوبِ زندگی ایک حد تک درویشانہ اور فقیرانہ تھا، لیکن وہ راہ و رسمِ دنیا سے بھی خوب آگاہ تھے۔ ان کے ایک مداح شاگرد لچھمی نرائن شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد کہا کرتے تھے، آدمی خواہ دنیا دار ہو یا فقیر، جس شہر میں رہے، اس کے حاکم سے تعلقات اور راہ و رسم ضرور رکھے، اس لیے کہ بیشتر امور میں حاکم کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ انسان کسی ایسی ناگہانی مصیبت سے دوچار ہو جاتا ہے کہ حاکم کی اعانت کے بغیر اس

---

۳۵ مردمِ دیدہ، ص ۳۵ ۳۶ خزانۂ عامرہ

کا رفع ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

آزاد کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ یہ محض ان کا خیال یا نظریہ نہ تھا بلکہ اس پر ان کا عمل بھی تھا۔ صمصام الدولہ شاہ نواز خاں نے جو خطوط آزاد کے نام تحریر کیے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ آزاد دکن کے سیاسی حالات میں عملی دلچسپی لیتے تھے اور نواب نظام الدولہ اور صمصام الدولہ وغیرہ ملکی معاملات اور سیاسی مسائل میں ان سے باقاعدہ مشورہ لیتے تھے۔ ۱۱۷۰ھ میں جب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کو ان کے منصب سے معزول کر دیا گیا تو آزاد ہی نے شاہ نواز خاں کی حمایت کی اور وہ اپنے منصب پر بحال ہوئے۔

مال و دولت سے بے نیازی

سید غلام علی آزاد کی زندگی کا بیشتر حصہ دکن کے حکمران نظام الدولہ ناصر جنگ کی رفاقت میں بسر ہوا، لیکن اس مردِ قلندر اور بندۂ خدا نے نہ کبھی کوئی دنیوی اعزاز حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی اور نہ کسی جاگیر کی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔ نواب موصوف سے ان کی رفاقت خود نواب کے لیے وجہ افتخار تھی اور وہ بربنائے عقیدت ان کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ آزاد کا اس میں کوئی دنیوی مقصد مضمر نہ تھا۔ اپنی اس خودداری کا وہ بڑے فخر کے ساتھ اعلان کرتے ہیں اور خزانۂ عامرہ میں سر اونچا کر کے واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

ہر چند با امرا ارتباط دارم و با رؤسا اختلاط، اما سر رشتۂ استغنا نگسیختہ ام، و آبروئے فقر بر درِ غنا نریختہ۔ بلے عندلیب را از مصاحبتِ گل زرے و ماہی را از مجالستِ صدف گوہرے مطمحِ نظر نمی باشد، و دریں معنی زمزمہ می سنجم۔

حبابم مشتِ من از گوہرے منت تہی آمد نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم[۳۷]

بلاشبہ میں نے وقت کے امرا و رؤسا سے ربط و تعلق کی بنیادیں استوار کیں، لیکن سر رشتہ

---

[۳۷] خزانۂ عامرہ، ص ۳، ۴۔

استغنا کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور آبروئے فقر کو دروازۂ ثروت پر نہیں جھکایا۔ عندلیب اگر مصاحبتِ گل اختیار کرتی ہے تو اس کا مقصود حصولِ زر نہیں ہوتا اور مچھلی ہم نشینیِ صدف کو ترجیح دیتی ہے تو اس کے پیشِ نگاہ تلاشِ گوہر نہیں ہوتا۔ یہی صورتِ حال میری ہے اور میں نغمہ سنج ہوں کہ:

میں وہ حباب ہوں جس کے ہاتھ زر و جواہر کی منت پذیری سے خالی ہیں، میں اس میں کوئی عیب نہیں سمجھتا کہ اپنے آپ کو دریا آشنا کر دوں۔

فرماں روایانِ دکن آزاد سے بے حد عقیدت رکھتے اور ان کی انتہائی توقیر و تکریم کرتے تھے، اگر آزاد چاہتے تو اس سے فائدہ اٹھا کر مال و دولت کے انبار لگا سکتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت میں اس درجہ استغنا بھرا ہوا تھا کہ جاہ و حشمت اور دولت و ثروت کو کبھی حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آنے دیا۔ نظام الملک نواب آصف جاہ کے انتقال کے بعد جب نظام الدولہ ناصر جنگ تختِ دکن پر متمکن ہوا تو آزاد کے دوستوں اور بہی خواہوں نے کہا کہ اب آپ جو منصب چاہیں حاصل کر سکتے ہیں اور اصرار کیا کہ اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے، لیکن اس فقیر منش عالمِ دین نے جواب دیا:

آزاد شدہ ام، بندۂ مخلوق نمی توانم شد۔

میں دنیا طلبی کے جھمیلوں سے آزاد ہوں، بندۂ مخلوق نہیں بننا چاہتا۔

اور ساتھ ہی یہ شعر پڑھا:

دریں دیار کہ شاہی بہ گدا بخشند غنیمت ست کہ مارا ہمیں بما بخشند

بلاشبہ آزاد امرا و اغنیا اور ملوکِ وقت سے مراسم رکھتے تھے، چنانچہ افتخار دولت آبادی نے تذکرۂ بے نظیر میں لکھا ہے کہ وارستہ لاہوری نے آزاد کو "نوکر پادشاہی" قرار دیا ہے جو ان کے نزدیک صحیح نہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ آزاد نے کبھی کسی بادشاہ یا امیر کی ملازمت اختیار نہیں کی —— لیکن ہمارے نزدیک اس سلسلے میں افتخار دولت آبادی کا وارستہ لاہوری پر خفگی کا اظہار کرنا اور ان کی بات کو کلیتہً غلط قرار دینا محلِ نظر ہے۔

بلاشبہ امرائے مملکت سے آزاد کی تمام تر بے نیازی اور کامل استغنائے قلبی کے باوصف یہ ماننا پڑے گا کہ وہ نواب نظام الدولہ اور نواب صمصام الدولہ وغیرہ سے گہرے مراسم رکھتے تھے اور سفر و حضر میں اکثر و بیشتر ان کے ساتھ رہتے تھے، اور یہ نواب صاحبان ان کی مالی کفالت کرتے تھے۔ اس لیے وارستہ کے بیان کی کلیتہً تغلیط کرنا واقعات کے منافی ہے۔ آزاد نے ان حکمرانوں کی مدح گستری بھی کی ہے، اگرچہ وہ اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ مدح انھیں حج بیت اللہ کے شوقِ بے تابی کے لیے کرنا پڑتی۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ آزاد نے ان کی مدح میں قلم و زبان کو حرکت دی ہے۔ حج کے لیے کسی سے زاد و راحلہ کا طالب ہونا اور پھر اس کے لیے اس کی تعریف کرنا بھی تو آخر کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بات شرائطِ حج میں کب داخل ہے کہ اگر اپنے پاس خرچ نہیں تو دوسرے سے مانگنا اور اس کی تعریف کرنا شروع کر دو۔

بہر حال اگر آزاد نے نواب کی مدح کی ہے، اور اس نے مدح سے متاثر ہو کر سفرِ حج کے لیے روپے کا انتظام کر دیا یا کسی حکمران نے آزاد کی کفالت کی ہے تو یہ کوئی بُری بات نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نواب ان سے بہت تعلق رکھتا تھا اور ان کا عقیدت مند تھا۔ آزاد اس کا صاف لفظوں میں ذکر کرتے ہیں۔

بافقیر و نواب نظام الدولہ محبت و اخلاص فوق البیان بود و از ابتدائے ملاقات تا انتہائے ایامِ حیات مثل من آزاد را در دامِ حسنِ خلق خود مقید داشت، ہر چند خواستم کنارہ گیرم، نگزاشت، غفر اللہ لہ۔[۳۸]

یعنی اس فقیر اور نواب نظام الدولہ کے درمیان اس قدر محبت و اخلاص تھا کہ بیان سے باہر ہے، ابتدائے ملاقات سے لے کر نواب کی وفات تک یہی صورت حال رہی۔ یوں سمجھیے کہ مجھ آزاد کو اس نے اپنے اخلاقِ حسنہ کے دام میں قید کر رکھا تھا۔ ہر چند میں اس سے کنارہ کش

---

۳۸ خزانۂ عامرہ، ص ۵۵

ہونا چاہتا تھا، لیکن وہ مرحوم مجھے چھوڑتا ہی نہ تھا۔

تاہم ان سب باتوں کے باوجود یہ بہرکیف حقیقت ہے کہ آزاد کا جذبۂ استغنا بہت بلند تھا اور وہ ہرگز کسی کے دستِ نگر ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ نواب کی اگر انھوں نے مدح کی ہے، یا حج کے لیے زادِ راہ طلب کیا ہے، یا نواب نے دیا ہے تو اس کے پیچھے دونوں کا باہمی تعلق، بے پناہ محبت، پُرخلوص عقیدت اور بے تکلفی کارفرما ہے۔

فقر کی بہترین راہ

سید غلام علی آزاد بلگرامی، جہاں علم و فضل میں باکمال تھے، وہاں فکر و عمل کے اعتبار سے بھی بلند مرتبے کے حامل تھے اور فقر و درویشی کی بہترین راہ پر گام فرسا تھے۔ اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر شفیق نے گلِ رعنا میں درج کیا ہے، جو انھوں نے آزاد سے بیان کیا تھا۔ فرماتے ہیں، حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد میں نے اپنے دل میں سوچا کہ فقر کئی اقسام میں منقسم ہے، مجھے کون سا فقر اپنانا چاہیے۔ کامل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پیری اور مشیخت سے تو بہرطور آزاد ہی رہنا چاہیے، البتہ جادۂ صدق کو اختیار کرنا اور معاملات میں صاف رہنا ضروری ہے، کیوں کہ جھوٹ اگر دنیا کے معاملات میں فروغ نہیں پا سکتا تو امورِ دینی میں تو اور بھی بدتر ثابت ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کرامات گوئی، خواب و رؤیا کا معاملہ اور پیری مریدی کا سلسلہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اس کی اصلاح ناممکن ہے۔ صدق و صفا اور خوش معاملگی ناپید ہوگئی ہے اور عرس مجموعۂ بدعات بن کر رہ گئے ہیں ـــــ شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد فرمایا کرتے تھے، عرس کو بے کمال لوگوں نے اپنی شہرت کا وسیلہ اور عوام کو بے وقوف بنانے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

آزاد رقم طراز ہیں کہ نفع دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک اُخروی اور دوسرا دنیوی۔ صلۂ دنیوی دنیاداروں کی مداحی سے ملتا ہے اور صلۂ اُخروی مدحتِ نبوی اور توصیف اکابرِ دین سے نصیب ہوتا ہے۔ مَیں نے مدحتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اشعار کہے ہیں اور اس طرح اپنی شفاعتِ اُخروی کے لیے ایک وسیلۂ قوی پیدا کر لیا ہے۔

چوں مدح رسول کام من شد حسان الہند نام من شد[۳۹]

جہاں تک امراو اغنیا کی مدح کا تعلق ہے، آزاد کا دعویٰ ہے کہ:

ایں دریوزہ گرِ فیض الٰہی در تمام عمرِ خود لب بمدح امیرے نکشود و نامۂ خود بستائشِ دولت مندے سیاہ نہ نمود، و دریں باب ہوی می کشم:

مہر برلب کرد آزاد از ثنائے اغنیا نیست ارباب دول را باب در دیوان ما[۴۰]

یعنی فیض الٰہی کے اس دریوزہ گر نے عمر بھر کسی امیر کی مدح میں لب نہیں کھولے اور کبھی اپنے نامۂ اعمال کو کسی دولت مند کی ستائش سے سیاہ نہیں کیا۔

مآثر الکرام میں آزاد لکھتے ہیں کہ جس روز سے میں نے اپنے ناصیۂ اخلاص کو بیت اللہ کی چوکھٹ پر حضور خداوندی میں جھکایا ہے، دنیا کے تمام لوگوں سے بیگانگی اختیار کرلی ہے۔

حسان الہند

سید غلام علی آزاد بلگرامی برصغیر کے وہ عالمِ دین ہیں، جنھوں نے علم و فضل میں بے حد شہرت حاصل کی اور تمام اصنافِ علم میں نام پیدا کیا۔ وہ اپنی فضیلت و کمال کی وجہ سے اپنے تمام معاصرین پر فوقیت رکھتے تھے اور اپنی زندگی ہی میں جیّد عالم اور نامور فاضل کے طور پر مشہور ہو گئے تھے۔ مدحتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا مرغوب اور دل پسند موضوع تھا۔ اسی بنا پر ان کے عہد ہی میں انھیں حسان الہند کے لقب سے یاد کیا جانے لگا تھا۔ اس لیے کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرح انھوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں عربی زبان میں متعدد قصائد لکھے اور بے شمار شعر کہے۔ ان کا اپنا شعر ہے:

چوں مدح رسول کام من شد حسان الہند نام من شد

ان کے شاگرد قاضی عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی اور دیگر حضرات نے انھیں اسی لقب سے یاد کیا ہے۔

---

[۳۹] خزانۂ عامرہ، ص ۴

[۴۰] ایضاً، ص ۳

معاصرین سے علمی صحبتیں اور ادبی لطیفے

غلام علی آزاد کی ولادت سے دو سال بعد (۱۱۱۸ھ میں) دودمانِ تیموریہ کے عظیم الشان حکمران اورنگ زیب عالمگیر نے وفات پائی اور اس کے بعد دورِ زوال شروع ہوگیا۔ اس لحاظ سے آزاد اس عہد کے اہلِ علم ہیں، جب سلطنتِ مغلیہ کے عروج کا دور ختم ہوچکا تھا اور اس کے آفتابِ اقتدار کا وسعت پذیر سایہ سکڑ رہا تھا۔ اب ارکانِ دربار بھی اس مرتبۂ علمی کے حامل نہ تھے، جو تیموری درباروں کی علمی اور ادبی روایات کا خاصہ رہا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہندوستان علم و ادب کی دولت سے تہی دامن ہوگیا تھا اور اس ملک کی گود قابل شخصیتوں کے وجود سے خالی ہوگئی تھی۔ یہاں سید عبدالجلیل بلگرامی، ملا نظام الدین، شیخ محب اللہ بہاری، والہ داغستانی اور شیخ علی حزین خاں آرزو جیسے اصحابِ فضل و کمال اور نکتہ آفرین موجود تھے۔ یہ وہ حضرات ہیں، جن میں سے اکثروں سے آزاد کی صحبتیں رہیں۔ ان صحبتوں سے پتا چلتا ہے کہ آزاد علم و فضل، عادات و اطوار، حاضر دماغی، زود فہمی نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی میں کتنے اونچے مرتبے کے حامل تھے۔ ان علمی صحبتوں اور ادبی لطیفوں کی چند مثالیں مقالاتِ شبلی میں علامہ شبلی نے بیان کی ہیں، جو بڑی دلچسپ اور معلومات آفرین ہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ علامہ شبلی پہلے اہلِ قلم ہیں، جنھوں نے "الندوہ" لکھنؤ (اپریل ۱۹۰۵ء) میں آزاد پر مضمون لکھا اور اردو داں حضرات کو ان سے متعارف کرایا۔ اگرچہ یہ مضمون بہت مختصر اور تشنہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس اختصار میں بہت کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔ ذیل کی چند سطور میں اسی مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۔ ایک دن نظام الدولہ نواب ناصر جنگ شہید دربار میں آئے، اہل سخن اور شعرا و فضلا میں سے موسوی خان، جرأت اورنگ آبادی، صمصام الدولہ شاہ نواز خاں میرزا جان رسا، رضوی خان اور نقد علی خاں ایجاد وغیرہ ہم عنان تھے۔ نواب نے ایک

تازہ غزل پڑھنا شروع کی، جو آزاد سے اصلاح پا چکی تھی۔ ایک شعر میں نواب موصوف نے "سرو" کو "خراماں" باندھا تھا۔ اس شعر پر تمام فضلائے حاضرین کی معترضانہ نگاہیں اُٹھیں، نواب نے حیران ہو کر آزاد کی طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ شعر آپ کی نظر سے گزر چکا ہے، آزاد نے فوراً سند میں مرزا صائب کا شعر پڑھا:

یک رہ بر آر از آستیں دست نگاریں در چمن   تا دستہا پنہاں کند سرو خراماں در بغل

جرأت نے کہا تعجب ہے کہ مرزا صائب نے سرو کو خراماں باندھا۔ سرو چلتا پھرتا نہیں، خراماں کیوں کر ہو سکتا ہے؟ آزاد نے جواب دیا، شاعری کی بنیاد تخیل پر ہے۔ شاخیں ہوا کے اشارے سے ہلتی ہیں اور ان سے درخت جھومتا نظر آتا ہے۔ یہی درخت کا خراماں ہونا ہے۔ اسی لیے عربی میں شاخ کو میاد کہتے ہیں۔ صائب کے علاوہ اور شعرا نے بھی سرو کو خراماں باندھا ہے۔ خواجہ حافظ کا شعر ہے:

سرو از صبا گر دد چناں تا چوں قدرت باشد رواں   ہر چند بخرامد بآں سرو خراماں کے رسد

۲۔ شیخ علی حزین اپنے زمانے کے سب سے زیادہ مشہور شاعر تھے۔ وہ ایران سے ہندوستان آرہے تھے۔ جب سندھ کے علاقہ سیوستان میں پہنچے تو سید غلام علی آزاد سیوستان سے روانہ ہو کر وطن جارہے تھے، راستے میں ایک مقام پر اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ بڑی پُر لطف مجلسیں رہیں۔ حزین کا معیار بہت اونچا تھا، وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، لیکن آزاد کی بڑی قدر دانی کی، اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں آزاد کو تحفۃً دیں۔ اس کے بعد آزاد نے بھی ان کے مرتبے کو خوب پہچانا، جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ خانِ آرزو نے حزین پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان میں سے بعض کا جواب آزاد نے خزانہ عامرہ میں دیا ہے اور اچھے انداز سے بادلائل ان کا دفاع کیا ہے۔

خان آرزو سے آزاد کا غائبانہ تعارف تھا۔ انھوں نے اپنے تذکرہ مجمع النفائس میں دو مقامات پر آزاد کا ذکر کیا ہے اور بہت اچھی طرح کیا ہے۔

۳۔ شاہ آفرین لاہوری پنجاب کے مشہور شاعر تھے۔ جس زمانے میں آزاد بلگرام سے سیوستان (سندھ) جارہے تھے، اس زمانے میں لاہور سے گزرتے ہوئے ۲۹ محرم

۱۱۴۳ھ کو ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ دوسری مرتبہ آزاد سندھ سے واپس بلگرام جاتے ہوئے رجب ۱۱۴۷ھ کو لاہور میں اُترے اور پانچ دن یہاں مقیم رہے۔ اس زمانے میں آزاد یدِ بیضا لکھ چکے تھے، آفرین نے بڑے اصرار سے اس کی نقل لی اور اپنی مثنوی انبانِ معرفت ان کی نذر کی۔ ان پانچ دنوں میں دونوں فضلا کی بڑی علمی اور ادبی صحبتیں رہیں۔

۴۔ حاکم لاہوری شاعر اور تذکرہ نگار تھے، شاہ آفرین لاہوری کے شاگرد تھے اور ابتدا میں دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد کو یہ تعلق ختم کرکے واقف لاہوری کے ساتھ حرمین شریفین کا عزم کیا۔ واقف تو راستے میں بیمار پڑ گئے اور سورت ہی میں رہ گئے۔ حاکم کو البتہ سعادتِ حج نصیب ہوئی۔ حج سے واپس آئے تو حاکم اور واقف دونوں اورنگ آباد گئے، وہیں آزاد سے ملاقات ہوئی۔ حاکم نے اورنگ آباد کے زمانۂ قیام میں شعرا کا تذکرہ لکھا اور التزام یہ کیا کہ صرف ان شعرا کا حال قلم بند کیا، جن کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کتاب مکمل ہوئی تو "تحفۃ المجالس" اس کا نام رکھا۔ آزاد سے کتاب کے بارے میں بات کی تو انھوں نے کہا موضوع کی مناسبت سے "مردمِ دیدہ" زیادہ مناسب رہے گا۔ حاکم پھڑک اُٹھے اور یہی نام رکھا۔ خاتمۂ کتاب میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

نسخۂ تازہ کردہ ام تالیف	کہ ازو تازہ شد روانِ سخن
نام او کرد مردمِ دیدہ	آنکہ بودہ است رازدانِ سخن
اسمِ سامیِ او غلام علی است	سروِ آزاد بوستانِ سخن

۵۔ والہ داغستانی جو اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر اور سخن ور تھے، ان سے بھی آزاد کو ملنے اور کچھ عرصہ ہم مجلس رہنے کا موقع ملا۔ جس زمانے میں آزاد سیوستان سے دہلی جا رہے تھے، اتفاق سے ان ہی دنوں والہ داغستانی بھی ایران سے ہندوستان آ رہے تھے، دونوں کی راستے میں ملاقات ہوئی اور سیوستان سے دہلی تک دونوں ہم سفر و ہم عنان رہے۔ دورانِ سفر میں ایک دن والہ نے آزاد سے کہا کہ آؤ ہم دونوں

گھوڑے دوڑائیں۔ آزاد نے پہلے تو انکار کیا، لیکن والہ کا اصرار بڑھا تو مجبوراً ان کی بات ماننا پڑی۔ والہ ایرانی گھوڑے پر سوار تھے اور آزاد کا گھوڑا ہندی نسل کا تھا۔ دوڑ شروع ہوئی تو والہ کا ایرانی گھوڑا آزاد کے ہندی گھوڑے کا مقابلہ نہ کر سکا اور پیچھے رہ گیا۔ آزاد آگے نکل گئے۔ والہ کو اس پر بڑا دکھ ہوا۔ اثنائے راہ میں ایک دن آزاد نے اپنا یہ شعر پڑھا:

زدہ ام بر سر جہان پا پوش　　　بے سبب ایں برہنہ پائی نیست

والہ نے خیال کیا کہ آزاد کو میدانِ شعری میں شکست دینے کا موقع ہاتھ آگیا ہے، بولے ہمارے ملک میں "کفش" کہتے ہیں، "پا پوش" نہیں کہتے۔ آزاد ہار ماننے اور چپ رہنے والے کب تھے، فوراً اپنی تائید میں مرزا صائب کا یہ شعر پڑھ دیا:

چرخ دودے است کہ از خرمنِ من خاستہ است　　　خاک گردے است کہ افشاندۂ پا پوشِ من است

والہ صائب کا یہ شعر سن کر خاموش ہو گئے۔

ایک روز والہ نے آزاد سے پوچھا کہ لفظ "طیار" طائے حطی سے ہے یا تائے قرشت سے؟ آزاد نے جواب دیا میرزا محمد رفیع کے شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ طائے حطی سے ہے:

دارد چو مرغ عمرت پرواز بس بہ سرعت　　　اسبابِ عیش و عشرت طیار گو نہ باشد

پھر کہا کہ میرزا سعید اشرف کا کلام بھی اس کی تائید کرتا ہے:

می پرو باز از ہوائے عشق او رنگ از زخم　　　گرچہ باز نجیر موج بادہ طیارش کنم

۶۔ نور العین واقف سے آزاد کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ مختلف مواقع پر آزاد نے ان کی بڑی مدد کی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اورنگ آباد سے ہندوستان کے کسی علاقے کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ڈاکوؤں کے جنگل میں پھنس گئے اور تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ صرف ایک عینک اور تھوڑا سا پارہ جو وہ اپنے پاس رکھتے تھے، بچ گیا۔ واقف نے بالا پور پہنچ کر آزاد کے پاس ایک آدمی بھیجا اور بذریعہ خط حقیقتِ حال سے مطلع کیا۔ خط میں یہ شعر لکھا:

عینکے و پارۂ سیماب با ما ماندہ است　　　چشم بے خواب و دل بے تاب با ما ماندہ است

آزاد نے مدد کے لیے ہنڈوی کے ذریعے کچھ روپے ارسال کیے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دوستوں اور ضرورت مندوں کا کتنا خیال رکھتے تھے اور ان کی مدد کرنا کتنا ضروری سمجھتے تھے۔

۷۔ ایک دن نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید کے ہاں اہل سخن جمع تھے، کسی نے مرزا صائب کا یہ شعر پڑھا:

اہل کمال را لبِ اظہار خامشی است   منت پذیر ماہِ تمام از ہلال نیست

اس کے معنی میں سخت اختلاف ہوا، اور واقعی اس میں اختلاف کی گنجائش تھی۔ ماہِ تمام یعنی بدر کا ہلال سے منت پذیر نہ ہونا ایک بے معنی سی بات تھی۔ حاضرین بڑے زور شور سے سرگرمِ مباحثہ تھے کہ دفعتہً آزاد نے کہا، یہاں ماہ تمام سے بدر مراد نہیں بلکہ پورے مہینے کا چاند مراد ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ کمال کا چپ رہنا بھی اُن کے کمال کا اظہار کر دینا ہے۔ اس دعوے کی شاعرانہ دلیل یہ ہے کہ جو مہینہ انتیس ۲۹ دن کا ہوتا ہے، ماہِ نو کا محتاج ہوتا ہے، لیکن جو مہینہ پورے تیس دن کا ہوتا ہے، اس کو ہلال کی حاجت نہیں ـــــ سب نے آزاد کے ذہن رسا اور معنی فہمی کی داد دی۔[۱۴۹]

دکن میں مستقل سکونت

آزاد کی تربیت و تعلیم کی بیشتر منزلیں ان کے آبائی وطن بلگرام میں طے ہوئیں، بعد ازاں متعدد بلاد و امصار کی سیاحت کی۔ پھر اُن کی زندگی کے تقریباً اڑتالیس ۴۸ سال دکن میں گزرے۔ یہ ان کی زندگی کا طویل ترین اور اہم دَور ہے اور یہی آخری دَور بھی ہے۔ اس طویل مدت میں آزاد کو کئی حوادث پیش آئے، ان کے والدین کا انتقال ہوا، ماموں اور استاد سید محمد بلگرامی نے وفات پائی۔ اکلوتا نوجوان بیٹا نور الحسن تالاب میں ڈوب کر مر گیا، خالہ زاد بھائی سفرِ آخرت پر روانہ ہوا، اور بھی بہت سے عزیز اور دوست دنیا سے رخصت ہو گئے، لیکن دکن کی محبت نے دل پر کچھ ایسا قبضہ کیا اور وہاں کی مٹی نے ایسا دامن پکڑا کہ آزاد نے وہاں سے نکلنے کا نام تک نہ

---

[۱۴۹] مقالاتِ شبلی۔ ج ۵، ص ۱۳۱ تا ۱۳۵

لیا۔ بھتیجے میر سید اولاد محمد ذکا اور پوتے امیر حیدر کو بھی پاس بلا لیا اور ان کی تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد بلگرام واپس بھیجا۔

دکن میں ان کی سکونت اورنگ آباد میں تھی اور اس شہر سے ان کو انتہائی محبت تھی عمر کے آخری دور میں ان کو بخار، پیچش، قولنج وغیرہ کے عوارض لاحق ہو گئے تھے۔ ساتھ ہی ضعف اور نقاہت کا بھی غلبہ ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں انھیں خطوط لکھتے اور تسلی دیتے رہتے تھے۔ "منشات شاہ نواز خاں" کے نام سے شاہ نواز خاں کے مجموعہ مکتوبات کا قلمی نسخہ بمبئی یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اس کے حوالے اس زمانے کی تاریخ کی بعض کتابوں میں مرقوم ہیں، اس میں وہ خطوط درج ہیں جو شاہ نواز خاں نے آزاد کو ان کے آخری دور میں تحریر کیے، ان سے ان عوارض کا بھی پتا چلتا ہے جن میں آزاد مبتلا تھے۔

سفرِ آخرت کی تیاری

مختلف عوارض کے ہجوم کی وجہ سے ۱۱۹۵ھ میں آزاد کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وقتِ رحلت قریب ہے۔ چنانچہ اپنی قبر کے لیے اورنگ آباد سے بارہ کوس کے فاصلے پر خلد آباد میں حضرت شاہ برہان الدین غریب کے مرقد کے قریب زمین کا ایک قطعہ بھی خرید لیا تھا۔ پھر سب احباب اور مشائخ و شعرا کو اپنے ہاں جمع کر کے ان کو بہترین کھانا کھلایا۔ ہر ایک سے الگ الگ معافی مانگی، ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ دنیا دار الفنا ہے، اصل اور ہمیشہ کا ٹھکانہ وہی ہے، جو مرنے کے بعد حاصل ہو گا۔ آخرت میں ہم سب یکے بعد دیگرے باہم ملیں گے۔ آج کی تقریب الوداعی تقریب ہے اور ھذا فراق بینی وبینکم کا معاملہ ہے۔ اس موقع پر آزاد بہت ہشاش بشاش تھے لیکن حاضرین پر رقت و حسرت طاری تھی۔[۴۲]

وفات

اس واقعہ سے پانچ سال بعد تک آزاد زندہ رہے اور ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۰۰ھ

---

۴۲ محبوب الزمن۔ ج ۱، ص ۲۸۵، ۲۸۶

(۱۵ ستمبر ۱۷۸۵ء) کو چھیاسی ۸۶ برس کی عمر پاکر فوت ہوئے۔ ان کی وصیّت اور خواہش کے مطابق انھیں اورنگ آباد سے بارہ میل دور خلد آباد میں دفن کیا گیا۔ ان کی لوحِ قبر پر یہ الفاظ مرقوم ہیں:

ھو الحی القیوم

حسان الہند میر غلام علی آزاد حسینی واسطی بلگرامی

ولادت: ۲۵ صفر المظفر ۱۱۱۶ھ

وفات: ۲۴ ذیقعدۃ الحرام ۱۲۰۰ھ

۱۳۷۔ قاضی غلام مصطفیٰ انصاری لکھنوی

قاضی غلام مصطفیٰ بن محمد اسعد بن شیخ قطب الدین انصاری سہالوی ثم لکھنوی، اپنے جدّ امجد اور جلیل القدر عالم شیخ قطب الدین انصاری سہالوی کی زندگی میں موضع سہالی میں پیدا ہوئے۔ پھر اپنے چچاؤں کے ساتھ سہالی سے نقل مکانی کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ ان کے ایک چچا شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ) تھے، جو اپنے دَور کے ممتاز عالم اور ہندوستان کے مدارسِ دینیہ کے باقاعدہ نصابِ تعلیم کے اوّلین بانی تھے۔ (یہ نصابِ تعلیم درسِ نظامیہ کے نام سے معروف ہے)، اور تھوڑے سے تغیّر و تبدل کے ساتھ ہمارے مدارس میں اب تک اس کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ قاضی غلام مصطفیٰ انصاری نے لکھنؤ میں تربیت پائی اور اپنے ان ہی رفیع المرتبت عمّ محترم شیخ نظام الدین انصاری سے اخذِ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قاضی غلام مصطفیٰ طلبِ رزق کے لیے دہلی چلے گئے تھے۔ وہاں جانے کے بعد وہ ملّاوہ کے قاضی مقرر کیے گئے تھے۔ لیکن ملّاوہ کے جس قاضی کو معزول کر کے ان کا تقرر عمل میں آیا تھا، وہ ان کے تقرر سے سخت نالاں تھا۔ چنانچہ اس نے ان کو معزول کرانے کی کوشش شروع کر دی، اس طرح دونوں میں کش مکش رہنے لگی۔ کبھی اس کی کوشش سے قاضی غلام مصطفیٰ اپنے منصب سے معزول ہو جاتے اور کبھی

قاضی غلام مصطفیٰ کی جد و جہد سے وہ الگ ہو جاتا اور منصب قضا پر یہ فائز ہو جاتے۔ یہ سلسلہ کافی عرصے تک جاری رہا۔ بالآخر اپنے عہدے سے الگ ہو کر قاضی غلام مصطفیٰ دہلی سے اپنے وطن کو روانہ ہوئے، ان کے صاحب زادہ گرامی قدر محمد علی بھی ساتھ تھے، ان کے حریف قاضی کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے کچھ لوگوں کو ان کے پیچھے لگا دیا اور انھوں نے راستے ہی میں ان کو قتل کر دیا۔[۴۳]

۱۳۸۔ سیّد غلام نبی بلگرامی

سید غلام نبی بن محمد ارشد بن خضر بن کمال الدین حسینی واسطی بلگرامی، اپنے زمانے کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ صلاح و تقویٰ میں جماعتِ علما میں خاص طور سے مشہور تھے۔ مولد و منشا بلگرام ہے، جو اس عہد میں علم و علما اور صلحا و اتقیا کا مرکز تھا۔ شعور کی آنکھیں کھولیں تو نامور عالم مولانا قطب الدین گوپاموی (متوفی ۲۵ رمضان ۱۱۶۰ھ) کے بعض تلامذہ سے بعض کتبِ درسیہ پڑھیں۔ پھر مولانا احمد اللہ حسینی خیرآبادی (متوفی ماہِ رجب ۱۱۶۷ھ) سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ فلسفہ و حکمت کی کچھ کتابوں کی تحصیل بھی ان ہی سے کی۔ بعد ازاں عالم کبیر علامہ کمال الدین انصاری فتح پوری (متوفی ۱۴ محرم ۱۱۷۵ھ) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے باقی درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ ان علمائے عظام سے اخذِ علم کے بعد پھر مولانا احمد اللہ حسینی خیرآبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے باقاعدہ سندِ فراغت حاصل کی۔

سید غلام نبی بلگرامی مشہور عالم و ادیب میر سید غلام علی آزاد بلگرامی کے معاصرین میں سے تھے۔ جب میر غلام علی آزاد اورنگ آباد (دکن) میں مقیم تھے تو یہ بھی ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۶۸ھ میں ان کے پاس اورنگ آباد گئے اور کچھ عرصہ ان کے یہاں اقامت گزیں رہے۔ بعد ازاں ۱۹ محرم ۱۱۶۹ھ کو علاقہ مدراس کے شہر ارکاٹ اور ترچنا پلی کے لیے رخت

---

[۴۳] اغصان الاربعہ، ص
نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۰

سفر باندھا۔[۱۴۹]

سید غلام نبی بلگرامی کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا بھی علم نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ ۱۱۶۹ھ میں زندہ تھے۔ ان کی علمی و تدریسی سرگرمیوں کے بارے میں بھی کتب تذکرہ و رجال خاموش ہیں۔

ق

۱۳۹۔ قاضی فتح علی قنوجی

قاضی فتح علی قنوجی حنفی المسلک تھے اور باعمل علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ آباو اجداد قنوج شہر کے منصبِ قضا پر فائز تھے، حصولِ علم کے بعد یہ بھی اسی مسندِ بلند پر متمکن ہوئے۔ مشہور عالم شیخ علی اصغر قنوجی (متوفی ۱۵ شعبان ۱۱۴۰ھ) کے شاگردِ رشید تھے۔ اپنے علاقے اور عہد کے فاضلِ اجل، نامور ادیب، مشہور فقیہ اور شیخ تھے۔ علومِ مروّجہ اور فنونِ متداولہ میں کامل مہارت اور وسیع نظر رکھتے تھے۔ اللہ نے اس قدر مرتبۂ علم و تحقیق سے نوازا تھا کہ اپنے تمام اقران و معاصرین سے فوقیت لے گئے تھے۔ ان کی تصنیفات میں حاشیہ شرح تہذیب اور حاشیہ مقاماتِ حریری شامل ہیں۔ معقولات و منقولات کے اس عالم نے ۱۲۰۰ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔[۱]

۱۴۰۔ مولانا فخر الدین مانک پوری بلگرامی

مولانا فخر الدین مانک پوری بلگرامی، نامور فاضل شیخ بہاء الدین نحوی بلگرامی کے فرزندِ رشید تھے۔ شیخ بہاء الدین درحقیقت بلگرام کے رہنے والے تھے لیکن کسی

---

[۱۴۹] مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۸۶، ۲۸۷ —— سروِ آزاد، ص ۳۱۲ تا ۳۱۴ —— نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۲

[۱] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۲ —— حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۷ —— نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۷

وجہ سے مانک پور تشریف لے گئے تھے، وہیں ان کے بیٹے مولانا فخر الدین پیدا ہوئے اور اسی شہر میں نشوونما پائی۔ لہٰذا مانک پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مختصرات کتب درسیہ اپنے والدِ گرامی شیخ بہاء الدین سے پڑھیں۔ بعد ازاں ان کے حسب ارشاد استاذ المحققین میر سید طفیل محمد بلگرامی (متوفی ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حلقۂ شاگردی میں شمولیت کی۔ باقی درسی کتابیں ان ہی سے پڑھیں اور علم و فضل کے بلند مرتبے کو پہنچے اور سید غلام علی آزاد کے بقول "در فقاہت یدِ طولیٰ بہم رساند"۔ یعنی علم فقہ میں بڑی دسترس حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد لغت کی مشہور کتاب تاج العروس کے مصنف سید مرتضیٰ حسینی زبیدی (متوفی ماہ شعبان ۱۲۰۵ھ) کے جدِ امجد سید قادری حسینی بلگرامی (متوفی ۱۳ ربیع الاوّل ۱۱۴۵ھ) کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے اور اس زمانے کے دستور کے مطابق ان کی خدمت میں تصوف و طریقت کی منزلیں طے کیں۔ جب ہر لحاظ سے درجۂ کمال کو پہنچ گئے تو درس و تدریس کی مسند بچھائی۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔

مولانا فخر الدین مانک پوری بلگرامی، مسلکاً حنفی تھے، فضل و صلاح کے اوصاف سے متصف تھے اور جلیل القدر علما و فضلا میں گردانے جاتے تھے — ۱۱۴۰ھ کے بعد فوت ہوئے[۵۲]

۱۴۱۔ مولانا فخر الدین دہلوی

مولانا فخر الدین بن شیخ محب اللہ بن شیخ نور اللہ بن شیخ نور الحق بن شیخ عبد الحق محدث بخاری دہلوی، شیخ وقت، عالم کبیر اور معروف محدث و فقیہ تھے۔ متعدد علوم کے ماہر اور کئی مشہور کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے آبا و اجداد اس برِ صغیر میں حدیث و فقہ کے جیّد عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنف و مؤلف اور مترجم تھے۔ درس و افادہ

---

۵۲ مآثر الکرام، ص ۱۴۰ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۱۷، ۲۱۸

میں بھی انھیں خاص شہرت حاصل تھی۔ مولانا فخر الدین بھی اس سلسلے میں ان ہی کے نقش قدم پر چلے اور عمر بھر حدیث و فقہ کی خدمت میں مصروف رہے۔ فارسی زبان میں صحیح مسلم کی بسیط و مفصل شرح سپردِ قلم کی، اسی طرح حصن حصین کی مبسوط شرح اور عین العلم کی شرح لکھی۔[۳]

۱۴۲۔ شیخ فرخ شاہ سرہندی

شیخ فرخ شاہ سرہندی، حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے پوتے اور شیخ محمد سعید سرہندی کے بیٹے تھے۔ ۱۰۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور سنِ شعور کو پہنچے تو اپنے والد سے علم حاصل کرنا شروع کیا۔ فقہ، ادب اور دیگر علوم کی تحصیل کی، معقول و منقول کی کتابیں پڑھیں اور تمام فنونِ مروجہ میں ماہر ہوئے۔ بالخصوص حدیث، فقہ اور تصوف میں بڑا نام پیدا کیا۔ حافظہ انتہائی تیز تھا اور قوتِ فہم و ادراک میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ بحث و مناظرے سے بدرجہ غایت دلچسپی تھی اور حدیث اور علومِ حدیث سے بے حد لگاؤ تھا۔ نیک اور متقی بھی بہت تھے۔ حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کر کے وطن واپس آئے تو درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔

صاحب الیانع الجنی شیخ محسن ترہٹی کا بیان ہے کہ شیخ فرخ شاہ کو حدیث سے اس قدر محبت تھی کہ ستر ہزار احادیث مع متن و اسناد اور جرح و تعدیل کے حفظ تھیں اور مسائلِ فقہیہ میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے، واللہ اعلم۔

الیانع الجنی کے فاضل مصنف نہایت تعجب سے کہتے ہیں کہ حدیث پر اس قدر عبور و استحضار کے باوجود انھوں نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں حالتِ تشہد میں

---

[۳] تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۰۷، بضمن ترجمہ مولوی سلام اللہ محدث رام پوری —— نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۸ —— حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۸ بضمن ترجمہ مولوی سلام اللہ

اشارۂ انگشتِ شہادت سے منع کیا ہے، حالاں کہ تشہد میں اشارۂ انگشتِ شہادت کا واضح طور سے حدیث میں ثبوت موجود ہے۔

شیخ موصوف نے حدیث اور فقہ کے بعض مسائل پر رسائل تصنیف کیے۔ ایک رسالے میں ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو بعض لوگ ان کے جدِّ امجد حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ پر وارد کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں القول الفاصل بین الحق والباطل، کشف الغطاء عن وجوہ الخطاء، رسالۃ فی حرمۃ الغناء، رسالۃ فی العقائد، رسالۃ فی الحقیقۃ المحمدیہ اور حاشیہ علی حاشیۃ عبد الحکیم علی الخیالی، ان کی تصنیفات ہیں۔

شیخ فرخ شاہ سرہندی نے ۴ شوال ۱۱۲۲ھ کو وفات پائی۔[۱]

۱۴۳۔ سیّد فرید الدین بلگرامی

سیّد فرید الدین بن معین الدین بن عبد الوہاب حسینی واسطی شیخ و فاضل اور فقہ و اصول کے ممتاز علما میں سے تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بچپن ہی میں اپنے شہر کے علما سے حصولِ علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ بعد ازاں دوسرے بلاد و امصار کا سفر کیا اور مختلف فضلائے عصر کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ شیخ احمد امیٹھوی (متوفی ۹ ذو القعدہ ۱۱۳۰ھ) سے جو مُلّا جیون کے عُرف سے معروف تھے اور اپنے زمانے میں ہندوستان کے جلیل القدر عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنّف تھے، بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ بعض کتابوں کی تکمیل مشہور شیخ و علّامہ غلام نقشبند لکھنوی (متوفی ماہ رجب ۱۱۲۶ھ) سے کی۔ سندِ فراغت بھی ان سے حاصل کی۔ اس کے بعد شیخ جنید بن عبد الواحد امیٹھوی سے اخذِ طریقت کیا۔ سید قادری بلگرامی (متوفی ۱۳ ربیع الاوّل ۱۱۴۵ھ) کے ہم عنان حجازِ مقدس گئے اور

---

[۱] الیانع الجنی، ص ۹۵ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۲۲، ۲۲۳

حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔ حج سے فارغ ہو کر ہندوستان واپس آئے تو
سورت میں اقامت گزیں ہو گئے اور اپنے آپ کو درس وتدریس اور افادۂ علما وطلبا
کے لیے وقف کر دیا۔

اس رفیع المرتبت ہندی عالم وفقیہ نے ۱۱۲۰ھ کے بعد سفر آخرت اختیار کیا۔
سید غلام علی آزاد بلگرامی جن کی وفات ۱۲۰۰ھ میں اورنگ آباد (دکن) میں ہوئی،
لکھتے ہیں کہ بہت سی درسی کتابیں، جن میں مطولات اور مختصرات شامل ہیں، سید
فرید الدین کے قلم سے تصحیح شدہ اور محشّٰی بلگرام میں موجود ہیں[۵۵]

۱۴۴۔ مولانا فصیح الدین پھلواروی

مولانا فصیح الدین بن ابو یزید بن محمد فرید بن محمد حسین بن عطاء اللہ ہاشمی جعفری
پھلواروی، ان کے بارے میں سید عبدالحی حسنی لکھنوی نزہۃ الخواطر میں حدیقۃ
الازہار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ اپنے زمانے کے عالم وفقیہ اور شیخ تھے مسلکاً
حنفی تھے اور فقہائے حنفیہ میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ پھلواری میں پیدا ہوئے
جو ہندوستان کے صوبہ بہار کا مشہور شہر ہے اور جسے علم وفضل اور دعوت وارشاد
کے سلسلے میں دیارِ ہند میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ پھلواری ہی میں نشو ونما
پائی، مدت تک اپنے شہر کے اساتذہ سے حصولِ علم میں مصروف رہے، پھر دہلی
کا قصد کیا اور شیخ احمد امیٹھوی معروف بہ ملا جیون سے اخذِ علم کیا۔ فارغ التحصیل
ہونے کے بعد اپنے آبائی شہر پھلواری کو مراجعت کی اور سب امور سے منقطع ہو کر درس
وافادہ کو مقصدِ حیات ٹھہرا لیا۔

علامہ سید عبدالحی حسنی لکھنوی برصغیر پاک وہند کے نامور عالم ومبلغ مولانا
شاہ سلیمان پھلواروی کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب موصوف سے میں

---

۵۵ ماثر الکرام، ص ۱۲۷، ۱۲۸ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۲۳

نے سنا ہے کہ مولانا فصیح الدین نے ملا عوض وجیہ سمر قندی سے تحصیلِ علم کی تھی شاہ صاحب کا بیان ہے کہ میں نے یہ بات ایک شاہی فرمان میں دیکھی ہے جو مغل حکمران سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے ان کو بھیجا تھا[۵۶]

مولانا فصیح الدین پھلواروی وہ عالمِ دین اور نامور فقیہ ہیں، جو عہدِ عالم گیری میں بزرگ تھے اور فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی باکمال جماعت میں باقاعدہ طور پر شامل تھے۔ اس کا ذکر جناب عون احمد صاحب قادری نے "معارف" (اعظم گڑھ) میں مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"ملا فصیح الدین کا وطن بہار کا ایک مردم خیز قصبہ پھلواری تھا۔ وہ اہلِ پھلواری کے مورثِ اعلیٰ حضرت امیر عطاء اللہ جعفری کے پڑپوتے تھے۔ تحصیل علم کے لیے دہلی گئے اور ملا عوض وجیہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر تکمیل کی۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کا عہد تھا۔ استاد دربارِ شاہی کے ممتاز لوگوں میں سے تھے۔ ملا فصیح الدین اپنے استاد کے ذریعے عالم گیر کے دربار میں پہنچے اور اپنے تبحر علمی کی بنا پر فتاویٰ عالم گیری کی تدوین میں شریک کیے گئے۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ان کی علمی قابلیت اور جوہر ذاتی کی قدر کر کے مددِ معاش میں ایک سو بیگہ اراضی اور ایک روپیہ یومیہ خرچ کے لیے عطا فرمایا۔

"جب دہلی سے اپنے وطن پھلواری واپس آئے تو اپنے آبائی مدرسے میں درس دینا شروع کیا۔ ان کے آبائی مدرسے کا تذکرہ بھی اگلے دور کی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ مدرسہ مسجد سنگی سے اتر کی جانب تھا۔ اس میں حضرت امیر عطاء اللہ کی اولاد سے علما و فضلا درس دیا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ ۱۱۷۲ھ تک نہایت عروج کے ساتھ آباد رہا۔

"ملا فصیح الدین کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ پھلواری کے متقدمین علما میں ان کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے، ان کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی۔ ارشد تلامذہ میں موصوف کے چاروں صاحب زادے اور قاضی حیات مرید اور ملا غلام شرف الدین قابلِ ذکر ہیں۔

---

[۵۶] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۲۳، ۲۲۴

"بڑے لڑکے ملا صبیح الدین ان کے بعد مسندِ درس پر بیٹھے اور بہت سے لوگوں نے ان سے علمی فیض حاصل کیا۔ ان کے بعد اس مسند پر ان کے بھانجے ملا مبین جعفری بیٹھے جو بہ یک واسطہ استاذ الکل ملا نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ ملا مبین کے بعد ملا فصیح الدین کی مسندِ تدریس کچھ دنوں خالی رہی۔ پھر ان کے بھائی ملا معین کے پوتے مولانا حافظ عبد الغنی اس پر جلوہ افروز ہوئے اور ساٹھ برس تک اس مسند پر درس دیتے رہے۔

"ملا فصیح الدین نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اور مسجد سنگی کے مشرقی جانب مقبرے میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

"ملا فصیح الدین کے صاحب زادے ملا صبیح الدین کے نام سلطان عالم گیر کی طرف سے جو فرمان تھا، اس میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ فرمان طویل ہے، اس کا وہ حصہ نقل کرتا ہوں۔

دریں وقت میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ یک روپیہ یومیہ از خزانہ بلدہ عظیم آباد صوبہ بہار و یک صد و بست بیگہ زمین از پرگنہ پھلواری مضاف صوبہ بہار در مددِ معاش بصلائے تدوین فتاویٰ بنام ملا شیخ فصیح الدین مقرر بود۔ الحال بمتعلقانِ ملا مذکور متوفی بلا قید اسامی دیدہ و دانستہ حسب الضمن مقرر شد۔

"یہ فرمان ملا فصیح الدین کے انتقال کے بعد (۱۱۱۹ھ) ۱۵ رجب دوشنبہ ۱۱۲۰ھ میں تجدید کیا گیا تھا۔ ملا فصیح الدین کے نام جو فرمان تھا اس میں بھی ان کی شرکت کا ذکر تھا، مگر وہ ضائع ہو گیا۔"

مولانا فصیح الدین پھلواروی کے بارے میں مولانا سید غلام حسنین شاہ پھلواروی نے بھی "معارف" (اعظم گڑھ) میں ایک مختصر سا مضمون تحریر کیا تھا، جو درج ذیل ہے۔

حضرت ملا فصیح الدین جعفری پھلواروی کا جامعینِ فتاویٰ عالم گیری میں ہونا یہاں کی خاندانی روایات پر مبنی ہے اور یہ روایت تحریر میں آئی تو بہت بعد میں۔ ان کے ہم عصروں میں سے یا ان کے متصل مؤلفین میں سے کسی کا نوشتہ موجود نہیں ہے۔ اس زمانے کا عام مذاق یہ تھا کہ تذکروں میں بزرگوں کے محض کشف و کرامات کا منضبط کر لینا کافی سمجھتے تھے۔ لیکن پھر بھی اہلِ علم خاندان میں جو روایت مسلسل چلی آ رہی ہو وہ بالکل

بے اصل اور غیر وقیع نہیں ہوسکتی - اس خاندان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے روایت کے وزن کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

اس خاندان کے مورث خواجہ عطاء اللہ عہدِ ہمایوں و اکبری میں یہاں (پھلواری میں) آکر مقیم ہوئے۔ خاندانی روایت کے بموجب تو یہ وزرائے شاہی میں سے تھے، لیکن وہاں ان کی کوئی اہم حیثیت ضرور تھی۔

ابوالفضل کے اکبرنامہ میں بضمن وقائع ۹۶۱ھ خواجہ عطاء اللہ کا نام بھی ایک جگہ پر مذکور ہے۔ خدابخش خاں صاحب مرحوم کی لائبریری میں شاہان و وزرائے مغلیہ کے ساتھ ایک مرقع امیر عطاء اللہ کا بھی البم کی شکل میں موجود ہے۔ شیر شاہی خاندان کی تباہی کے بعد مغل سلاطین نے رہتاس سے لے کر راج گیر تک پٹنہ کے جنوب میں بہت سے مغل، شیوخ اور راجپوت خاندان مختلف مناصب کے ساتھ آباد کر دیے تھے تاکہ پٹھانوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیں۔ اسی زمانے میں خواجہ عطاء اللہ بھی دہلی سے یہاں آئے۔ یہ عبداللہ ابن جعفر طیّار کی اولاد سے تھے، اسی لیے یہ خاندان جعفری کہلاتا ہے۔ امیر عطاء اللہ نے یہاں سنگِ سُرخ کی ایک مسجد بنوائی جو اب تک پھلواری کی جامع مسجد ہے، جہاں جمعہ و اعیاد کی سب سے بڑی جماعت ابھی تک ہوتی ہے اور خاکسار راقم الحروف کے زیر تولیت ہے۔ اسی مسجد میں ملا فصیح الدین درس و افتا کا مشغلہ رکھتے تھے اور اسی سے متصل ان کا مزار بھی ہے۔ چنانچہ شاہ عالم اوّل فرزند و جانشین عالم گیر نے از روئے فرمان مجریہ ۱۱۲۰ھ ملا فصیح الدین کے لیے وظیفہ مقرر کیا تھا جو از روئے پروانگی و بمہر "اخلاص خاں" ملا صاحب موصوف کے فرزندوں کو ملا تھا۔ اس کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

"... ملاّ مذکور شاگرد اخوند ملاّ عوض وجیہ ... متوطن قصبہ پھلواری سرکار و صوبہ بہار فاضل و متوکل است، نیم روپیہ و لبست بیگہ زمین[۱] مدد معاش

---

[۱] یہ لفظ غالباً "یک روپیہ و یک صد و بست بیگہ زمین" ہے۔

ازسابق دارد بخرج وفا نمی کند امیدوار از تفصیلات . . . ویومیہ مسجد آں قصبہ بنا کردۂ جد مشار الیہ مقرر است نیم روپیہ یومیہ بدستور اصل و بست بیگہ زمین مزروع اضافہ مرحمت شد و نیم روپیہ یومیہ مسجد دیدہ و دانستہ ؏"

اس فرمان سے ظاہر ہے کہ ملا فصیح الدین پھلواروی شہنشاہ عالم گیر کے ہم عصر تھے اور فاضل متعارف تھے۔ نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ خاندان کئی پشت سے دربارِ شاہی سے متعلق تھا۔ پس فتاویٰ عالم گیری کے جمع کرنے میں انھوں نے بھی کچھ خدمت انجام دی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، بلکہ ایسا ہونا بہت ہی قرینِ قیاس ہے۔ تاریخ تو بہت سے خاندانی رواجوں، روایتوں اور انفرادی نوشتوں، دفینوں اور سفینوں کو اکٹھا کر کے بنائی جاتی ہے۔ پھر پھلواری کے ذی علم و مقتدر خاندان کی روایت تاریخ کا ماخذ کیوں نہیں بن سکتی؟[۵۸]

نزہۃ الخواطر اور "معارف" کی ان دونوں تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا فصیح الدین پھلواروی بارھویں صدی ہجری کے متعارف فقہائے ہند میں سے تھے۔

۱۴۵۔ سید فضل اللہ کالپوی

سید فضل اللہ بن احمد بن محمد بن ابوسعید حسینی ترمذی کالپوی کا شمار علمائے مشاہیر اور فقہائے نامدار میں ہوتا تھا۔ مولد و منشا کالپی ہے۔ ان کے والد سید احمد بن محمد (متوفی ۱۹ صفر ۱۰۸۴ھ) بھی عالمِ دین تھے، لائق بیٹے نے فقہ کی تعلیم باپ سے حاصل کی، اخذِ طریقت بھی ان ہی سے کیا اور والد کی وفات کے بعد مسندِ مشیخت پر بیٹھے۔ سید فضل اللہ سے بھی خلقِ کثیر نے فیض حاصل کیا۔ ۱۴ ذوالقعدہ ۱۱۱۱ھ میں فوت ہوئے۔[۵۹]

---

۵۸ ماخوذ از معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۴۷ء —— نیز ملاحظہ ہو، برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ، ص ۳۰ تا ۳۳۔

۵۹ عہدِ بنگش کی سیاسی، علمی اور سیاسی تاریخ، ص ۲۶۲ —— نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۵

۱۴۶۔ شیخ فضل اللہ پرنیوی

شیخ فضل اللہ بن محمد فاضل بن رکن الدین حنفی پرنیوی، فضل و صلاح کے پیکر اور اپنے عہد کے عالم و فقیہ تھے۔ علاقہ بنگال کے ایک مقام "پُرنیہ" میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ حصولِ علم کے شوق میں صغر سنی ہی میں جون پور آ گئے تھے، جس کو علم و علما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اکثر درسی کتابیں شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری (متوفی ۲۴ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۳ھ) سے پڑھیں، جو صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۱۹ رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ) کے فرزندِ رشید اور اس عہد کے جلیل القدر عالم تھے۔ کچھ کتابوں کے لیے بعض دیگر علما کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اخذِ طریقت بھی شیخ محمد ارشد سے کیا اور مشیخت و تصوف کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ تکمیلِ علم اور حصولِ فیض کے بعد شیخ محمد ارشد نے انھیں وثیقۂ خلافت لکھ کر دیا اور اپنے وطن پُرنیہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ وطن جا کر شادی کی اور درس و افادہ میں کمربستہ ہو گئے۔ اس اثنا میں ان سے بہت سے علما و طلبا نے استفادہ کیا۔

ارضِ بنگال کے اس عالم و فقیہ کو چہار شنبہ کے روز ۹ رمضان المبارک ۱۱۸۰ھ کو اپنے شہر پرنیہ میں شہید کیا گیا اور مکان کے قریب ہی دفن کیے گئے۔ منقول ہے کہ ان کی تصنیفات بھی تھیں، لیکن اس ہنگامے میں ضائع ہو گئیں۔[1]

۱۴۷۔ مولانا فضل اللہ بہاری

شیخ فضل اللہ بن ابوالفضل حنفی بہاری فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے جیّد علما میں سے تھے۔ عالمِ شباب میں بہار سے فرخ آباد چلے گئے تھے۔ بعض کتبِ درسیہ قاضی محمد مربی حسینی پھانوی سے پڑھیں۔ پھر بعض دیگر بلاد کے سفر کو نکلے اور علامہ محمد حسن بن

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۵ بحوالہ گنجِ ارشدی

غلام مصطفیٰ لکھنوی (متوفی سہ صفر ۱۱۹۹ھ) کے درس میں شریک ہوئے اور باقی درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ حصولِ علم کے بعد فرخ آباد کا رخ کیا اور شیخ کرامت اللہ واعظ دہلوی کی صاحب زادی سے نکاح کیا۔ نہایت قانع، پاک باز اور متدین تھے۔ شب و روز درس و افادہ میں سرگرم عمل رہتے۔ تاریخ فرخ آباد کے مصنف مفتی ولی اللہ بن احمد علی حسینی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے متوسطات کتبِ درسیہ میں سے بعض کتابیں پڑھیں۔

شیخ فضل اللہ بہاری نے ۱۱۸۲ھ میں فرخ آباد میں انتقال کیا۔[۱]

۱۴۸۔ سیّد فیروز جائسی

سید فیروز بن جنید بن عبدالرحمٰن بن کمال بن جلال اشرفی جائسی، شیخ اور فاضلِ کبیر تھے۔ فقہ، اصول اور علومِ عربیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شہر جائس میں مسندِ درس و افادہ پر فائز تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے حصولِ علم کیا۔[۲]

۱۴۹۔ خواجہ فیض الحسن سورتی

خواجہ فیض الحسن کا سلسلۂ نسب یہ ہے: فیض الحسن بن نور الحسن بن محمد بن ابوالحسن بن جمال الدین حسینی سورتی، ۱۰۹۸ھ میں سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ سورت ہی کے علما سے علم حاصل کیا اور بحث و اشتغال میں سرگرم ہوئے یہاں تک کہ فقہ و اصول میں تمام معاصرین و اقران سے سبقت لے گئے۔ مسائلِ فقہ میں استحضار کا یہ عالم تھا کہ فتاویٰ نقشبندیہ تصنیف کیا۔ نیز شرح خلاصۃ الکیدانی الموسوم بہ فرخ شاہی تصنیف کی۔ یہ وہ عالمِ دین ہیں جو فضل و صلاح میں بہت

۱ھ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۲۶۔ عہدِ بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ، ص ۳۳۴

۲ھ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۲۷ بحوالہ اللطائف الاشرفیہ

مشہور تھے اور باکمال آدمی تھے۔ ۱۱۵۱ھ کو سورت میں فوت ہوئے۔[13]

ق

۱۵۰۔ سیّد قاسم دہلوی

سید قاسم بن ہاشم بن حسن حسینی دہلوی اپنے زمانے کے عالم و فقیہ اور شیخ و صوفی تھے۔ درحقیقت نارنول سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کے دادا سیّد حسن جو علما و صوفیا کے حلقوں میں سید حسن رسول نما کے نام سے معروف ہیں، نارنول سے دارالسلطنت دہلی منتقل ہو گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

سید قاسم فضلا و اعیانِ علمائے ہند میں تھے۔ دن رات درس و تدریس میں منہمک رہتے۔ اس سے وقت ملتا تو عبادت اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ فقرا کے لباس میں ملبوس رہتے اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔[14]

۱۵۱۔ مولانا قطب الدین شہید سہالوی

لکھنؤ سے تیس بتیس میل کے فاصلے پر ایک بستی "سہالی" کے نام سے موسوم ہے۔ کسی زمانے میں یہ بستی علم و علما کا مرکز اور فضل و کمال کا سرچشمہ کہلاتی تھی۔ گزشتہ تین سو سال سے برصغیر پاک و ہند کے عربی اور دینی مدارس میں درسِ نظامیہ کے نام سے جو طریقِ تدریس جاری ہے، اس کے مرتب اسی بستی کے ایک عالمِ دین مولانا نظام الدین انصاری سہالوی تھے اور وہ ان ہی سرِ عنوان مولانا قطب الدین شہید سہالوی کے فرزندِ رشید تھے۔ وہ درس نظامیہ جو کابل سے لے کر راس کماری تک تمام مدارسِ عربیہ میں تین صدیوں سے جاری ہے، اس کے بانی اگرچہ مولانا نظام الدین

---

[13] حدیقہ احمدیہ ——— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۲۷، ۲۲۸

[14] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۲۹۔ بحوالہ بحر زخار

انصاری سہالوی تھے، لیکن ان سے قبل زیرِ تذکرہ بزرگ اور ان کے والدِ مکرم مولانا قطب الدین شہید سہالوی نے بھی اس کو ایک خاص اندازِ ترتیب بخشا تھا۔

مولانا قطب الدین شہید سہالوی عالمِ کبیر، علّامۂ وقت، معقول و منقول کے ماہرِ کامل اور بارھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے جلیل القدر فرد تھے اور انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلام جب حدودِ عرب سے نکل کر دیگر ممالک میں پھیلنا شروع ہوا تو عرب کے بہت سے خاندان جو ہجرت کر کے ان ممالک میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، ان میں حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے خاندان کے لوگ بھی شامل تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ نے ہرات کو اپنا مسکن ٹھہرالیا تھا۔ پھر ان ہی میں سے ایک شخص علاء الدین انصاری نے ہرات سے ہندوستان کا رُخ کیا اور اس ملک میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔ ان کا مدفن قصبہ "برناوہ" میں ہے جو دہلی اور متھرا کے راستے میں واقع ہے۔ ان ہی علاؤ الدین کی نسل سے ایک عالمِ دین شیخ نظام الدین انصاری ہوئے ہیں، جو لکھنؤ سے تیس بتیس میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں "سہالی" میں چلے گئے تھے۔ شیخ موصوف مستقل طور سے یہاں رہنے لگے اور درس و تدریس میں سرگرمِ عمل ہوئے۔ بعد میں درسِ نظامیہ کے نام سے عربی دینی مدارس کے لیے مستقل نصاب مرتب کیا، جو اب تک برصغیر پاک و ہند کے مدارسِ دینیہ میں باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے اور اپنے مرتب کے اسمِ گرامی کی مناسبت سے اسی نام کے ساتھ موسوم ہے۔

اس خاندان کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ دیارِ ہند میں کئی صدیوں سے اس کو سرچشمۂ فضل و کمال کی حیثیت حاصل ہے۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ حافظ تھے جو علم و عمل کی دنیا میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ مغلیہ حکومت کا یہ ایک زریں کارنامہ تھا کہ پورے ملک میں ہر مقام پر وقائع نویس موجود رہتے تھے، جو اس اہم کام پر بھی مامور تھے کہ بادشاہ کو یہ اطلاع دیتے رہیں کہ اصحابِ علم اور اربابِ کمال کہاں کہاں موجود ہیں اور کیا خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جوں ہی بادشاہ ان کے مرتبۂ علمی سے آگاہ ہوتا، ان لوگوں کے لیے جاگیریں مقرر ہو جاتیں، جن کی مال گزاری ان کے لیے معاف کر دی جاتی۔ شہنشاہ اکبر کو شیخ حافظ کے بارے میں وقائع نویس نے اطلاع دی تو فرمانِ شاہی کے ذریعے ان کی بھی جاگیر مقرر ہو گئی اور مال گزاری معاف کر دی گئی۔ اغصانِ اربعہ کے مصنف ولی اللہ کے بیان کے مطابق بادشاہ نے اس فرمان میں شیخ کے بارے میں نہایت تعظیم کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ شیخ حافظ نے جو مدرسہ قائم کیا، اس میں طلبا کے قیام و طعام کا باقاعدہ انتظام تھا اور تمام مصارف کی کفالت خود شیخ موصوف کرتے تھے۔

مولانا قطب الدین شہید چوتھی پشت میں ان ہی شیخ حافظ کی نسل سے تھے مولانا ممدوح کے والد کا اسمِ گرامی شیخ عبدالحلیم انصاری اور دادا کا نامِ نامی عبدالکریم انصاری تھا۔ شیخ عبدالحلیم لاہور کے مدرسے میں مدرس تھے۔ لائق بیٹے نے اسی زمانے میں ان سے علم حاصل کیا۔ وہ صغر سنی ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے دَور کے جلیل القدر علما سے تحصیل کی اور علومِ متعارفہ کے لیے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تصوف و طریقت میں بھی مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ بعد ازاں خود مسندِ تدریس آراستہ کی اور سرگرمِ درس و افادہ ہوئے۔ نہایت عابد و زاہد اور متدین عالمِ دین تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن کو درس دیتے اور شب کو مشغولِ عبادت ہو جاتے۔ ہفتے میں دو دن سہ شنبہ اور جمعۃ المبارک کو تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے۔ ملوک و امرا سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ان کے فضل و کمال کا چرچا بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر تک پہنچا تو اس نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن اس درویش صفت عالم نے اپنے اسلاف کی روایات کو ترک کرنا اور گوشۂ عزلت کو چھوڑ کر حکمرانوں کے دربار میں جانا گوارا نہ کیا۔

مولانا قطب الدین کا ایک خاص اسلوبِ درس تھا، جو خود ان ہی کا قائم کردہ تھا۔ وہ ہر فن کی صرف ایک مستند اور جامع کتاب پڑھاتے تھے اور اس سے شاگرد کو تمام مسائل پر مجتہدانہ عبور حاصل ہو جاتا تھا۔ اس ضمن میں مولانا عبدالاعلیٰ

رسالہ قطبیہ میں لکھتے ہیں :

مولانائے شہید از ہر فن یک کتاب می خوانیدند، شاگردان محقق می شدند۔

یعنی مولانا قطب الدین ہر فن کی ایک ایک کتاب اس طریقے سے پڑھاتے تھے کہ شاگرد محقق کے مرتبے پر پہنچ جاتے۔

شہادت

مولانا قطب الدین سہالوی کو درجہ شہادت نصیب ہوا تھا، اس لیے لفظ "شہید" ان کے نام کے ساتھ اس طرح التزام سے لکھا جاتا ہے کہ یہ لفظ گویا ان کے نام کا جز ہو گیا ہے۔ شہادت کی جو تفصیلات ان کے سوانح نگاروں نے لکھی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

سہالی میں دو خاندان آباد تھے، ایک عثمانی خاندان اور دوسرا انصاری خاندان، جو مولانا قطب الدین کا خاندان تھا۔ سہالی کے گرد و نواح میں خان زادے مقیم تھے، ان کا سہالی کے ایک شخص محمد آصف چودھری سے جو انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے، زمین کی سرحدوں کے سلسلے میں ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔ محمد آصف وہاں کے ممتاز زمیندار اور مولانا قطب الدین کے سُسر تھے۔ اس تعلق کی بنا پر خان زادوں کو مولانا ممدوح سے بھی عداوت ہو گئی تھی، لیکن مولانا کو چوں کہ سلطان اورنگ زیب کے دربار میں بہت عزت و تکریم حاصل تھی، لہٰذا یہ لوگ انھیں کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ سوئے اتفاق سے سہالی میں عثمانی خاندان کے جو لوگ آباد تھے، ان کے اور محمد آصف انصاری کے مابین موضع بلرن کی آب پاشی کے بارے میں نزاع پیدا ہو گیا۔ اس قسم کے نزاع باشندگانِ دیہات کے لیے نہایت خطرناک نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ یہاں بھی بالآخر یہی صورت حال سامنے آئی اور فریقین کی طرف سے شد و مد کے ساتھ تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن مولانا قطب الدین بیچ میں پڑے اور دونوں طرف کے لوگ واپس چلے گئے۔

یہ بالکل عارضی سی بات تھی۔ اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ موقع پا کر

سہالی کے نواح میں رہنے والے خان زادوں نے سہالی پر چڑھائی کر دی اور کئی سو آدمی گاؤں میں گھس آئے۔ انھوں نے انصاریوں کے خلاف عثمانی خاندان کے لوگوں کو خوب بھڑکایا اور کہا کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں، تم محمد آصف پر حملہ کر دو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے مل کر محمد آصف کے مکان پر ہلہ بول دیا۔ ایک روایت کے مطابق وہ اس وقت ایک تقریب کے سلسلے میں اپنے داماد مولانا قطب الدین کے گھر گئے تھے۔ سنگ دل حملہ آوروں نے مولانا کے مکان پر یلغار کر دی اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ دیواروں میں نقب لگائی اور اندر گھس گئے۔ پھر تیروں، بندوقوں اور تلواروں کے اس طرح مسلسل وار کیے کہ مولانا موصوف جامِ شہادت نوش کر گئے۔

یہ واقعہ دو شنبہ کے روز ماہِ رجب ۱۱۰۳ھ میں پیش آیا۔ اس وقت ان کی عمر تریسٹھ ۶۳ سال کی تھی۔

مولانا کے ساتھ چند طلبا بھی جو اس وقت مشغولِ درس تھے، شہید کر دیے گئے۔ ستم گروں نے اس خوں ریزی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے گھر کا مال و اسباب بھی لوٹ لیا اور ان کا کتب خانہ بھی جو اس زمانے میں سیکڑوں کتابوں پر مشتمل تھا، جلا کر برباد کر دیا۔ مولانا کی لاش اور محمد آصف کا سر ساتھ لے گئے۔ تین چار دن کے بعد مولانا کے دونوں ہاتھ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیے اور لاش سہالی بھیج دی۔ چنانچہ ۲۷ رجب ۱۱۰۳ھ کو نمازِ جنازہ پڑھ کر تجہیز و تکفین کی گئی۔

بعض تذکروں میں اس طرح مرقوم ہے کہ مخالفین نے پہلے چودھری محمد آصف کے مکان پر حملہ کیا، وہ مولانا کے پاس اعانت و مشورت کے لیے آئے، مخالفوں نے تعاقب کیا اور ان کے ساتھ مولانا کو بھی شہید کر دیا۔

ایک روایت یہ ہے کہ شیخ قطب الدین کے دادا محترم نے عثمانی خاندان کے ایک غریب آدمی کو اپنی زمین میں جگہ دی، پھر آہستہ آہستہ ایک وقت آیا کہ اس شخص کی اولاد مال دار ہو گئی اور سہالی کے نواح میں کئی دیہات ان کی ملکیت میں آ گئے۔ بعد میں دونوں فریقوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا، جس کے نتیجے میں مولانا قطب الدین ان کے ہاتھوں

شہید ہوگئے، ان کا مکان نذرِ آتش اور کتب خانہ تباہ کر دیا گیا اور ان کے بیٹے نظام الدین کو، جو آگے چل کر درسِ نظامیہ کے بانی بنے اور اس وقت صرف چودہ سال کی عمر کے تھے، گرفتار کرکے لے گئے۔

جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت مولانا قطب الدین کے تین صاحب زادے موجود تھے۔ ایک محمد رضا، دوسرے نظام الدین، تیسرے محمد سعید، یہ اس جھگڑے میں زخمی ہو گئے تھے اور باپ کی شہادت کی اطلاع دینے کے لیے شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے پاس گئے تھے جو اس زمانے میں علاقہ دکن میں تھا۔

مولانا موصوف کے ان صاحب زادوں نے باپ کی شہادت کے بعد بادشاہ کی خدمت میں ایک محضر لکھا، جس میں واقعہ کی پوری تفصیل بیان کی۔ اس پر سب مشہور علما، رؤسا اور عمالِ شاہی کے دستخط ثبت ہیں۔ اس محضر میں تمام واقعات اور قاتلوں کے نام درج ہیں۔ یہ محضر نہایت درد انگیز اور الم ناک ہے۔ چوں کہ یہ انتہائی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا اسے بعینہٖ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بحکم آیۂ کریمۂ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ سوال می کنم و گواہی می خواہم با جماعۃ ستم رسیدگان محمد سعید و نظام الدین و محمد رضا پسران مولوی قطب الدین ساکن قصبہ سہالی سرکار لکھنؤ صوبہ اودھ از قضاۃِ اسلام و مشائخ کرام و جمہورِ انام بر ایں معنی کہ بر اصاغر و اکابر ایں دیار روشن و ہویدا است کہ مولوی مذکور موصوف بکمالات انسانیہ و فضائل علمیہ و عملیہ و حافظ قرآنِ مجید بودند، و غیر اشتغالِ مدریس و تکرار با طلبۂ علومِ دینیہ و عبادت و طاعت کارے نداشتند، و در اوقات فراغ از درس و عبادت بہ تصنیف در علم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول می پرداختند، بتاریخ رجب المرجب سن ۱۱۰۳ھ مطابق روز دو شنبہ بر عادتِ قدیمہ از نمازِ فجر و وظائف فراغ اندوختہ در مدرسہ آمدہ، بدرس جمیع از فضلائے حاضر الخدمت مشغول شدند، چوں دو

گھڑی روز برآمد، اسد اللہ و باقر و پیر محمد سکنہ روضہ عملۂ پرگنہ سہالی، و نورو غلام محی الدین بساون، و ساون ساکنان قصبہ سہالی و فقیر اللہ متوطن قصبہ دیوا، و انور ساکن استی معمولہ پرگنہ بجنور وغیرہ زمینداران گرد و پیش خانہ مولوی را محاصرہ نمودند واز ہر چہار طرف دیوار نقبہا زدہ اندرون درآمدند و مولوی را یک زخم تیر و یک زخم تفنگ و ہفت ضرب شمشیر براو رسانیدہ، شہید ساختند، و شیخ غلام محمد نبیرۂ زبدۃ الاولاد بندگی شیخ نظام الدین ساکن امیٹھی و دیگر شیخ شرف اللہ ساکن سندیلہ کہ بخواندن فاتحۃ الفراغ درخدمت بودند نیز از دست ظلمۂ مذکورین شہید شدند۔ و محمد آصف چودھری پرگنہ سہالی کہ برائے مدد مولوی رسیدہ، با ہمراہیانِ خود شہید شدند۔ بندہ محمد سعید و جمعے از طلبا و شیخ فضل اللہ برادر نائب قاضی عبداللہ قاضی پرگنہ سہالی وغیرہ زخمی شدند۔

پس از آنکہ جملۂ مذکورین از قتل و نکارح فارغ شدند، بہ نہب اموال و امتعہ کہ در حویلی بود پرداختند، چنانچہ اثرے ازاں نگزاشتند۔ و کتب مولوی وغیرہ از مردم کہ قریب آں مجتمع بود اکثرے ازاں آتش دادہ سوختند، درآں میان مصحف مجید چہار جلد و مشکوٰۃ وغیرہ از کتبِ احادیث و مصنفاتِ مولوی حاشیہ تلویح، شرح عقائد نسفیہ و تعریفات بزدوی و حاشیہ مطول وغیرہ کتبِ کثیر الحجم مشتمل بر فوائد جمیلہ بودند، ہمہ سوختہ شد و ہمہ را بردند۔ با مستوران مولوی و برادران بانواع ہتک حرمت پیش آمدند — بعد ازاں بر خانہ شیخ حسام الدین عم زادِ حقیقی مولوی وغیرہ برادران و مردم غربا سکنہ قصبہ سہالی بریختند، مال و متاع ہر چہ بود بغارت بردند۔ چوں وقتِ دوپہر از کارہائے مسطور فارغ شدند و مراجعت بمسکنِ خود کہ موضع پینتی پور معمولہ پرگنہ فتح پور و دیوا وغیرہ باشد نمودند، بندہ نظام الدین پسر خُرد مولوی را اسیر کردہ ہمراہ گرفتند، و نعش مولوی و سر محمد آصف چودھری نیز با خود بموضع مذکور بردند۔ بعد از سہ چہار روز از الحاح و عجز بعضے شرفائے فتح پور و دیوا بندہ نظام الدین را خلاص نمودند، و سر محمد آصف دادند، و نعش مولوی را جابجا مدفون می کردند و می برآوردند۔ آخر بعد نہ روز ہر دو دست بریدہ گرفتند و نعش

بہ قصبہ سہالی فرستادند۔ چنانچہ جمع از مسلمین نماز جنازہ خواندہ بتاریخ بست و ہفتم شہر مذکور در قصبہ سہالی مدفون ساختند۔[۵۲]

یعنی ہم مظلومین محمد سعید، نظام الدین اور محمد رضا پسرانِ مولانا قطب الدین ساکن قصبہ سہالی سرکار لکھنؤ صوبہ اودھ پر جو ستم ڈھایا گیا ہے، اس کے متعلق میں آیتِ مبارکہ: لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ[۵۳] کی رُو سے قضاتِ اسلام، مشائخِ کرام اور تمام لوگوں سے سوال کرتا ہوں اور گواہی طلب کرتا ہوں کہ اس نواح کے تمام چھوٹے بڑوں پر یہ بات روشن اور واضح ہے کہ مولانا قطب الدین کمالاتِ انسانی اور فضائلِ علمی و عملی سے متصف تھے۔ وہ قرآنِ مجید کے حافظ تھے اور درس و تدریس، طلبا سے علومِ دینیہ کے مباحث و تکرار اور عبادت، و اطاعتِ الٰہی کے سوا کسی کام سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ ان کا یہ معمول تھا کہ درس و عبادت سے فارغ اوقات میں علم تفسیر و حدیث اور فقہ و اصول پر مشتمل کتابوں کی تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے۔ دوشنبہ کے روز ماہِ رجب ۱۱۰۳ھ کی ایک تاریخ کو نمازِ فجر اور وظائف سے فارغ ہو کر اپنے معمول کے مطابق مدرسے میں تشریف لائے اور ان تمام فضلائے کرام کو جو حاضرِ خدمت تھے، درس دینے لگے۔ ابھی دو گھڑی سورج چڑھا کہ سہالی کی نواحی بستی کے اسد اللہ، باقر اور پیر محمد، قصبہ سہالی کے غلام محی الدین، بساون اور ساون، قصبہ دیوا کا فقیر اللہ، موضع استی علاقہ بجنور کے انور وغیرہ اور گرد و پیش کے دوسرے زمینداروں نے مولانا کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور چاروں طرف سے دیواروں میں نقب لگا کر اندر گھس آئے۔ مولانا کو ایک زخم تیر کا، ایک بندوق کا لگایا، اور سات زخم تلوار کے کیے، جس سے وہ شہید ہو گئے۔ شیخ نظام الدین ساکن امیٹھی کے نبیرۂ گرامی شیخ غلام محمد اور شیخ شرف اللہ ساکن سندیلہ بھی جو فاتحہ فراغت کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر تھے،

---

[۵۲] منقول از مقالاتِ شبلی۔ ج ۲، ص ۱۱۰، ۱۱۱

[۵۳] یہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۳ کے چند مبارک الفاظ ہیں، جن کا ترجمہ یہ ہے: شہادت کو مت چھپاؤ، جو اُسے چھپاتا ہے، اس کا دل گناہ گار ہے۔

ظالموں کے دستِ تظلم سے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ محمد آصف چودھری بھی جو مولانا کی مدد کو آئے، اپنے ساتھیوں سمیت شہید کر دیے گئے۔ مجھ محمد سعید اور تمام طلبا اور شیخ فضل اللہ کو جو سہالی کے نائب قاضی، قاضی عبداللہ کے بھائی تھے اور دیگر لوگوں کو زخمی کر دیا۔

ان مذکورہ بالا لوگوں کو قتل اور زخمی کرنے کے بعد حویلی پر دھاوا بول دیا اور تمام سامان لوٹ لیا۔ کوئی چیز بھی باقی نہ چھوڑی، مولانا کی اور ان دیگر لوگوں کی کتابیں، جو ان کے پاس رہتے تھے، سب نذرِ آتش کر دیں۔ ان میں سے چار قرآنِ مجید اور کتبِ حدیث میں سے مشکوٰۃ وغیرہ پر مشتمل جو ذخیرۂ احادیث موجود تھا، سب جلا کر خاکستر کر دیا۔ خود مولانا کی تصنیفات مثلاً حاشیہ تلویح، شرح عقائد نسفی، تعریفات بزدوی اور حاشیہ مطول وغیرہ سب کتابیں جو بڑی ضخیم تھیں اور بہترین فوائد و مضامین پر مشتمل تھیں، ایک ایک کر کے آگ میں جلا ڈالیں یا لوٹ لیں اور ضائع کر دیں، مولانا کے گھر کی خواتین اور اقارب کی بھی بہت توہین کی اور ان سے نہایت ہتک آمیز سلوک روا رکھا۔

اس کے بعد مولانا کے چچازاد بھائی شیخ حسام الدین اور دوسرے عزیزوں کے گھروں کا رخ کیا، وہاں بھی جی بھر کر لوٹ مار کی۔ اس سے بھی صبر نہ آیا تو قصبہ سہالی کے دیگر غربا کو تختۂ مشق ستم بنایا، ان کا مال و متاع لوٹ لیا اور جو چیز نظر آئی غارت کر دی۔

جب یہ لوگ دوپہر کے وقت اس قتل و غارت سے فارغ ہوئے تو اپنے مسکن موضع بینیتی پور، جو کہ پرگنہ فتح پور اور دیوا کے نواح میں واقع ہے، جاتے ہوئے مجھ نظام الدین کو جو مولانا قطب الدین کا ایک خُرد سالہ بیٹا ہے، گرفتار کر کے اور مولانا کی نعش نیز محمد آصف چودھری کا سر تن سے جدا کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ تین چار روز کے بعد فتح پور اور دیوا کے بعض شرفا و نجبا کی منت و عاجزی سے مجھ نظام الدین کو رہا کیا اور محمد آصف کا سر واپس لوٹایا۔ مولانا کی نعش کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اسے جگہ جگہ دفن کرتے اور نکالتے رہے۔ بالآخر نو دن کے بعد ان کے دونوں ہاتھ کاٹ کر رکھ لیے اور نعش سہالی بھیج دی، جہاں تمام مسلمانوں نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور ۲۷ رجب ۱۱۰۳ھ کو انھیں سہالی میں دفن کیا گیا۔

مولانا سے عداوت اور قتل کی وجہ

تذکرہ نگاروں نے مولانا قطب الدین کی مخالفت اور قتل کی کوئی معقول وجہ بیان نہیں کی اور اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ یہ گروہ یکایک مولانا سے کیوں عداوت پر اُتر آیا تھا۔ چودھری محمد آصف سے تو دشمنی اور مخالفت کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن مولانا قطب الدین کی حیثیت تو بالکل دوسری تھی، وہ ایک درویش منش اور گوشہ گیر آدمی تھے، ان سے آخر کیوں اس قدر عداوت ہوئی کہ معاملہ بے حد سنگین نوعیت اختیار کر گیا اور انھیں نہایت سفاکی اور بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

مولوی ولی اللہ فرنگی محلی لکھ ... ۔ ...دۃ الوسائل میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتلوں کا یہ گروہ نہایت ظالم تھا اور یہ لوگ اپنے حلقۂ زمینداری میں اپنے ماتحتوں پر انتہائی ظلم ڈھاتے اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ ادھر مولانا قطب الدین بہت بڑے عالم اور نہایت متقی اور متدین بزرگ تھے، ان کے ان اوصاف کی وجہ سے بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر بھی ان کا بہت احترام کرتا اور ان سے ربط و تعلق رکھتا تھا، وہ دربار کے امرا اور حکومت کے ذمہ دار اہل کاروں کو اکثر ان کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا۔ اس وجہ سے دوسرے فریق کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ ہمارے مظالم کی تفصیلات کہیں بادشاہ تک نہ پہنچ جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اس خطرے کا سدّباب ضروری سمجھا اور اپنی ستم رانیوں کو چھپانے کے لیے ان میں ایک اور زبردست ستم کا اضافہ کیا۔

بادشاہ کا فرمان اور قاتلوں کا انجام

مولانا قطب الدین کے بیٹے محمد سعید مذکورہ بالا محضر لے کر اورنگ زیب عالم گیر کے پاس دکن پہنچے۔ بادشاہ کو مولانا کے قتل اور اس کی تفصیلات کا علم ہوا تو انتہائی افسوس کا اظہار کیا اور لکھنؤ کے عمالِ حکومت کے نام فرمان بھیجا کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور ان کا غرور و پندار خاک میں ملا دیا جائے۔ صوبے دار لکھنؤ نے فرمانِ شاہی دیکھتے

ہی سرکاری سپاہی روانہ کیے، جنھوں نے قاتلوں کا گھر بار غارت کر دیا اور مخالفین مارے ڈر کے بھاگ کر وطن سے کہیں دور چلے گئے۔ آخر قاتلوں کے اہلِ خانہ اور اعزہ واقارب نے یہ جعلی وفات نامہ تیار کرکے بادشاہ کے دربار میں پیش کیا کہ قاتل اپنی موت مر گئے ہیں۔ اصل قاتل کا نام اسد اللہ تھا جو سہالی کے نواحی گاؤں ہنیتی پور کا رہنے والا تھا۔ وہ روپوش ہو کر قصاص سے بچ گیا تھا اور کئی سال تک زندہ رہا۔ رسالہ قطبیہ کی روایت کے مطابق وہ شخص عام طور پر مولانا قطب الدین شہید کے فرزند شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس نے شیخ کی خدمت میں خون بہا کی پیش کش بھی کی، لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، بلکہ اپنا حصہ معاف ہی فرما دیا۔ وہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، لیکن اس کے آنے سے انھیں تکلیف ہوتی تھی اور وہ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے تھے۔

عمدۃ الوسائل میں مولوی ولی اللہ فرنگی محلی بیان کرتے ہیں کہ میں ۱۲۰۹ھ میں ہنیتی پور گیا اور گاؤں کی حالت دیکھی تو ویران اور تباہ ہو چکا تھا، گاؤں والے کہتے تھے کہ یہ اسی خونِ ناحق کا نتیجہ ہے۔

بادشاہ کی طرف سے مکان کا عطیہ

سلطان اورنگ زیب عالم گیر خدا ترس اور نیک دل بادشاہ تھا۔ اس نے ایک فرمان کے ذریعے مولانا قطب الدین کے صاحب زادوں کو لکھنؤ میں دو مکان عطیہ کیے۔ اس شاہی فرمان کے جو اس خاندان میں موجود ہے، کچھ حصے درج ذیل ہیں:

درین وقت میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ یک منزل حویلی فرنگی محل با متعلقہ آن واقع بلدۂ لکھنؤ مضاف بہ اودھ کہ از امکنۂ نزولی است برائے بوجہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین [illegible] حسب الضمن مقرر فرمودیم، باید کہ حکام و عمال و متصدیان مہمات حال و استقبال و جاگیرداران و کروریان آن را بنام مشار الیہما [illegible] دانستہ بوجہ من الوجوہ مزاحم و معترض نہ شوند و اندرین باب [illegible] مجدد نہ طلبند ــــ مرقوم غرہ ذی قعدہ سال سی و ہفتم جلوس والا

نوشتہ شد۔

فرمان کی پشت پر جو عبارت درج ہے، اس کا پہلا فقرہ یہ ہے:

شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنجشنبہ ۱۴ شعبان المعظم سن ۳۷ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مطابق مرداد ماہ برسالہ صدارت و مشیخت پناہ، فضیلت و کمالات دست گاہ سزاوار مرحمت و احسان، صدر رفیع القدر فاضل خاں و لو بت واقعہ نویسی کم ترین بندگانِ درگاہ خلائق پناہ حسام الدین حسین قلمی می گردد کہ بعرض مقدس و معلی رسید کہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادتِ پدرِ خود قصبہ مذکور را گزاشتہ جلاوطن گردیدند و کدام مکان ہا سکونت ندارند . . .''

مولانا قطب الدین کی شہادت ۱۱۰۳ھ میں ہوئی تھی اور فرمانِ شاہی کی تاریخ تحریر شعبان ۱۱۰۵ھ ہے۔ عالم گیر اس زمانے میں دکن میں تھا، اس لیے شیخ محمد سعید کو وہاں پہنچنے اور فرمان جاری ہوتے دو برس کا عرصہ گزرا۔ اس فرمانِ شاہی کے بعد مولانا قطب الدین شہید کا تمام خاندان سہالی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ یہ خاندان فرنگی محل میں مقیم ہوا، جو علم و عمل کا مرکز بن گیا۔

فرنگی محل کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ فرانس کا ایک سوداگر اس محلے میں تجارت کی غرض سے فروکش تھا۔ اس کے فرنگی ہونے کی وجہ سے اس محلے یا اس کے مکانات کو فرنگی محل کہا جاتا تھا۔ وہ وطن واپس چلا گیا تو اس کے مکانات سرکاری قبضے میں آ گئے۔ بعد ازاں علما کا جو خاندان اس میں آباد ہوا، اس نے فرنگی محلی کی نسبت سے شہرت پائی اور پھر یہ علاقہ مختلف علوم و فنون کا گہوارہ اور ایک خاص نقطۂ فکر کی علامت بن گیا۔

تصنیفات

مولانا قطب الدین شہید سہالوی بہت بڑے مصنّف بھی تھے۔ انھوں نے ہفتے کے سات دنوں کو مختلف علمی کاموں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا۔ جمعہ اور منگل کے دن

وہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ کئی کتابیں ان کی تصنیفات تھیں جو اُن پر حملے کے وقت مخالفین نے ضائع کر دی تھیں۔ ان کی تصنیفات کا ذکر گزشتہ صفحات میں ان کے حالات کے ضمن میں آچکا ہے اور وہ یہ تھیں:

الامور العامہ پر حاشیہ، التلویح پر حاشیہ، شرح حکمت العین پر حاشیہ، شرح العقائد العضدیہ پر حاشیہ، شرح العقائد النسفیہ پر حاشیہ، مطول پر حاشیہ اور ایک رسالہ تحقیق دار الحرب۔

مولانا کے بیٹے

مولانا قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے چار بیٹے تھے۔ شیخ محمد اسعد، شیخ محمد سعید، شیخ نظام الدین اور شیخ محمد رضا۔ شیخ محمد اسعد عمر میں سب سے بڑے اور علم میں بہت ممتاز تھے۔ اپنے فضل و کمال کی وجہ سے باپ کی زندگی ہی میں برہان پور کے منصب صدارت پر فائز ہوئے۔ بادشاہ اورنگ زیب کے دربار سے تعلق رکھتے اور اس کے ہم رکاب رہتے تھے۔ رئیسانہ مزاج کے مالک تھے۔ حاشیہ قدیمہ پر حاشیہ تحریر کیا اور ایک مناظرے میں ملا جیون امیٹھوی پر فتح پائی۔ شاہ عالم کے زمانے میں فوت ہوئے۔ باپ کی شہادت کے وقت سہالی میں موجود نہ تھے۔

ملا قطب الدین کے دوسرے صاحب زادے شیخ محمد سعید تھے۔ باپ کی شہادت کے وقت سہالی میں موجود تھے، حملے کے وقت زخمی ہو گئے تھے اور دشمن انھیں قیدی بنا کر ساتھ لے گئے تھے۔ صحت یاب ہوئے تو بادشاہ کی خدمت میں محضر پیش کرنے اور اپنی مظلومیت کی تفصیلات بتانے دکن گئے اور لکھنؤ میں اقامت کے لیے فرنگی محل کے حصول اور معافی کا فرمان لائے۔ علم فقہ پر اس قدر عبور تھا کہ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں شامل ہوئے۔ عین عالم جوانی میں شاہ عالم کے عہد میں وفات پائی۔

مولانا کے تیسرے بیٹے شیخ نظام الدین تھے، باپ کی شہادت کے وقت چودہ پندرہ سال کی عمر کے تھے۔ بڑے بھائی محمد سعید کے ساتھ سہالی سے لکھنؤ چلے گئے

تھے اور خاندان کے دیگر افراد کی معیت میں فرنگی محل میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ برصغیر کے جلیل القدر عالم، معقولات و منقولات کے ماہر اور نہایت ذہین و فطین تھے۔ برصغیر پاک و ہند کے دینی عربی مدارس میں تین سو سال سے درسِ نظامیہ کے نام سے جس نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، اس کے مرتب و مصنف یہی فاضل گرامی قدر تھے اور ان ہی کے نام کی نسبت سے اسے درسِ نظامیہ کہا جاتا ہے۔ ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ کو سفر آخرت اختیار کیا۔

چوتھے لڑکے محمد رضا تھے جو سب سے چھوٹے تھے اور باپ کی شہادت کے وقت ان کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ علوم متداولہ بڑے بھائی نظام الدین سے پڑھے اور غالباً ان ہی کی زندگی میں انتقال کر گئے تھے۔ درس و افادہ میں سرگرم رہتے تھے۔

مولانا قطب الدین کے حالات کے ضمن میں ان کے صاحب زادوں کا یہ مختصر سا تعارف ہے۔ ان کے جو حالات ہمیں میسّر آسکے، ان شاء اللہ فقہائے ہند کی جلد پنجم کے حصہ دوم میں اپنے اصل مقام پر بیان ہوں گے۔[۵۴]

۱۵۲۔ سید قطب الدین شمس آبادی

مولانا سید قطب الدین حسینی شمس آبادی، درحقیقت ساداتِ امیٹھی میں سے تھے، بعد میں شمس آباد منتقل ہو گئے تھے، جو اعمال قنوج میں واقع ہے، لہٰذا شمس آبادی

---

۵۴ مولانا قطب الدین کے حالات کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں میں ملاحظہ کیجیے۔ مآثر الکرام، ص ۱۹۸، ۱۹۹ — سبحۃ المرجان، ص ۷۶ — رسالہ قطبیہ — اغصانِ اربعہ — عمدۃ الوسائل — اغصان الانساب — تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۰ تا ۱۹ — ابجد العلوم، ص ۹۰۴، ۹۰۵ — احوال علمائے فرنگی محل، ص ۱ تا ۱۱ — مقالاتِ شبلی - ج ۳، ص ۱۰۶ تا ۱۱۴ — آثار الاول — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶۷ تا ۱۶۹ — نزہۃ الخواطر - ج ۶، ص ۲۳۰، ۲۳۱ — حدائق الحنفیہ ص ۴۲۹ — برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، ص ۳۱۸ تا ۳۳۱ — تذکرہ علمائے فرنگی محل۔

کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ اپنے دور کی عظیم شخصیت اور ہندوستان کے فحول و اکابر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تمام عمر درس و افادہ میں مصروف رہے اور بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں مولانا قطب الدین شہید سہالوی کے ہم درس تھے، لیکن مولانا شہید ان سے پہلے فارغ التحصیل ہو گئے تھے اور خود اپنی مسندِ تدریس آراستہ کر لی تھی۔ اس زمانے میں یہ بھی مولانا شہید کی خدمت میں گئے اور بقیہ کتبِ درسیہ کے لیے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

نہایت قانع، بے نیاز، متوکل علی اللہ اور پاک باز عالمِ دین تھے۔ بڑی عسرت کی زندگی بسر کرتے، کئی کئی دن چولہے میں آگ نہ جلتی اور کوئی چیز کھانے کو میسر نہ آتی، لیکن نہ کسی سے اپنی ضرورت کا اظہار کرتے اور نہ حرفِ شکایت زبان پر لاتے، اسی حالت میں مصروفِ تدریس اور افادۂ طلبا میں سرگرم رہتے۔ طلبا اور مستفیدین سے خندہ پیشانی سے ملتے اور مسرت آمیز لہجے میں ان سے باتیں کرتے۔ کتبِ درسیہ کے مشکل اور پیچیدہ مسائل طلبا کی ذہنی اور علمی قابلیت کے مطابق انتہائی آسان الفاظ میں حل کر دیتے۔ علومِ متداولہ پر گہری نظر تھی اور ہر آن طالبانِ علم کا ہجوم گرد و پیش رہتا۔

بقول تذکرہ نگاروں کے ان کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن میں قاضی محب اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ)، حافظ امان اللہ بنارسی (متوفی ۱۱۳۳ھ) اور سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی (متوفی ۱۱۵۱ھ) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں اور یہ وہ حضراتِ علما ہیں، جنھوں نے اس برصغیر میں اپنے علم و فضل اور تحقیق و کاوش کے میدان میں نہایت شہرت حاصل کی اور خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔

سید قطب الدین شمس آبادی نے ۱۱۲۱ھ میں ستر سال کی عمر پا کر وفات پائی۔[۵]

---

۵ رسالہ قطبیہ —— مآثر الکرام، ص ۲۰۰ —— سبحۃ المرجان، ص ۶ —— ابجد العلوم، ص ۹۰۵ —— حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۴ —— تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶۹ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۱، ۲۳۲

۱۵۳۔ سید قطب الدین اورنگ آبادی

سید قطب الدین بن سعد اللہ حسینی بہاری ثم اورنگ آبادی، ۱۹ ربیع الثانی ۱۱۲۰ھ کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کا آغاز کیا۔ بعض کتابیں حافظ سماعیل سے اور بعض مولانا حبیب اللہ سے پڑھیں۔ فنونِ ریاضی کی تحصیل حاجی حسام الدین سے کی اور مدت تک ان حضرات سے وابستہ رہے، یہاں تک کہ اصول و فروع میں مرتبۂ کمال کو پہنچے اور تمام علوم مروجہ اور فنونِ متداولہ میں نامور ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے والدِ مکرم سید سعد اللہ حسینی کی جگہ مسندِ مشیخت کو زینت بخشی۔

سید صاحب موصوف بہت سے اوصاف سے متصف تھے۔ معقولات و منقولات میں یدطولیٰ رکھتے تھے اور ہمیشہ درس و افادہ میں سرگرم رہتے۔ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۹ھ کو فوت ہوئے۔[۵۶]

۱۵۴۔ شیخ قطب الدین سرہندی

شیخ قطب الدین حنفی نقشبندی سرہندی، حدیث اور فقہ کے جلیل القدر عالم تھے۔ شیخ محمد زبیر سرہندی سے اخذ طریقت کیا اور مدتِ مدید تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ ۱۱۷۳ھ میں حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت سے بہرہ مند ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ اذکار و اشغال سے متعلق "وھب الزبیر" کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی۔[۵۷]

---

۵۶ مآثر الامرا۔ ج ۲، ص ۷۲ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۳۲

۵۷ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۳۳

۱۵۵۔مولانا قطب الدین عباسی الہ آبادی

مولانا قطب الدین عباسی الہ آبادی، برِ صغیر کے رفیع المنزلت عالم و شیخ اور مشہور مصنّف حضرت مولانا محمد فاخر زائر عباسی الہ آبادی کے فرزند رشید تھے اور اپنے دور کے عظیم فضلا اور جیّد علما میں سے تھے۔ ابتدائے محرم ۱۱۳۸ھ کو الہ آباد میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ فلسفہ و منطق کی کتابیں شیخ برکت اللہ الہ آبادی سے پڑھیں، شیخ کمال الدین فتح پوری (متوفی ۱۴ محرم ۱۱۷۵ھ) کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان کے والدِ گرامی قدر شیخ محمد فاخر حج کو گئے تو یہ لائق بیٹا ان کی مسندِ رشد و ہدایت پر متمکن ہوا۔ طویل عرصے تک نہایت عمدہ اسلوب اور کتاب و سنت کے مطابق یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ صلاح و خیر، قناعت و ایثار اور عفت و تقویٰ کے اوصاف سے موصوف تھے۔

مولانا موصوف بارھویں صدی ہجری میں دیارِ ہند کے عالمِ کبیر اور فقہ و اصول اور منطق و حکمت کے نامور فاضل تھے۔ شاعر بھی تھے اور فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، مصیبؔ تخلص کرتے تھے۔ دونوں زبانوں میں ان کے مستقل دیوان بھی ہیں۔

دار الحرب کے مسئلے سے متعلق ایک رسالہ تصنیف کیا۔ علمِ منطق میں بھی ایک رسالہ لکھا۔ ان کا ایک ایسا مجموعۂ کلام بھی ہے، جو ہم وزن مختلف اشعار پر مشتمل ہے، اس مجموعہ کلام کا نام انھوں نے "بستان الحقیقت" رکھا۔

حج بیت اللہ کے ارادے سے حجاز مقدس گئے اور مکہ مکرمہ پہنچے تو حج سے پہلے ہی ماہ ذی قعدہ ۱۱۸۷ھ میں وفات پا گئے، مکہ مکرمہ ہی میں دفن کیے گئے۔[۵۸]

---

۵۸ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۳۴ ــــ اتحاف النبلا بضمن ترجمہ مولانا محمد فاخر الہ آبادی۔

ص ۲۰۷۔

۱۵۶۔ سیّد قطب احمد حیدر آبادی

سید قطب عالم حیدر آبادی، شیخِ وقت، فاضلِ کبیر اور جلیل القدر عالم تھے۔ حیدر آباد کے مفتی، سید میران بخاری بیجا پوری (متوفی ۱۱۲۵ھ) کے فرزندِ رشید تھے۔ مسلکاً حنفی تھے۔ حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والدِ مکرم سید میران سے علم حاصل کیا اور درس وافادہ کو اپنا مشغلہ قرار دیا۔ اپنے علم وفضل کی بنا پر حیدر آباد کی مسندِ افتا پر فائز ہوئے۔ حیدر آباد اور اس کے نواح میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا اور افتا و مسائل میں لوگ ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ خلقِ کثیر نے ان سے علمی استفادہ کیا۔۔۔۔ اس عالم و فقیہ نے ۴ شوال ۱۱۶۳ھ کو وفات پائی [۹]

۱۵۷۔ قاضی قل احمد سترکھی

قاضی قل احمد بن احمد مسعود بن نعمت اللہ بن ولی محمد سترکھی، حنفی المسلک تھے اور مشہور اصحابِ تقویٰ فقہائے ہند میں گردانے جاتے تھے۔ سترکھ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اپنے والدِ گرامی اور دیگر علمائے وقت سے علمِ فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے والد مرحوم کی جگہ سترکھ کے منصبِ قضا پر متعین ہوئے اور تا زندگی یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ مغل حکمران محمد شاہ کے عہد میں وفات پائی [۱۰]

۱۵۸۔ سیّد قمر الدین اورنگ آبادی

سید قمر الدین بن منیب اللہ بن عنایت اللہ حسینی بالاپوری ثم اورنگ آبادی،

---

[۹] محبوب ذی المنن حصہ دوم، ص ۲۲۳،۲۲۴۔۔۔۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۳۵

[۱۰] نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۳۵

علومِ عقلیہ و نقلیہ میں اتنے ماہر تھے کہ درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ ان کے آبا و اجداد سادات خجند میں سے تھے۔ ان کے اسلاف میں سے ایک بزرگ سید ظہیر الدین خجندی وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور پنجاب میں ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں ایمن آباد میں سکونت اختیار کی۔ بعدازاں سید ظہیر الدین کے پوتے سید محمد نے ایمن آباد سے دکن کا رُخ کیا اور وہیں مستقل طور پر اقامت گزین ہو گئے۔

سید قمر الدین ۱۱۲۳ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والدِ گرامی سید منیب اللہ (متوفی ۱۱۶۱ھ) سے حصولِ علم کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے قرآنِ مجید حفظ کیا۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے مطابق باپ سے اخذِ طریقت بھی کیا۔ ۱۱۵۵ھ میں دہلی گئے اور وہاں کے بعض علما و مشائخ سے علومِ متداولہ کی کتابیں پڑھیں۔ دو سال دہلی رہے۔ ۱۱۵۷ھ میں عازمِ سرہند ہوئے اور بعض اساتذۂ عصر سے تحصیل کی۔ پھر لاہور گئے اور یہاں کے علما و مشائخ سے ملے اور استفادہ کیا۔ ۱۱۵۸ھ میں بالاپور گئے اور وہاں سے اورنگ آباد کا قصد کیا، ایک عرصہ تک وہاں قیام پذیر رہنے کے بعد ۱۱۷۴ھ میں اپنے دو بلند مرتبت بیٹوں نور الہدیٰ اور نور العلیٰ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ ۱۱۷۵ھ میں واپس آئے اور درس و افادہ میں سرگرم ہو گئے۔

سید قمر الدین اورنگ آباد کی بہت بڑے عالم، عظیم فقیہ اور معقولات و منقولات کے ماہر کامل تھے۔ اس زمانے میں بحث و اشتغال میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا اور بے شمار علما و طلبا نے ان کے درس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔

سید موصوف مصنّف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:

مظہر النور۔ یہ عربی زبان میں وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مفصل و بسیط کتاب ہے۔ اس کا سالِ تصنیف ۱۱۶۴ھ ہے۔

نور الکریمتین

نور الطہور

سید زاہد ہروی کی ایک لغزشِ علمی کے بارے میں جو اُن سے حاشیہ قطبی میں سرزد ہوئی ایک رسالہ لکھا۔

مسائلِ فقہ میں ایک رسالہ تحریر کیا۔

تاویلِ رؤیا کے بارے میں ایک رسالہ قلم بند کیا۔

اس کے علاوہ کچھ اور کتب و رسائل بھی ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

اس عالم و فقیہ نے سوموار کے دن ۲ ربیع الاوّل ۱۱۹۳ھ کو اورنگ آباد (دکن) میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔[۱]

ک

۱۵۹۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی

شیخ کلیم اللہ بن نور اللہ بن محمد صالح صدیقی جہاں آبادی، ۲۴ جمادی الاخریٰ ۱۰۶۰ھ کو دارالحکومت دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور اساتذۂ عصر سے حصولِ علم کیا۔ پھر حجاز مقدس گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ طویل عرصے تک وہاں مقیم رہے اور مختلف علما و مشائخ سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا۔ بعدازاں ہندوستان کو معاودت کی اور دہلی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ عابد و زاہد اور متقی عالم دین تھے۔ اپنے عہد کے شیخ اور جلیل القدر فاضل تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ شیخ کلیم اللہ کے آبا و اجداد معمار تھے جو مکانوں کی تعمیر کا کام کرتے تھے، لیکن کلیم اللہ کو اللہ نے تعمیرِ قلوب اور اصلاحِ باطن کے لیے منتخب کیا۔ دہلی کی جامع مسجد جو شاہ جہان کے عہدِ حکومت میں تعمیر کی گئی، اسی

---

[۱] سبحۃ المرجان، ص ۱۰۱ تا ۱۱۲ — خزانہ عامرہ، ص ۳۸۰ تا ۳۸۴ — ابجد العلوم، ص ۹۱۹ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۲، ۴۵۳ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۰ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۳۸، ۲۳۹ — محبوب ذی المنن حصہ دوم، ص ۶۰۷ تا ۶۲۱۔

شیخ کلیم اللہ کے جدِ امجد محمد صالح نے تعمیر کی تھی، وہ اپنے دور کے بہت بڑے مہندس اور انجنیئر تھے۔

شیخ کلیم اللہ جہان آبادی، جہاں مشہور مدرس اور علومِ عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے، وہاں اچھے مصنّف بھی تھے۔ مختلف عنوانات پر انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں قرآنِ مجید کی تفسیر بھی شامل ہے۔ باقی تصنیفات کے نام یہ ہیں، کشکول، المرقع فی الرقی والتکسیر، سواء السبیل، عشرۂ کاملہ، رسالہ در ردِّ روافض، مجموعہ مکتوباتِ کلیمی۔ انھوں نے شیخ بو علی سینا کی القانون کی شرح بھی سپردِ قلم کی جس کا ایک نسخہ مکتبہ حامدیہ رام پور (ہندوستان) میں موجود ہے۔

شیخ موصوف نے ۲۴ ربیع الاوّل ۱۱۴۱ھ (ایک روایت کے مطابق ۱۱۴۳ھ) کو وفات پائی اور اپنی حویلی میں دفن کیے گئے جو دہلی کے خانم بازار میں واقع تھی۔[1]

۱۶۰۔ سیّد کلیم اللہ مکّی

سید کلیم اللہ محمد بن عبد السلام بن محمد بن نور محمد، شیخ و فاضل اور علامۂ وقت تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ سید کلیم اللہ کی ولادت مکہ مکرّمہ میں ہوئی اور علم و معرفت کی گود اور فضل و کمال کی آغوش میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اپنے والدِ مکرّم سید عبد السلام سے تعلیم پائی۔ علمِ فقہ بھی ان ہی سے حاصل کیا، سلسلۂ قادریہ میں اخذِ طریقت بھی ان ہی سے کیا، یہاں تک کہ اجل علما کے رتبے اور کبار مشائخ کے درجے کو پہنچے۔ بعد ازاں والدِ محترم کی اجازت

---

[1] مآثر الکرام، ص ۱۴۱ ــــ تقصار جنود الاحرار، ص ۲۰۰ ــــ خزینۃ الاصفیا۔ ج ۱، ص ۴۹۴، ۴۹۵ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۲ ــــ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۸، ۴۳۹ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۴۰، ۲۴۱ ــــ مشائخ چشت، ص ۳۶۶ ــــ انوار العارفین، ص ۴۲۹، ۴۳۰ ــــ واقعات دار الحکومت دہلی۔ ج ۳، ص ۱۱۶، ۱۱۷ ــــ محبوب ذی المنن حصہ دوم، ص ۲۷، ۲۸۔

سے ۱۱۰۵ھ میں ہندوستان کا سفر کیا اور دکن میں آ گئے اور وہاں کے مشہور مقام بالکنڈہ میں جو اعمالِ حیدرآباد میں واقع ہے، اقامت اختیار کی۔

سید کلیم اللہ مکی جو ہندوستان میں مستقل قیام کی وجہ سے ہندی کہلائے، اپنے دور کے عظیم آدمی اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ نامور فقیہ اور پُرجوش مبلغ تھے۔ عوام کو رشد و ہدایت کی راہ پر لگانا، ان کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا۔ لوگوں سے بیعت لیتے تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نہایت سخت تھے۔ زہد و عبادت کی تلقین فرماتے اور شریعتِ غرا پر استقلال و استقامت کی تاکید کرتے۔ زاہد و قانع، عبادت گزار، متوکل علی اللہ، پیکرِ ورع و تقویٰ، مرقعِ حسنِ اخلاق، متواضع، حلیم الطبع اور نرم خُو تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ و استفاضہ کیا۔

بارھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ اور دینِ اسلام کے سرگرم مبلغ و ناشر نے ۱۱۰۵ھ میں بالکنڈہ (دکن) میں داعی اجل کو لبیک کہا۔[۵۲]

۱۶۱- شیخ کمال الدین سندھی

شیخ کمال الدین بن عنایت اللہ بھکری سندھی، عالم و فقیہ اور مشہور فاضل تھے۔ ان کے زمانے میں کوئی عالم فضائل و کمالات میں ان کا ہم سر نہ تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں دیوانِ حافظ کی ایک مفصل شرح اور اصطلاحاتِ رضویہ شامل ہیں۔ اس باکمال سندھی عالم و فقیہ نے ۱۱۳۲ھ میں وفات پائی۔[۵۳]

۱۶۲- شیخ کمال الدین فتح پوری

شیخ کمال الدین بن محمد دولت بن محمد یعقوب انصاری سہالوی ثم فتح پوری، اپنے وقت

---

۵۲ نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۲۴۱، ۲۴۲

۵۳ تحفۃ الکرام، ص — نزہۃ الخواطر- ج ۶، ص ۲۴۲

کے عالم کبیر اور علوم متعارفہ کے امام تھے۔ شیخ قطب الدین انصاری سہالوی کے ابنِ عم تھے۔ ان کے والدِ گرامی قاضی محمد دولت جو ارضِ ہند کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے، شیخ قطب الدین کی شہادت کے بعد ۱۱۰۳ھ میں سہالی سے فتح پور چلے گئے تھے، لہٰذا فتح پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان کے زیرِ تذکرہ بیٹے کمال الدین فتح پور ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ اس لیے ابًا و جدًا سہالوی ہونے کے باوجود اپنے مولد و منشا کی وجہ سے فتح پوری کی نسبت ہی سے شہرت پائی۔

شیخ کمال الدین نے بعض درسی کتابیں اپنے ایک ہم نام شیخ کمال الدین عظیم آبادی سے پڑھیں اور باقی کتبِ درسیہ کی تکمیل کے لیے درسِ نظامیہ کے بانی علامہ شہیر شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ طویل عرصے تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے اور اس قدر استفادہ کیا کہ شیخ کے تلامذہ اور فیض یافتہ حضرات میں سے کوئی اس مرتبے کو نہیں پہنچ سکا، جس مرتبۂ علمی کو یہ پہنچے۔ شیخ کی زندگی ہی میں سرگرمِ تدریس ہو گئے تھے اور اکابر علمائے ہند میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ معقولات و منقولات میں اس درجہ ممتاز حیثیت کے مالک تھے کہ کوئی ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ اصول و فروع میں کامل تھے، بالخصوص علمِ کلام اور منطق و حکمت میں سب سے فائق تھے۔ علاوہ ازیں حدیث و فقہ میں بھی مرجع مستفدین تھے۔ نہایت ذکی اور ذہین و فطین تھے۔ متعدد علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ جن اجل علما نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، ان میں مولانا محمد برکت الہ آبادی، مولانا محمد حسن لکھنوی، مولانا محمد ولی لکھنوی، مولانا محمد اعلم سندیلوی، شیخ عبداللہ سندیلوی اور ملا حمد اللہ سندیلوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

شیخ کمال الدین موصوف کئی دقیق علمی کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں کبریتِ احمر، عروۃ الوثقیٰ، حاشیہ کمالیہ بر شرح عقائد جلالیہ، شرح تہذیب کے حاشیہ زاہدی پر تعلیقات وغیرہ، شامل ہیں ــــ ارضِ ہند کے یہ عظیم صاحبِ علم ستّر سال سے زائد عمر پا کر ۱۴ محرم ۱۱۷۵ھ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے[۱]۔

---

[۱] مآثر الکرام، ص ۲۸۹، ۲۹۰ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۲، ۱۷۳ ــــ اغصان الانساب (از رضی الدین محمود فتح پوری) ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۶، ص ۲۴۲، ۲۴۳

مراجع و مصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ ابجد العلوم : نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع صدیقیہ بھوپال۔ ۹۵

۲۔ اتحاف النبلا : نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع نظامی، کان پور۔ ۸۸

۳۔ احوال علمائے فرنگی محل : شیخ الطاف الرحمٰن۔ مطبع مجتبائی۔

۴۔ اخبار الصنادید : حکیم نجم الغنی رام پوری۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۸

۵۔ ادبیاتِ سرحد : رضا ہمدانی۔ نیا مکتبہ، پشاور۔ ۱۹۵۳ء

۶۔ ادبیاتِ سرحد : فارغ بخاری۔ نیا مکتبہ، پشاور۔ ۱۹۵۵ء

۷۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ : پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بہ ضمن "د
ضمون ڈاکٹر محمد جہاں گیر خاں۔

۸۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ : پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بہ ضمن "ابو المظ
اورنگ زیب عالم گیر" مضمون شیر محمد گریوال۔

۹۔ اذکار الابرار : شاہ محمد تقی حیدر۔ شاہی پریس، لکھنؤ۔ ۱۳۵۷ھ

۱۰۔ ارمغان شاہ ولی اللہ : محمد سرور جامعی۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔

۱۱۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین : شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبع احمدی

۱۲۔ انفاس العارفین : شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ د
۱۹۱۷ء۔

۱۳۔ انوار العارفین : حافظ محمد حسین مراد آبادی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۶

۱۴۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر : علامہ شبلی۔ مطبوعہ مشہور آفسٹ
کراچی۔ ناشر اردو مرکز، گنپت روڈ، لاہور۔ طبع ششم۔ ۱۹۴۹ء

۱۵۔ برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ : محمد اسحاق بھٹی۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہو

۱۶۔ برہان پور کے سندھی اولیا المعروف بہ تذکرہ اولیائے سندھ : سید محمد مط

راشد برہان پوری - سندھی ادبی بورڈ، کراچی - طبع اوّل ۱۹۷۰ء

۱۷- بزمِ تیموریہ : سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن - دارالمصنفین، اعظم گڑھ -

۱۸- بزمِ سخن : سیّد علی حسن خاں بن نواب سیّد محمد صدیق حسن خاں، مطبع نامی مفید عام، آگرہ - ۱۲۹۸ھ - ۱۸۸۱ء

۱۹- بوستانِ اخبار : سعید احمد مارہروی - مطبوعہ آگرہ - ۱۳۳۱ھ

۲۰- تاریخ برہان پور : خلیل الرحمٰن برہان پوری - مطبع مجتبائی، دہلی - ۱۳۱۷ھ

۲۱- تاریخ تحفۃ الکرام : جلد اوّل، دوم، سوم - مطبع حسینی اثنا عشری، محلہ فراش خانہ وزیر گنج، و مطبع ناصری، لاہور - ۱۳۰۴ھ -

۲۲- تاریخ خورشید شاہی : غلام امام خاں تریں - مطبع خورشیدیہ، حیدرآباد (دکن) - ۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء

۲۳- تاریخ شیرازِ ہند جون پور : سید اقبال حسین - ادارہ شیرازِ ہند پبلشنگ ہاؤس، جون پور - ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۴ء -

۲۴- تاریخ کشمیر اعظمی : خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری - ناشر، غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب سری نگر - ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء

۲۵- تاریخ مشاہیرِ چشت : خلیق احمد نظامی - ندوۃ المصنفین، دہلی - ۱۹۵۳ء

۲۶- تاریخ معصومی : میر محمد معصوم بھکری - سندھی ادبی بورڈ، کراچی - ۱۹۵۹ء

۲۷- تاریخ النوائط : نواب عزیز جنگ بہادر - مطبوعہ عزیز المطابع، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۲ھ -

۲۸- تجلی نور المعروف بہ تذکرہ مشاہیرِ جون پور : نور الدین زیدی، مطبع اعظم المطابع، جون پور - ۱۸۸۹ء

۲۹- تحفۃ الکرام : میر علی شیر قانع - سندھی ادبی بورڈ، کراچی - ۱۹۵۹ء

۳۰- تحفہ کشمیر : منشی گنیش لعل دہلوی - مطبع کوہ نور، لاہور - ۱۸۵۳ء

۳۱- تحقیقاتِ چشتی : نور احمد چشتی - پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور - ۱۹۶۴ء

۳۲- تذکرہ آثار الشعرا : سید محمد ممتاز - مطبع شاہ جہانی، بھوپال - ۱۳۰۴ھ

۳۳- تذکرۃ الابرار والاشرار: حضرت اخون درویزہ- ادارہ اشاعتِ سرحد، قصہ خوانی بازار پشاور۔

۳۴- تذکرۂ بنارس: جلد اوّل، سید مظہر حسن کوروی- سلیمانی پریس بنارس- طبع اوّل- ۱۹۱۶ء

۳۵- تذکرہ جلوۂ خضر: فرزند احمد صغیر بلگرامی- مطبع نور الانوار، آگرہ- طبع اوّل- ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۴ء

۳۶- تذکرۃ الشعرا: امیر دولت شاہ- مطبع مجیدی کان پور- ۱۳۲۶ھ

۳۷- تذکرہ شعرائے اورنگ آباد: مولوی سردار علی حیدر آبادی- شمس الاسلام پریس، حیدر آباد (دکن)- ۱۳۴۵ھ

۳۸- تذکرہ شعرائے اُردو: میر حسن دہلوی- مقدمہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی- مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ- ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء

۳۹- تذکرہ صوفیائے سندھ: اعجاز الحق قدوسی- اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی- ۱۹۵۹ء

۴۰- تذکرۃ العلماء والمشائخ: محمد الدین فوق- گلزار محمدیہ سٹیم پریس، لاہور- ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء

۴۱- تذکرہ علمائے فرنگی محل: مولوی محمد عنایت اللہ- مطبوعہ لکھنؤ- ۱۹۳۰ء

۴۲- تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی- مطبع نول کشور، لکھنو- ۱۹۱۴ء

۴۳- تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ، محمد ایوب قادری): ناشر: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء-

۴۴- تذکرہ فارسی گویاں: غلام ہمدانی مصحفی- انجمن ترقی اُردو، دہلی- ۱۹۳۴ء

۴۵- تذکرہ گلشنِ بے خار: نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ — مرتبہ، کلب علی خاں فائق- مجلس ترقی ادب، لاہور- ۱۹۷۳ء

۴۶- تذکرہ مشائخ بنارس: ابو الاثر عبد السلام- ندوۃ المعارف، بنارس- ۱۳۷۱ھ

۴۷- تذکرہ مشاہیر کاکوری: محمد علی حیدر- مطبع اصح المطابع، لکھنو- ۱۹۲۷ء

۴۸- تذکرہ مصنفین درسِ نظامی: اختر راہی- مسلم اکادمی، محمد نگر، لاہور- ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء

۴۹- تذکرہ مورخین: نبی احمد سندیلوی- مطبع سلیمانی، بنارس- ۱۹۲۶ء

۴۸- تذکرہ ہندی گویاں : غلام ہمدانی مصحفی - مرتبہ، عبدالحق، جامع برقی پریس، دہلی - ۱۹۳۳ء
۴۹- تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار : نواب صدیق حسن خاں - مطبع
شاہجہانی، بھوپال - ۱۲۹۸ھ
۵۰- الثقافۃ الاسلامیہ فی الهند : سید عبدالحی حسنی لکھنوی - مطبوعہ دمشق - ۱۹۵۸ء
۵۱- چمنستانِ شعرا : رائے لچھمی نرائن شفیق - مرتبہ : عبدالحق - انجمن ترقی اردو
اورنگ آباد (دکن) طبع اوّل - ۱۹۲۸ء
۵۲- حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ : محمد حسن نقشبندی مجددی مظہری - مطبوعہ مسلم
پریس لاہور -
۵۳- حدائق الحنفیہ : مولوی فقیر محمد جہلمی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء
۵۴- حدیقۃ الاولیا : مفتی غلام سرور لاہوری - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۷۷ء
۵۵- حکایاتِ کشمیر : محمد الدین فوق - کریمی پریس، لاہور - ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء
۵۶- حیات حافظ رحمت خاں : سید الطاف علی بریلوی - اکیڈیمی آف ایجوکیشنل
ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی (طبع ثانی) - ۱۹۶۳ء -
۵۹- حیات العلما : سید عبدالباقی سہسوانی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء
۶۰- حیاتِ ولی : مولانا محمد رحیم بخش دہلوی - مکتبہ سلفیہ، لاہور - ۱۹۵۵ء
۶۱- خزانۂ عامرہ : میر سید غلام علی آزاد بلگرامی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۹۱۴ء
۶۲- خزینۃ الاصفیا : مفتی غلام سرور لاہوری - مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیج ناتھ
به ثمر ہند، لکھنؤ - ۱۲۹۰ھ -
۶۳- خلاصۃ التواریخ : لالہ سجان رائے بٹالوی - بہ تصحیح ظفر حسن - مطبع جی اینڈ سنز،
دہلی - ۱۹۱۸ء
۶۴- دولتِ مغلیہ کی ہیئتِ مرکزی : ابن حسن - ترجمہ، عبدالغنی نیازی - مجلس
ترقی ادب، لاہور - ۱۹۵۸ء
۶۵- دہلی اور اس کے اطراف : سید عبدالحی حسنی لکھنوی - انجمن ترقی اردو، دہلی - ۱۹۵۸ء -

۶۶- دیوانِ درد (اردو) : مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی - مجلس ترقی ادب، لاہور - ۱۹۶۲ء
۶۷- دیوان میرزا مظہر جان جاناں : مطبع مصطفائی، کان پور - ۱۲۷۱ھ
۶۸- ذخیرۃ الخوانین : شیخ فرید بھکری - مقدمہ و تصحیح، ڈاکٹر سید معین الحق - پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی -
۶۹- رقعاتِ عالم گیری : مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۹۲۴ء
۷۰- رودِ کوثر : ڈاکٹر شیخ محمد اکرام - ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور - ۱۹۷۵ء
۷۱- روضۃ الابرار : محمد الدین - سراج المطابع، جہلم - ۱۳۰۲ھ
۷۲- روضۃ الاولیا : غلام علی آزاد بلگرامی - مطبع اعجاز صفدری، حیدر آباد (دکن) - ۱۳۰۱ھ
۷۳- ریاض الفصحا : (تذکرہ ہندی گویاں) - غلام ہمدانی مصحفی - مرتبہ مولوی عبدالحق - جامع برقی پریس، دہلی - طبع اوّل - ۱۹۳۴ء
۷۴- سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان : غلام علی آزاد بلگرامی - طبع بمبئی - ۱۳۰۳ھ
۷۵- سخندانِ فارس : محمد حسین آزاد - مطبع مفید عام، لاہور - ۱۹۰۷ء
۷۶- سخن شعرا : عبدالغفور نسّاخ - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۲۹۱ھ - ۱۸۷۴ء
۷۷- سروِ آزاد : غلام علی آزاد بلگرامی - مطبع مفید عام، آگرہ - ۱۹۱۰ء
۷۸- سفینۃ الاولیا : دارا شکوہ - مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۸۸۴ء
۷۹- سید احمد شہید : غلام رسول مہر - کتاب منزل، لاہور - ۱۹۵۴ء
۸۰- سیرت سید احمد شہید : ابوالحسن علی ندوی - لاہور
۸۱- سیر الاولیا : محمد مبارک علوی المعروف بہ امیر خرد کرمانی - مطبع محبِ ہند، دہلی - ۱۳۰۲ھ
۸۲- سیر المتاخرین : غلام حسین خاں طباطبائی - نول کشور، لکھنؤ -
۸۳- سیر المصنفین جلد اول : محمد یحییٰ تنہا - محبوب المطابع، دہلی - ۱۹۲۴ء
۸۴- سیر المصنفین جلد دوم : محمد یحییٰ تنہا - جامعہ ملیہ پریس، دہلی - ۱۹۲۸ء
۸۵- شبابِ کشمیر : محمد الدین فوق - علمی پرنٹنگ پریس، لاہور - ۱۳۴۷ھ - ۱۹۲۹ء
۸۶- طرب الاماثل بتراجم الافاضل : مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی، مطبع یوسفی، لکھنؤ -

۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء-

۸۷- عالم گیر نامہ: منشی محمد کاظم - کالج پریس، کلکتہ- ۱۸۶۸ء

۸۸- عہد اسلامی کا ہندوستان: ریاست علی ندوی- ادارۃ المصنفین، پٹنہ- ۱۹۵۰ء

۸۹- عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ: (ترجمہ تاریخ فرخ آباد، مفتی ولی اللہ فرخ آبادی) مرتبہ محمد ایوب قادری، اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی- ۱۹۶۵ء

۹۰- فرحت الناظرین (شخصیات): محمد اسلم پسروری- ترجمہ و ترتیب، محمد ایوب قادری، اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۹۷۲ء

۹۱- الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی، مطبوعہ مصر طبع اوّل- ۱۳۲۴ھ-

۹۲- قاموس الاعلام: شمس اللہ قادری- حیدر آباد (دکن) ۱۹۳۵ء

۹۳- قاموس المشاہیر: جلد اوّل، دوم، سوم، نظام الدین حسین نظامی بدایونی- نظامی پریس، بدایوں- ۱۹۲۴- ۱۹۲۶ء

۹۴- قضاء الارب من ذکرہ علماء النحو والادب: ذوالفقار احمد- مطبع فیض منبع مفید عام، آگرہ- ۱۳۱۶ھ-

۹۵- کلمات طیبات: ابوالخیر محمد بن احمد مراد آبادی- مطبع مجتبائی دہلی- ۱۳۰۹ھ

۹۶- گل رعنا: سید عبدالحی حسنی لکھنوی- دار المصنفین، اعظم گڑھ- طبع سوم، ۱۹۶۴ء

۹۷- گلزار اولیا: مظفر حسین- مطبع سبحانی، حیدر آباد (دکن)- ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء

۹۸- گلشن ہند: میرزا علی لطف- تصحیح و تحشیہ مولانا شبلی و مقدمہ مولوی عبدالحق، رفاہ عام پریس، لاہور-

۹۹- گل عجائب (تذکرۂ شاعراں): اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی- انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)- طبع اوّل- ۱۹۳۶ء

۱۰۰- مآثر الامرا: جلد اوّل، دوم، سوم، شاہ نواز خاں- ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ-

۱۸۸۸ء - ۱۸۹۰ء

۱۰۱- مآثر عالم گیری : محمد ساقی مستعد خاں - بہ تصحیح آغا احمد علی، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ - ۱۸۷۱ء

۱۰۲- مآثر الکرام : غلام علی آزاد بلگرامی - مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ، لاہور - ۱۹۷۱ء

۱۰۳- محبوب ذی المنن تذکرہ علمائے دکن : عبدالجبار خاں ملکاپوری - مطبع رحمانی و حسن پریس، حیدر آباد (دکن) ۱۳۳۲ھ -

۱۰۴- محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن : عبدالجبار خاں ملکاپوری - مطبع رحمانی، حیدر آباد (دکن) ۱۳۲۹ھ -

۱۰۵- مخزن نکات (تذکرہ شعرائے اردو) : شیخ قیام الدین قائم چاند پوری - مرتبہ مولوی عبدالحق - انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) ۱۹۲۹ء

۱۰۶- مرآت احمدی : مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر - مطبوعہ کلکتہ - ۱۹۲۷ء

۱۰۷- مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط : مترجمہ و مرتبہ، خلیق انجم - مکتبہ برہان - جامع مسجد، دہلی - طبع اوّل ۱۹۶۲ء -

۱۰۸- مشاہیر ادب اردو : مہیش پرشاد - ناشر، نند کشور اینڈ برادرز، بنارس - طبع اوّل - ۱۹۳۲ء

۱۰۹- مشاہیر کشمیر : منشی محمد الدین فوق - کریمی پریس، لاہور -

۱۱۰- مشکوٰۃ المصابیح : ولی الدین - اصح المطابع، دہلی - ۱۳۵۰ھ / ۱۹۳۲ء -

۱۱۱- معارف (ماہ نامہ) اعظم گڑھ : بابت ماہ اپریل ۱۹۴۷ء - مضمون سید غلام حسنین شاہ ندوی پھلواروی -

۱۱۲- المعارف (ماہ نامہ) لاہور - بابت ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ - مارچ ۱۹۶۸ء - مضمون مولانا غلام رسول مہر -

۱۱۳- المعارف (ماہ نامہ) لاہور - بابت جمادی الاولی ۱۳۸۸ھ - اگست ۱۹۶۸ء - مضمون پروفیسر محمد اسلم -

۱۱۴- معمولات مظہری : نعیم اللہ بہرائچی - مطبع محمدی، لاہور - ۱۳۱۰ھ

۱۱۵- مفتاح التواریخ : منشی دانشور - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۲۸۴ھ -

۱۱۶- مقدمہ رقعات عالم گیری : نجیب اشرف ندوی - دار المصنفین، اعظم گڑھ -

۱۱۷- مقالاتِ شبلی، جلد سوم : دار المصنفین اعظم، طبع دوم - ۱۳۷۵ھ - ۱۹۵۵ء

۱۱۸- مقالاتِ شبلی (تاریخی حصّہ اوّل)، جلد پنجم : دار المصنفین، اعظم گڑھ - ۱۳۵۴ھ - ۱۹۳۶ء

۱۱۹- مقاماتِ مظہری : شاہ غلام علی علوی مجددی - مطبع مجتبائی، دہلی - ۱۳۰۹ھ - ۱۸۹۲ء -

۱۲۰- مقدمہ نکات الشعرا (تذکرہ شعرائے اردو) : میر تقی میر - مقدمہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی نظامی پریس، بدایوں - ناشر، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

۱۲۱- مکاتیب میرزا مظہر جان جاناں : مرتبہ عبد الرزاق قریشی - علوی بک ڈپو، بمبئی - ۱۹۶۶ء

۱۲۲- مناقب حسن رسول نما : سید محمد ہاشم - گلزار ہند سٹیم پریس، لاہور - ۱۳۳۹ھ - ۱۹۲۱ء

۱۲۳- منتخب اللباب : جلد اوّل، دوم، محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں - ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ - ۱۸۶۹ء -

۱۲۴- مورخینِ ہند : شمس اللہ قادری - تاریخ آفس، حیدر آباد (دکن) ۱۹۳۳ء

۱۲۵- نزہۃ الخواطر : (جلد پنجم) سید عبد الحی حسنی لکھنوی - دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، (دکن) - ۱۳۷۵ھ - ۱۹۵۵ء

۱۲۶- نزہۃ الخواطر : (جلد ششم) : سید عبد الحی حسنی لکھنوی - دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، (دکن) - ۱۳۷۶ھ - ۱۹۵۷ء

۱۲۷- ہند عہدِ اورنگ زیب میں : مرزا یار جنگ سمیع اللہ بیگ - تاج پریس، حیدر آباد (دکن) ۱۳۴۳ھ - ۱۹۲۴ء

۱۲۸- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے : سید صباح الدین عبد الرحمٰن - دار المصنفین، اعظم گڑھ - ۱۳۸۳ھ - ۱۹۶۳ء

۱۲۹- ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے : دار المصنفین اعظم گڑھ - ۱۳۸۳ھ - ۱۹۶۳ء -

۱۳۰- ہندوستان گزشتہ وحال : رائے بہادر لالہ بیج ناتھ - عثمانی پریس، آگرہ - ۱۹۰۴ء

۱۳۱- الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی : محمد بن یحییٰ المدعو بہ محسن تیمی بکری ترہتی - مطبع صدیقی، بریلی - ۱۲۸۷ھ

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام (مرحوم) کی تصانیف

آبِ کوثر

اس کتاب میں سر زمینِ پاک و ہند میں اسلام کی آمد (۷۱۱ع) اور فتحِ سندہ یعنی محمد بن قاسم سے لے کر خاندان لودھی تک (۱۵۲۶ع) کے عہد بعہد حالات بیان کیے گئے ہیں - آٹھ سو سال کے اس طویل عرصے میں برِ صغیر پاک و ہند میں جو علما و فقہا اور صوفیہ و اولیا پیدا ہوئے اور انھوں نے جو خدمات انجام دیں اس کتاب میں ان کا مفصل تذکرہ ہے - پھر ان ادوار کے سلوک و سلاطین سے ان کے تعلقات و مراسم کی بھی وضاحت کی گئی ہے -

رودِ کوثر

اس میں عہدِ مغلیہ سے لے کر سرزمینِ برِ صغیر پاک و ہند پر انگریزوں کے قابض ہونے تک کے واقعات معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں - ہر مغل حکم ران کے عہد میں علما و مشائخ اور صوفیہ نے جو خدمات انجام دیں اور ان سے جو نتائج برآمد ہوئے، ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں -

موجِ کوثر

اس میں مسلمانانِ برِ صغیر کی ان علمی اور فکری مساعی کو اُجاگر کیا گیا ہے جو انھوں نے انگریزی حکومت کی گرفت میں آنے کے بعد مختلف انداز میں انجام دیں - اس سلسلے میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقائے عظام کی تحریکِ جہاد، سید احمد خان کی تعلیمی کاوشوں، جامعہ ملیہ کے قیام، ندوۃ العلما کی تاسیس اور دار العلوم دیوبند کے علمی کارناموں کو خصوصیت سے بیان کیا گیا ہے - پھر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور مولانا عبید اللہ سندھی اور دیگر علما و زعما کی علمی تگ و تاز پر روشنی ڈالی گئی ہے -